آج

۵۵

جلال آلِ احمد

رام کمار

اور حان پاموک

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۵

فروری ۲۰۰۷ء

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

ہندستان: ایک سال (چار شمارے) ۲۴۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۴۵ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

ہندستان:

C/o Dr/ Ather Farouqui, First Floor,

80, Sukhdev Vihar, New Delhi 110 025

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ریشارد کاپوشنسکی

کی یاد میں

Scanned with CamScanner

ترتیب

جلال آلِ احمد
۱۱
آپا اور مکڑی
۲۸
امریکی شوہر
۴۱
بے وقت افطار
۵۰
زیارت
۶۲
گناہ
۶۹
سہ تار
۷۴
فالتو عورت

Scanned with CamScanner

۸۶
کانچ کا گلدان

❁

رام کمار
۹۳
سردیوں کا آسمان
۱۱۱
ریوا
۱۳۴
ایک چہرہ
۱۴۳
کہانی جو کبھی لکھی نہ گئی
۱۵۵
ریلوے پھاٹک
۱۶۲
جاڑوں کی پہلی برف
۱۷۷
چھٹو
۱۹۰
سیلر

Scanned with CamScanner

❁

اورحان پاموک

۲۰۷

ابا کا سوٹ کیس

(نوبیل انعام قبول کرنے کی تقریر)

۲۲۵

سفید قلعہ

(دوسری اور آخری قسط)

Scanned with CamScanner

کہانیاں

عطرِ کافور
نیر مسعود
Rs.80

عاقبت کا توشہ
نکہت حسن
Rs.85

دور کی آواز
فیروز مکرجی
Rs.150

ایک اور آدمی
حسن منظر
Rs.85

صحرا کی شہزادی
سکینہ جلوانہ
Rs.120

خطِ مرموز
فہمیدہ ریاض
Rs.100

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سیّد رفیق حسین
Rs.375

سوار
اور دوسرے افسانے
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.240

نربدا
اور دوسری کہانیاں
اسد محمد خاں
Rs.180

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
نیر مسعود
Rs.90

ہندی کہانیاں (۳ حصے)
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.540 (Rs.180 فی حصہ)

لالٹین اور دوسری کہانیاں
محمد خالد اختر
(زیرِ طبع)

طاؤس چمن کی مینا
نیر مسعود
(زیرِ طبع)

گنجفہ
نیر مسعود
(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

ناول

تمس
بھیشم ساہنی
ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی
Rs.180

قلبِ ظلمات
جوزف کونریڈ
انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

دائرہ
محمد عاصم بٹ
Rs.100

نمبردار کا نیلا
سیّد محمد اشرف
Rs.60

بیس سو گیارہ
محمد خالد اختر
Rs.70

گنگا جمنی میدان
اختر حامد خاں
Rs.120

بوف کور
صادق ہدایت
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.40

دیمک
شرشیند وکھو پادھیائے
ترجمہ: رفعت سروش
Rs.70

خیمہ
میرال طحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

پوئین پھر جا پاندیٹڑا
قرۃ العین حیدر
اردو سے ترجمہ: ولی رام ولبھ
Rs.240

پہلی بارش
خولیولیامازاریس
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.95

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

آٹھ کہانیاں

فارسی سے ترجمہ:

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

جلال آل احمد (۱۹۲۳ء - ۱۹۶۹ء) کو جدید فارسی ادب کے اہم ترین افراد میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا جنم صوبہ گیلان کے گاؤں اورازان سے تعلق رکھنے والے ایک راسخ العقیدہ مذہبی گھرانے میں ہوا۔ ان کا بچپن باپ کی سخت گیری، گہری مذہبیت اور معاشی آسودگی کے ماحول میں بسر ہوا۔ ابتدائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھیں باپ کی طرف سے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہ ملی اور انھیں کوئی ہنر سیکھنے کا حکم دے کر بازار میں بھیج دیا گیا۔ جلال نے گھڑیوں کی مرمت اور بجلی کا کام سیکھا اور ان کاموں سے ہونے والی یافت کو تہران کے دارالفنون ثانوی اسکول میں رات کے وقت تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیا۔ جب وہ ۱۹۴۳ء میں اس اسکول سے فارغ التحصیل ہوئے تو دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ جنگ کے خاتمے پر جلال نے ادبیات کی تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس وقت تک وہ اپنے خاندان سے الگ اور کمیونسٹ تودہ پارٹی میں شامل ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جلال کی پہلی کہانی ''زیارت'' شائع ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں جلال اس دھڑے میں شامل تھے جس نے تودہ پارٹی سے الگ ہو کر سوشلسٹ پارٹی قائم کی۔ یہ پارٹی زیادہ عرصے نہ چل سکی اور جلال نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ''خاموشی'' کے اس وقفے میں جلال نے کہانیاں لکھنے اور غیر ملکی تحریروں کا ترجمہ کرنے کا کام جاری رکھا اور اسی عرصے میں سیمین دانشور سے شادی کی جو ایک طویل اور گہری تخلیقی رفاقت کی ابتدا ثابت ہوئی۔

جلال آل احمد کی تمام تر تخلیقی اور سیاسی زندگی شاہی آمریت اور غیر ملکی سامراج کی مداخلت کے دور میں بسر ہوئی اور اس ماحول کے اثرات ان کی تحریروں میں اسی طرح محسوس کیے جا سکتے ہیں جیسے ان کے خاندانی مذہبی پس منظر کے اثرات۔ اس کی ایک مثال اس انتخاب میں شامل پہلی کہانی ''آپا اور مکڑی'' اگر ایک طرف خودسوانحی ہے (جیسا کہ جلال کی ایک اور کہانی ''جشن مسرت'' تھی جسے آج کے شمارہ ۱۵ میں فارسی کہانیوں کے انتخاب میں شامل کیا گیا تھا) تو دوسری طرف اس میں ایران کے اس دور کی سیاسی علامتیں بھی دیکھی گئی ہیں جب تیل کی پیداوار کو قومیا لینے کی پاداش میں بین الاقوامی دباؤ کے تحت ایرانی وزیر اعظم مصدق کو برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی کہانیاں ''زیارت''، ''بے وقت افطار''، ''گناہ'' اور ''سہ تار'' بنیادی طور پر ایرانی معاشرے پر مذہبیت کے سماجی اثرات کا مطالعہ کرتی ہیں۔ سیاسی اور سماجی تبصرے کی زیریں رو جلال کے تمام فکشن میں بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے اور ''امریکی شوہر''، ''کانچ کا گلدان'' اور ''فالتو عورت'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

آپا اور مکڑی

پہلی بار میں نے اسے پچھلے ہفتے دیکھا۔ تیسرے پہر کا وقت تھا اور میرے بہنوئی اپنی بیوی کا حال پوچھنے آئے ہوئے تھے۔ جب میں ان کے واسطے چائے لے کر گیا تو اس پر میری نظر پڑی۔ موٹی سی، کالی اور بدصورت۔ اور کتنی بڑی تھی! اس کے روئیں تک اتنی دور سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ دیوار پر کھڑکی سے اوپر، شیشے کی اوٹ میں اس نے اتنا بڑا جالا تان رکھا تھا کہ وہ کھڑکی کے تین کونوں تک پہنچ رہا تھا۔ کوئی آٹھ چھوٹی چھوٹی کالی گولیاں سی اس میں پھنسی دکھائی دے رہی تھیں۔ بے چاری مکھیاں! جب میرے بہنوئی چائے میں شکر کی ڈلیاں ملا رہے تھے، میں نے انھیں پھر سے گنا۔ پوری آٹھ تھیں۔ اتنی بڑی مکڑی پر اب تک میری نگاہ کیسے نہیں پڑی؟ جبکہ مجھے چیونٹیوں کے باریک سے باریک بلوں کا پتا رہتا ہے... اور سارے نئے چوہوں کی پیدائش کا بھی... اماں نے اسے نہ دیکھا تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حالانکہ صفائی ستھرائی میں وہ بہت محنت کرتی ہیں۔ پچھلے ایک مہینے میں تو ان کا ایک قدم باورچی خانے میں رہتا تھا اور ایک آپا کے پلنگ کے پاس۔ ادھر بابا کی طرف سے بھی آوازیں پڑتی رہتی تھیں اور ان کے مہمان بھی آتے رہتے تھے۔ پھر بھی کسی اور کو حق نہ تھا کہ آپا کے پلنگ کا پایا بھی چھو لے۔ ہمارے گھر میں پہلی بار بیمار کا پلنگ بچھا تھا۔ بہنوئی انھیں اپنے گھر سے یہاں لے آئے تھے۔ پلنگ کھڑکی کے پاس بچھا دیا گیا تھا اور آپا اس پر ہمیشہ سویا کرتی تھیں۔ بلکہ سوتی نہیں تھیں، پڑی رہتی تھیں۔ پہلے پہل میرا خیال تھا کہ وہ نخرے کر رہی ہیں، کیونکہ کبھی کبھی وہ صحن میں ٹہلتی بھی تھیں۔ حوض پر جا کر

Scanned with CamScanner

ہاتھ منھ دھوتیں۔ لیکن جیسے ہی بہنوئی دروازہ کھٹکھٹاتے، وہ لپک کر پلنگ پر لیٹ جاتیں۔ لپکتی تو خیر نہیں تھیں، بس ذرا تیزی سے چل کر پلنگ پر پہنچ جاتیں۔ اب ایک مہینے سے بالکل بستر سے لگ گئی تھیں۔ یہ میں ان کے پلنگ کے نیچے رکھے لگن کے حساب سے کہہ رہا ہوں جو مجھے کبھی کبھی خالی کرنا پڑتا تھا۔ اس میں سے بڑی عجیب بدبو آیا کرتی۔

چائے کی سینی واپس لے جا کر میں نے کتابوں کے شیلف پر سے اپنا رولر اٹھایا اور مکڑی کی تلاش میں نکلا۔ جب میں وہاں پہنچا، آپا نے پھر سے رونا اور کراہنا شروع کر دیا تھا۔ ایک پیر میں نے پلنگ کی پٹی پر رکھا اور ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیا، اور ابھی دوسرے ہاتھ میں پکڑے رولر سے مکڑی کا نشانہ لیا ہی تھا کہ بہنوئی نے زور سے کہا:

''بڑے میاں، معلوم نہیں ہے ان کی تمام ہڈیاں دُکھ رہی ہیں؟''

اگرچہ پلنگ کی پٹیاں میرے پیر تلے چرچرا رہی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں اور نہ آپا کو کوئی تکلیف پہنچے گی۔ مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آپا کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر درد کے آثار تھے۔ وہ خود کچھ نہ بولیں، صرف آنکھیں موند کر گردن پیچھے کو تان لی اور ان کے نتھنے پھیل گئے۔ ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں خجل سا ہو گیا اور نیچے اتر آیا۔ رولر میرے ہاتھ میں بھاری محسوس ہونے لگا اور میں نے خود کو کہتے سنا:

''میں یہ گندگی صاف کرنا چاہتا تھا۔''

آپا نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا:

''کیوں؟''

''کیوں نہیں آپا؟ اماں کہہ رہی تھیں مکڑی نحوست لاتی ہے۔ اور دیکھتیں نہیں اس نے کتنی ساری مکھیاں پکڑ لیں؟''

بہنوئی بولے، ''یہ مکھیوں کا اپنا قصور ہے، بڑے میاں، کہ ہر چھید میں سر گھساتی پھرتی ہیں۔ وہ تو اپنے گھر میں بیٹھی ہے...''

کیا وہ مجھے چڑا رہے تھے؟ ان بہنوئی صاحب سے میری کبھی نہیں بنی۔ شادی کے وقت سے ہی۔ یعنی جب آپا کی ان سے شادی ہوئی۔ دلہن کو تیار ہونے میں اتنی دیر لگی تھی اور دولھا کا گھر اتنا بھول

Scanned with CamScanner

بھلیوں جیسا تھا اور اس میں اتنے کمرے اور رہداریاں تھیں کہ میرا حال برا ہو گیا۔ میرے بازو ٹوٹنے لگے۔ پورے راستے آئینے کو پیٹھ پر لاد کر چلنا کسی بڑے کے لیے بھی بہت مشکل ہوتا۔ ان کے گھر کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو پتا نہیں کیا ہوا کہ میں نیچے گر پڑا۔ شاید میری نظر انگور کے گچھوں پر تھی جو بیلوں پر لٹک رہے تھے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا پیر نارنگی کی کیاری میں ہے۔ آئینہ ٹوٹ گیا۔ میرا چہرہ اور ہاتھ خونم خون ہو گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ روؤں یا نہ روؤں، کہ بہنوئی پہنچ گئے۔ یعنی دولھا۔ انھوں نے کچھ دیکھا نہ سنا، بس کہنے لگے:

''بڑے میاں، اونگھ رہے تھے کیا؟''

میں رو پڑا۔ اس کے بعد سے وہ مجھے بڑے میاں ہی پکارتے تھے۔ لیکن میری ہی بات نہیں، اور بھی کسی کی ان سے نہیں بنتی تھی۔ روز دسترخوان پر ان کی برائیاں کی جاتی تھیں کہ جب تک بیوی ہٹی کٹی تھی تو اسے اپنے پاس رکھا اور اب بیمار پڑ گئی تو اسے میکے میں ڈال کر چلتے بنے... اس لیے میں نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''اپنے گھر میں کہاں بیٹھی ہے؟ اپنی گندگی ہمارے گھر میں لا کے پھیلا دی۔''

''عباس جان، میں نے بھی تو یہی کیا ہے۔''

''آپ نے، آپا؟'' میں کمرے کے در میں رک گیا کہ اب کیا کہوں۔ یہ کیا بات ہوئی! آپا اپنے آپ کو مکڑی سے کیوں ملا رہی ہیں؟ جیسے ہی میں نے خود سے یہ سوال کیا، میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنے شوہر کو چڑا رہی ہیں۔ مجھے لگا کہ اب یہاں میرا کام نہیں۔ میں نے خالی پیالی بہنوئی کے سامنے سے اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ پھر جب ان کے لیے حقہ لے کر گیا تو دیکھا کہ انھوں نے آپا کو رام کر لیا تھا اور گرم و نرم لہجے میں انھیں اپنے پڑوس میں رہنے والے ایک حاجی صاحب کا قصہ سنا رہے تھے جو ایوانِ تجارت کے رکن بن گئے تھے اور جنھیں ہر روز ٹائی باندھنی پڑتی تھی۔ چونکہ انھیں خود ٹائی باندھنی نہیں آتی تھی اس لیے پرلے روز انھوں نے نوکر کو بھیج کر بہنوئی کو بلوایا کہ آ کر ٹائی باندھ دیں، اور پھر انھیں ناشتہ کرایا۔ اب خدا کے فضل سے ہر روز یہی ہوتا ہے، کیا ہوا جو بیوی نہیں ہے جو ناشتہ بنا کر دے، وغیرہ وغیرہ... مجھے لگا کہ میں بہنوئی کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بے مزہ قصے ہر وقت سنایا کرتے تھے۔ میرے خیال سے وہ آپا کو جلانے کے لیے یہ قصے گڑھا کرتے تھے۔ یہ ان دونوں کی عادت ہو گئی تھی۔ پہلے لڑائی

Scanned with CamScanner

جھگڑا کرتے، پھر صلح ہو جاتی، اور پھر گھنٹے دو گھنٹے کھسر پھسر ہوا کرتی۔ پھر بہنوئی اٹھ کر چلے جاتے۔ ہفتے کے ساتوں دن یہی ہوتا، تیسرے پہر کے وقت جب میں اسکول سے لوٹتا تھا۔ لیکن بابا یا اماں بہنوئی کا سامنا نہیں کرتے تھے۔ دروازہ کھولنے میں جاتا یا چھوٹی بہن جاتی۔ اور ان کی خاطر مدارات بھی مجھی کو کرنی پڑتی۔ اور روز کی یہی قصہ گوئی تھی... اس لیے میں نے سوچا اب مجھے جا کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ دروازے سے باہر آتے آتے میں اپنے دل میں مَنّزی پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ ''غلیظ حرامزادی! جا کر آپا کے لیے دعا کر!'' پھر میں جا کر اپنا گھر کا کام کرنے لگا۔

ان دنوں میرے امتحان چل رہے تھے، اور میری ذرا بھی تیاری نہیں تھی۔ خاص کر جب سے حساب کے ٹیچر سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا اور دوسرے ٹرم میں فیل ہو چکا تھا۔ ایک روز میں کلاس میں اپنی فلموں والی کاپی ٹھیک کر رہا تھا کہ اس نے آکر کاپی چھین لی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ اس نے انھی دنوں ہیٹ پہننا شروع کیا تھا اور جانتا تھا کہ میرے بابا ملّا ہیں۔ وہ ہمیشہ میرے پیچھے پڑا رہتا، اور جب سے عمامے پہننے پر پابندی لگی وہ ملاؤں کے پیچھے پڑ گیا۔ انھیں برا بھلا کہتا رہتا۔ دینیات کے ٹیچر کا بھی کچھ لحاظ نہ کرتا، حالانکہ وہ اس کا کام کا ساتھی تھا۔ وہ کلاس میں آتا تو سر پر عمامہ ہوتا، لیکن کرسی پر بیٹھتے ہی وہ اسے اتار کر میز پر رکھ دیتا اور عبا کو بھی تہہ کر کے عمامے کے اوپر ڈال دیتا۔ پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجتے ہی وہ عبا پر سے چاک کے ذرے جھاڑتا اور اسے کندھوں پر ڈال لیتا، عمامہ سر پر جماتا اور اٹھ کھڑا ہوتا۔ پہلے پہل ہم اس پر ہنستے تھے۔ کہتے، ''شیخ جی، عمامہ گر پڑا!'' یا ایسا ہی کچھ۔ لیکن بعد میں ہم نے اسے تنگ کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن حساب کا ٹیچر بھلا اسے کہاں چھوڑنے والا تھا! اسی طرح برا بھلا کہتا رہتا۔ آخرکار ایک دن جب وہ ملاؤں کے داڑھی میں خلال کرنے کی نقل اتار رہا تھا، میں نے کھڑے ہو کر اس کے منھ پر کہہ دیا، ''ملاؤں نے کیا تمھارے باپ دیوث کا مال کھایا ہے؟'' یہ کہہ کر کلاس سے باہر نکل گیا۔ یہ دیوث لفظ میں نے بابا سے سیکھا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ جیسے زندیق اور دوسرے بہت سے لفظوں کا مطلب نہیں جانتا تھا۔ لیکن اتنا جانتا تھا کہ جب بابا بہت غصے میں ہوتے ہیں تو یہ لفظ ان کے منھ سے نکلتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے حساب کی کلاس میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ انجام تو ظاہر ہی تھا۔ فیل ہونا سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اچھی بات یہ تھی کہ آخر سال کا امتحان بیرونی ہوتا تھا

Scanned with CamScanner

اور اسکول کے پرنسپل نے میرا نام فہرست میں دے دیا تھا۔ وہ بابا کا احترام کرتے تھے۔ ورنہ تو فیل ہونا ہی ہونا تھا۔ دوسرے پرچے تو ٹھیک ہوئے تھے یا ہو رہے تھے، مگر یہ حساب کا پرچہ! خاص کر فیصد اور تناسب کے سوال۔ کتاب کھولتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی چھری سے دھنائی کر رہا ہو۔ مگر چارہ ہی کیا تھا! میں اپنی کتابوں کی الماری کے پاس بیٹھ گیا اور کتاب کھول لی۔ ''اگر ایک ڈھیر میں کپاس کی بیس گانٹھیں ہوں اور ہر گانٹھ کا حجم... ''لیکن اس بڑی ساری مکڑی کا خیال ذہن سے کہاں محو ہوتا تھا! مجھے یقین تھا کہ اگر آپا ایک مہینے تک دن رات پلنگ پر نہ پڑی ہوتیں تو میں نے کب کا اسے پکڑ لیا ہوتا۔ مگر افسوس۔ سچ مچ کہیں آپا کو اس مکڑی سے لگاؤ تو نہیں ہو گیا؟ وہ سارا دن پلنگ پر کس طرح لیٹی رہ سکتی ہیں، اور وہ بھی اتنے درد کے ہوتے ہوئے۔ کسی کسی رات تو ان کے کراہنے کی آواز سے میری آنکھ کھل جاتی۔ بعد میں اماں کی سرگوشیاں سنائی دیتیں جو آپا سے کوئی دوا پینے پر اصرار کر رہی ہوتیں۔ دواؤں سے بھری ایک پوری سینی ان کے پلنگ کے نیچے رکھی رہتی تھی... وہ سارے وقت دعا کی کتاب کس طرح پڑھتی رہ سکتی ہیں؟ ان کو جتنا پڑھنا لکھنا آتا ہے — اُس دن مجھ سے ''سبحان'' اور ''منان'' کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ یقیناً پڑی اس مکڑی کو دیکھتی رہتی ہوں گی، اس کے آنے جانے کو، اور شکار کرنے اور جالے کے تاروں میں جھولنے کو۔ میں خود سے یہی کہہ رہا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی پورا ایک گھنٹہ بنچ پر بلاحرکت بیٹھا رہے اور نظریں بلیک بورڈ اور ٹیچر کے منھ پر گاڑے رہے؟ آدمی کے ذہن میں ہزاروں خیالات آتے ہیں۔ تو پھر پورا ایک مہینہ پلنگ پر پڑے پڑے گزار دینا اور کچھ بھی نہ کرنا! اس قابل بھی نہ ہونا کہ... لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس طرح مکڑی کے لیے میرا کینہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ فرض کیا آپا کو اس مکڑی سے دلچسپی پیدا ہو بھی گئی ہو، اس سے مجھے کیا؟ مکڑی تو مکڑی ہی ہے۔ آپا کو تو اور بھی بہت سی چیزوں سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اپنے شوہر سے ہی۔ کہ چار پانچ سال ان کے گھر میں رہیں، سارے وقت بیمار رہیں، بچہ بھی کوئی نہ ہوا، اور کئی بار اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ لیکن کیا مجھے اپنے بہنوئی اچھے لگتے ہیں؟ ٹھیک ہے، مجھے مکھیاں بھی اچھی نہیں لگتیں، لیکن میں نہیں چاہتا کہ دنیا کی ایک بھی مکھی مکڑی کے جالے میں پھنسے۔ بہت بار ایسا ہوا کہ گرمیوں کی دوپہروں میں خاموشی سے کھیلتے ہوئے — کہ بابا کی نیند خراب نہ ہو جائے — میں نے کوئی مکھی پکڑی اور اسے لے جا کر چیونٹی کے بل میں ڈال دیا۔ لیکن ایسی ہی کوئی مکھی جب مجھے مکڑی کے جالے میں پھنسی دکھائی

دے جاتی تو میں نہ صرف اسے جالے سے آزاد کراتا بلکہ مکڑی کو مار کر اس کے جالے کو بھی ملیامیٹ کر ڈالتا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ مکھیوں کو جالے کے تاروں سے آزاد کرا بھی دیا جائے تو وہ کسی قابل نہیں ہوتیں۔ نہ معلوم کیوں۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ میں مکڑیوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جب مکھی جالے میں پھنستی ہے تو مدھم سی بھنبھناہٹ پیدا کرتی ہے، جیسے یہ آواز اس کے گلے کے بہت اندر سے نکل رہی ہو۔ اس میں کوئی فرق نہیں آتا، چاہے چیونٹی نے گھیر لیا ہو یا کسی نے، مثلاً میں نے ہی، انگلیوں میں یوں پکڑ لیا ہو کہ ٹانگیں گرفت میں ہوں اور پر آزاد ہوں، مکھی اسی طرح بے بسی میں پر پھڑپھڑاتی ہے۔ لیکن مکڑی کے جالے میں پھنس کر اس کی بھنبھناہٹ بالکل مدھم پڑ جاتی ہے۔ جیسے مکڑی نے مکھی کا منھ بند کر دیا ہو کہ کسی کو مدد کے لیے نہ پکار سکے۔ یا گلا گھونٹ رکھا ہو... مجھے کیا پتا۔ پھر اگر مکھی کو پکڑ کر چیونٹیوں کے بل میں ڈالنا ہو تو اس کا کم سے کم ایک پر توڑنا پڑتا ہے تاکہ اڑ نہ پائے۔ یا کوئی جھاڑو کی سینک اس کی مقعد میں گھسانی ہوتی ہے کہ اگر اڑنا چاہے تو اڑ نہ سکے۔ لیکن مکڑی کے جالے میں اس طرح نہیں ہوتا۔ مکھی صحیح سالم ہوا میں اڑ رہی ہوتی ہے کہ اچانک جالے کے تاروں میں پھنس جاتی ہے۔ بالکل جیسے کوئی چھوٹی سی گیند والی بال کے جال میں اٹک جائے۔ شاید اسے دکھائی نہیں دیتا، یا اس کا ذہن الجھا ہوا ہوتا ہے یا کسی اور خیال میں ہوتی ہے۔ لیکن جالے کے تار دکھائی بھی کہاں دیتے ہیں؟ اتنے باریک ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو خود مجھے نظر نہیں آتے۔ ابھی وہ ہاتھ پیر مار ہی رہی ہوتی ہے کہ مکڑی اجل معلق بن کر سر پر آ پہنچتی ہے۔ بری بات یہ ہے کہ مکھی پہلے پہل اسے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ میں نے غور سے دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ آواز بھی نہیں نکالتی۔ تھوڑا بہت اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارے، اور جیسے ہی اس کا کوئی پر یا پیر جالے کے تاروں میں الجھا مکڑی آ موجود ہوئی۔ تب اس کی آواز نکلتی ہے۔ اگر ذرا پہلے آواز نکالے تو ممکن ہے کوئی، مثلاً میں، ان کی مدد کو پہنچ سکے۔ لیکن جب تک وہ آواز نکالتی ہے اس وقت تک بہت دیر ہو چکتی ہے... میں انھی خیالوں میں گم تھا اور کتاب صفحہ ۳۶ پر کھلی ہوئی تھی کہ مجھے محسوس ہوا اماں سر پر کھڑی ہیں۔ وہ ہمیشہ بغیر آہٹ کیے آتی جاتی تھیں۔ اگر آپ کے حواس بجا نہ ہوں تو یوں لگے گا کہ وہ ہر وقت گھر میں ہر جگہ موجود ہیں۔

''بیٹا، کیا کر رہے ہو؟''

''سبق یاد کر رہا ہوں۔ یہ لعنتی حساب تو میرے باپ کو بھی ہلاک کر ڈالے گا۔''

Scanned with CamScanner

''ایسا مت کہو، بیٹے۔ اچھی بات نہیں ہوتی۔ خدا ان کا سایہ تمھارے سر پر سلامت رکھے۔ جو الٹی سیدھی باتیں بڑے کہتے پھرتے ہیں وہ تمھیں نہیں کہنی چاہییں۔ اب ذرا اٹھو بیٹے، اور جا کر نان لے آؤ۔ کھانے کو دیر ہو رہی ہے۔''

میں نے کتاب الماری پر پھینکی اور چل دیا۔ ابھی جوتے پہن رہا تھا کہ اماں نے کہا:

''بیٹا، تم سے ایک کام کہوں؟ میری خاطر کرو گے؟''

میں نے فقط ان کی طرف دیکھا۔ اماں نے منھ دوسری طرف کر لیا اور بتی جلانے طاق کی طرف چلی گئیں۔ وہ مجھ سے اس طرح بات نہیں کرتی تھیں۔ گھر میں مجھ سے جو کام کرنے کو کہا جاتا وہ میں یا تو کر دیتا تھا یا نہیں کرتا تھا۔ کسی سوال جواب کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی کبھی شکایت کرتا تھا، لیکن یہ زیادہ تر بابا کے حکموں کے بارے میں ہوتی جو سخت اور شدید ہوا کرتے۔ اماں کے کہے ہوئے کاموں کے بارے میں نہیں۔ اس لیے میں گنگ سا رہ گیا۔ اماں نے دیا سلائی جلا کر چراغ روشن کیا اور اس پر چمنی ڈھکتے ہوئے بولیں:

''کل دوپہر کو گھر لوٹتے ہوئے ذرا استاد اصغر ریختہ گر کی دکان پر ہوتے آنا۔ وہ تمھیں مٹھی بھر سیسہ دے گا، وہ گھر لے آنا۔''

میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے کہا:

''مگر اماں، کل تو میرا امتحان ہے۔''

''تو کیا ہوا بیٹے؟ وہ تمھیں کھانے کے لیے گھر آنے سے تو نہیں روکیں گے؟ میں تمھاری آپا کے واسطے کہہ رہی ہوں۔''

''آپا کے واسطے؟''

''ہاں بیٹے۔ دیکھتے نہیں کتنی تکلیف میں ہے۔''

''تو سیسے کا آپا کی تکلیف سے کیا واسطہ؟''

''اب اصولِ دین پوچھنے کی ضرورت نہیں، بیٹے۔ جاؤ، نانبائی کی دکان پر بھیڑ ہو جائے گی۔ جلدی جاؤ، کہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔''

اچانک اوپر کے کمرے سے آپا کے زور سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ایسی اونچی آواز کہ آدمی

Scanned with CamScanner

کو سوتے سے جگا دے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے برداشت کرنا مشکل ہے۔ اس چیخ کو سن کر ہڈیوں کا گودا نکلا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے اماں سے سیسے کی بحث ختم کی اور چل پڑا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اسپتال کے شاگرد سے سامنا ہوا جو ہر شام آپا کو انجکشن لگانے آتا تھا۔

اگلے روز دوپہر کو امتحان دے کر لوٹتے ہوئے میں اس قدر غصے میں تھا کہ نہ پوچھو۔ مجھے لگا میں نے سب کباڑا کر دیا ہے۔ وہی سب فیصد اور تناسب کے سوالات۔ پرچے میں جو سوال آیا اس میں نہ تو کپاس کی گانٹھوں کا ذکر تھا اور نہ ڈھیر کے حجم کا۔ اس میں ذکر تھا پیاؤ میں پانی کی اس مقدار کا جو ایک پوری بٹالین کے گھوڑوں کی پیاس بجھا سکے۔ اگر ایک گھوڑے کو اتنا پانی درکار ہوتا ہے اور گھوڑوں کی کل تعداد یہ ہے، اور یہی سب خرافات۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ ''پیاؤ'' کا لفظ ہی میری سمجھ میں نہیں آیا، کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ میرے خیال سے ہم سب کا پرچہ خراب ہوا تھا۔ چنانچہ واپسی میں نہ تو اجنبی بچوں سے جھگڑا کرنے کو جی چاہا اور نہ سڑک کے کنارے پھل بیچنے والوں کے خوانچے میں ناخن مارنے کو، جو فصل کے پہلے یاقوتی انگور لائے تھے۔ میں نے سوچا کسی دوسرے راستے سے چلنا چاہیے۔ میں بازارچۂ معیر کے پیچھے کی تنگ گلیوں میں سے ہوتا ہوا زرگزر کے پاس جا نکلا۔ جب ریختہ گر کی دکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی کام ختم ہوا ہے اور لڑکے کو نان، دہی اور کباب لینے بھیجا جا رہا ہے، دوپہر کے کھانے کے واسطے۔ میں نے سلام کیا اور سانچوں کی قطار کے پاس سے گزر کر استاد صغیر کے سامنے پہنچا۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ بابا کے مریدوں میں تھا۔ نہ روضہ سننے میں ناغہ کرتا نہ مسجد جانے میں۔ بلکہ روضہ خوانی کی رات کو چائے کے سماوار پر مامور ہوتا۔ وہ انگیٹھیوں پر چائے دانی رکھنے کا اسٹینڈ اتنی اچھی طرح بناتا تھا کہ اسے دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ انگارے، گلِ آتش، بالکل جیسے گلِ انار۔ اور بو یا دھواں ذرہ بھر جو ہو۔ سوال ہی نہیں! اس کی دکان کی چیزیں ہماری روزمرہ کی خریداری کا حصہ نہیں تھی جیسے عطار اور بقال اور قصاب کی دکان کی چیزیں تھیں جن کے لیے بابا مجھے ہر روز بھیجتے تھے۔ کبھی اُدھار سودا اور کبھی نقد قرض لینے کے واسطے۔ اس قسم کے کاموں سے تو مجھے یہ آسان لگتا تھا کہ حساب کے ٹیچر سے جا کے معافی مانگ لوں۔ مگر بابا کو بھلا اس کی پروا تھی! وہ زور سے حکم دے دیتے اور ابھی میں گومگو کے عالم ہی میں ہوتا کہ ان کی دہاڑ سنائی دیتی، ''گدھے کے بچے! تو سمجھتا ہے میں ان سے بھتہ مانگ رہا ہوں؟''

Scanned with CamScanner

... بہر حال، ریختہ گر کی دکان پر آنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ استاد اصغر نے میرا اسلام کا جواب دیا اور پوچھا:

''کوئی برتن ساتھ نہیں لائے؟''

میں نے کہا، ''نہیں۔'' اس پر اس نے اپنے شاگرد کو پکار کر ہدایت دی اور وہ تہہ خانے سے تیل کے ٹین کے نچلے آدھے حصے سے بنائی ہوئی بالٹی لے آیا۔ اس میں موٹا سا تار پرو کر دستہ بنا دیا گیا تھا۔ استاد اصغر خود چھوٹے دستے والے پھاوڑے کی مدد سے دکان کے ایک کونے میں پڑے ڈھیر میں سے دھات کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر بالٹی میں ڈالنے لگا۔ میں دکان کے بیچ میں قطار میں رکھے سانچوں کا جائزہ لے رہا تھا جن میں ریت پر پڑے پگھلی دھات کے قطروں کی چمک ابھی تازہ تھی اور ان قطروں کے اردگرد کی ریت خشک ہو چکی تھی۔ دکان کی گرمی میں ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے حلق کی تہہ میں جلن ہونے لگتی اور منھ کڑوا ہونے لگتا۔ برتن بھر گیا تو استاد اصغر نے اسے اٹھایا اور مجھے تھماتے ہوئے بولا،

''بسلامت۔ بالٹی یاد سے واپس کر جانا۔''

میں نے بالٹی اٹھائی۔ یونہی بے خیالی میں۔ وہ فوراً ہی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنی بھاری ہو گی! بالٹی کا پیندا میرے داہنے پیر کے انگوٹھے میں لگا۔ ایسا درد ہوا کہ نہ پوچھو۔ دکان کے دو تین شاگرد زور زور سے ہنسنے لگے۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر اسکول کی چھٹی کے بعد باہر مل جاتے تو ان کا منھ توڑ دیتا۔ استاد اصغر نے بالٹی اٹھائی، بکھرے ہوئے ٹکڑے دوبارہ اس میں ڈالے اور اسے میرے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ کہا، ''چوٹ تو نہیں لگی؟ اسے سیسہ کہتے ہیں۔ احتیاط سے بابا، بھاری ہوتا ہے۔''

مارے شرمندگی کے میں خدا حافظ کہے بغیر چل پڑا۔ واقعی کتنا بھاری تھا! پورا ایک من! چلو ایک من نہ بھی ہو تو اتنا بھاری تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ میرے خیال میں اتنا ہی بھاری جیسے وہ وزن جنھیں مشدی پہلوان لوگ پھانسی کے میدان میں ہر جمعے کو شرط بد کر اپنے کندھے سے اوپر اٹھاتے تھے جس سے ان کی گردن کی رگیں پھول جاتیں اور گردن درخت کے تنے جیسی دکھائی دینے لگتی اور بازو کی مچھلیاں یوں پھڑکتیں جیسے کھال کے نیچے بند مٹھی ہو۔ دکان سے بیس قدم چلا ہوں گا کہ ہمت ہار گیا۔ ایک ہاتھ سے تو نہیں اٹھایا جائے گا۔ بستہ بغل میں تھا۔ پیر کا پنجہ ایسا درد کر رہا تھا کہ نہ پوچھو۔ میں

نے بالٹی زمین پر رکھ کر کپڑے کے جوتے کے اوپر سے پنجے کو ملا۔ جب ذرا آرام آیا تو بستہ بالٹی کے اوپر رکھ کر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا اور پھر چل پڑا۔ بالٹی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں جھول رہی تھی۔ اس طرح تیز نہیں چلا جا سکتا تھا۔ لٹکتی ہوئی بالٹی میری ٹانگوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ہر بیس قدم کے بعد میں بالٹی کو زمین پر رکھ کر سانس درست کرتا، ہاتھوں میں جہاں تار کا بنا ہوا دستہ کاٹ رہا تھا وہاں انھیں آپس میں رگڑتا اور پھر بالٹی اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ لیکن ان سب باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ سارے راستے میرے ذہن پر یہ خیال مسلط رہا کہ آپا کی بیماری سے اس سیسے کا کیا تعلق ہے۔ اماں نے کہا تھا ''مٹھی بھر سیسہ''، جو میں سمجھ رہا تھا کہ جیب میں یا بستے میں ڈال کر لے آؤں گا۔ ریختہ گر کی دکان پر کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ میں نے سلام کیا اور انھوں نے بالٹی مجھے پکڑا دی اور میں اس مصیبت میں پڑ گیا۔ اماں نے ضرور بابا سے کہا ہوگا، اور بابا نے قم جانے سے پہلے، کل رات یا صبح کو نماز کے وقت استاد اصغر سے کہہ کر سب معاملہ طے کر لیا ہوگا، یہی سوچ کر میں نے کچھ نہیں کہا۔ پھر اگر بالٹی پیر پر نہ گر پڑی ہوتی اور دکان کے شاگردوں کے سامنے میرا تماشا نہ بن گیا ہوتا تو میں یہ سب بھول بھال بھی گیا ہوتا۔ مگر اب کیسے بھول سکتا تھا! اتنا سارا سیسہ آخر کیوں منگوایا جا رہا ہے؟ میں نے سنا تھا کہ بندوق کی گولیاں سیسے سے بنتی ہیں۔ لیکن ہمارا بندوقوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ آہا! شاید اس سے ویسے وزن بنائے جائیں گے جیسے پہلوان لوگ اٹھاتے ہیں... یہ سوچ کر مجھے اتنی ہنسی آئی کہ بالٹی زمین پر رکھنی پڑی۔ ''بچے! یہ کیا تماشا کر رہے ہو؟ پہلے امتحان کا کباڑا کر دیا، پھر دکان میں مذاق اڑوایا، اور اب...
کیا آپا کی طبیعت وزن اٹھانے سے ٹھیک ہوگی؟'' اصل مسئلہ یہ تھا کہ میں جانتا تھا آپا کی بیماری اور اس وزنی، ملعون سیسے کے درمیان کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ تبھی اچانک مجھے یاد آیا۔ ہاں، یہی بات ہے! ''گرم شیشہ... گرم شیشہ...'' ابھی پرسوں صنم بر ہمارے گھر سے باہر نکلتے ہوئے یہی بڑبڑاتی اور آپ ہی آپ ہنستی جا رہی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب سمجھا! صنم بر ایک اپاہج عورت تھی، بھکارن جیسی، جو ہر ہفتے میں ایک بار ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھاتی اور چلی جاتی۔ ایک طرف کے بدن کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتی، اور دوسری طرف کندھے پر ایک بڑا سا تھیلا لیے رہتی اور جو چیز ہاتھ آتی اسے تھیلے میں ڈالتی چلتی۔ اس کے منہ سے رال بری طرح بہتی رہتی اور اس کی قمیص کا سامنے کا حصہ یوں معلوم ہوتا جیسے چمڑے کا بنا ہوا ہو۔ اور زبان ایسی تھی کہ کیا بتاؤں! سادہ سی بات کو بھی

Scanned with CamScanner

معما بنا دیتی تھی۔کوئی ایک حرف بھی ٹھیک سے ادا نہیں کر پاتی تھی۔اس کا منھ ٹیڑھا تھا اور ہمیشہ تھوک سے بھرا رہتا، اس لیے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہہ رہی ہے۔لیکن اب میری سمجھ میں آ گیا۔اور مجھے یہ سوچ کر بہت غصہ آیا کہ صنم برتنک کو خبر ہے کہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے اور مجھے پتا نہیں۔اس لیے میں بابا کے سے انداز میں، یعنی ہانپتا اور غراتا ہوا، گھر میں داخل ہوا اور سیسے کی بالٹی کو حوض کے کنارے زور سے پٹک دیا۔پھر کوٹ اتارا، جوتے اتارے اور حوض میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔پہلے پیر کے پنجوں میں تیز چبھن ہوئی، پھر جلن محسوس ہوئی، مگر جب میں نے انھیں ٹھنڈے پانی کے اندر آپس میں رگڑا تو رفتہ رفتہ آرام آ گیا۔مچھلیاں ڈرتی ڈرتی میرے پیروں کے پاس آئیں، پھر بھاگ گئیں۔میں اسی طرح ان کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اپنے پیروں کو آرام دے رہا تھا۔داہنے پیر کے انگوٹھے اور ساتھ کی دو انگلیوں میں چوٹ لگی تھی، وہ کچھ سوج گئی تھیں۔انھیں ہاتھ سے ملنے پر درد ہوتا تھا۔

''یا خدا، میں مر جاؤں۔کیا کر لیا بیٹے؟''

''ارے بابا کچھ نہیں۔خواہ مخواہ قربان صدقے ہونے کی ضرورت نہیں۔دیکھ لیا، یہ ہے آپ کا مٹھی بھر سیسہ!''

اماں حوض کے کنارے بیٹھ گئیں اور غور سے میرے پیر دیکھنے لگیں۔پھر ہنس کر بولیں:

''بیٹا، تم تو ناز نخرے کرنے والے ہو نہیں۔یہ کیا لڑکیوں والی ادائیں؟ اسے شمشیر کا زخم سمجھ رہے ہو کیا؟''

''ہاں مجھے سب معلوم ہے۔اور یہ سیسہ بھلا کس لیے منگوایا؟''

''سمجھ جاؤ گے بیٹے، سمجھ جاؤ گے۔خدا تمھارے تن کو آتشِ دوزخ سے محفوظ رکھے۔اب اٹھو۔ تمھارا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

وہ جا کر اپنا تولیہ اٹھا لائیں اور میرے پیر خشک کرنے لگیں۔میں نے پھر دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں، اس لیے نہ ان سے جھگڑا کیا جا سکتا تھا اور نہ ناراض ہوا جا سکتا تھا۔تو میں نے موزے پہنے، منھ پر پانی کا چھینٹا دیا اور اندر چلا گیا۔دسترخوان پر بہت بھیڑ تھی۔اماں کی خالہ اور میری دو بڑی بہنیں آئی ہوئی تھیں، اور ایک اور عورت جسے میں نہیں جانتا تھا۔اس کا پورا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ٹھوڑی، ناک کی نوک، گال اور آنکھوں کے نیچے کی کھال اور ہونٹ، سب۔سلام کر کے بیٹھ

Scanned with CamScanner

گیا۔ میری رکابی ہر روز سے زیادہ بھری ہوئی لگ رہی تھی۔ دال کا پلاؤ تھا، کشمش اور چھواروں والا۔ اور اس پر پڑی ہوئی چاولوں کی کھرچن! چھوارے بھنے اور پھولے ہوئے، اور روغن میں تر۔ یقیناً میری اماں سے بہتر پلاؤ کوئی نہیں پکا سکتا! میں کھانے میں مشغول تھا کہ آواز آئی:

''اس کی جان کو بالکل مکڑی کی طرح پکڑ لیا ہے۔''

''ہاں خانم باجی، اسے سرطان بلاوجہ تو نہیں کہتے!'' یہ اماں کی خالہ نے اس اجنبی عورت سے کہا تھا۔ سرطان کا لفظ میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن میرے کان کھڑے ہو گئے اور پھر میں نے اس عورت کو لقمہ نگلتے ہوئے کہتے سنا:

''تو پھر کیا ہے، بہن، ایسی ہی حالت میں تو داغا جاتا ہے۔''

میں نے گھبرا کر سر اٹھایا تو دیکھا اماں اس عورت کو اشارے سے منع کر رہی ہیں کہ میرے سامنے یہ باتیں نہ کرے۔ اماں کی خالہ نے بات بدلتے ہوئے کہا، ''اماں خدا بخشے کہا کرتی تھیں، آدمی کے تن پر آتش جہنم حرام ہو جاتی ہے۔''

اب مجھ میں اور سننے کی تاب نہ رہی۔ میں اوپر دوڑا۔ آپا کے پاس پہنچا جو پلنگ پر بیٹھی چوزے کی یخنی چمچہ چمچہ کر کے پی رہی تھیں اور ان کی نظریں کھڑکی کے اوپر مکڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گیا اور سسکیاں لیتے ہوئے زور سے بولا:

''آپا، تمھارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں؟ میں انھیں ایسا نہیں کرنے دوں گا آپا، میں نہیں کرنے دوں گا...''

اسی وقت اماں آ گئیں۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں:

''بیٹے، اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ یہ خود چاہتی ہے بیٹے۔ کیوں بیٹی؟''

آپا نے چمچہ سینی میں ڈال دیا اور اونچی آواز میں بولیں:

''خدایا، مجھے موت کیوں نہیں دے دیتا؟ آخر کیوں؟''

وہ اسی طرح چیخ رہی تھیں کہ میں گھر سے باہر نکل گیا۔ معلوم نہیں سہ پہر کو کس مضمون کا پرچہ تھا لیکن یہ یاد ہے کہ اسکول سے نکلتے ہوئے فلم ''بگ جونز'' کی ایک تصویر پر حسن لش سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے سینے پر اتنے زور کی ٹکر ماری کہ اس کا سر پیچھے اسکول کے صحن میں لگے کاج کے پیڑ

Scanned with CamScanner

سے جا ٹکرایا۔ میں بھاگ نکلنے کو تھا کہ دیکھا حساب کا ٹیچر راستہ روکے کھڑا ہے۔ اسکول کے گیٹ سے ذرا پہلے۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ نہیں ہوا اور اپنا راستہ لینے کی کوشش کی، لیکن وہ دو ڈگ بھر کر میرے پاس آ گیا اور پیچھے سے میرا کالر پکڑ لیا۔

''اب غنڈہ گردی بھی کرنے لگا، پدر سوختہ! ہاں؟ اب میں تجھے بتاتا ہوں!''

''جو چاہے بگاڑ لو میرا!''

''اچھا، حرام زادے! یہ بات؟''

اس نے میری گدی پر تھپڑ مارا۔ میرا خیال ہے، بہت زور سے، کیونکہ میرا سر چکرا گیا۔ میں نے گدی پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ سر کو جھٹکا دیا۔ جلتی ہوئی گدی نے میرا ہاتھ بھی گرم کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب چکر نہیں آ رہے۔ آنکھیں کھولیں تو اسکول کا ناظم بھی اس کے برابر آ کھڑا ہوا تھا اور ہاتھ میں لی ہوئی چھڑی کو اپنی پتلون کے پائینچوں پر مار رہا تھا۔ ناظم سے میرا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ لیکن حساب کے ٹیچر سے تھا، اور بس اتنا کافی تھا۔ اور اصل مصیبت کی بات یہ تھی کہ پرنسپل سہ پہر کو اسکول نہیں آتا تھا، یا آتا بھی تو آخری گھنٹی بجنے سے پہلے چلا جاتا۔ پہلے میں نے سوچا کہ حساب کے ٹیچر کے منھ پر تھوک دوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے برا کیا ہوگا! لیکن مجھے محسوس ہوا کہ ناظم کے ہوتے ہوئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ وہ بہت صاف ستھرا رہتا تھا، اس کے پاس سے ہمیشہ خوشبو آیا کرتی، اور وہ میرے نیکر کے سلسلے میں دھوکا دینے کی بات بھی بھول چکا تھا۔ اس لیے میں نے دو بار آنکھیں بند کر کے کھولیں، داہنا ہاتھ گدی پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے دیوار پکڑ لی۔ مجھے کچھ نہیں ہوا تھا، صرف تھوڑی دیر پہلے میرا سر چکرایا تھا۔ جس وقت میری آنکھیں بند تھیں، وہ دونوں آپس میں کھسر پھر کر رہے تھے۔ پھر حساب کے ٹیچر کی آواز دور ہوتی محسوس ہوئی اور ناظم کی آواز سنائی دی:

''حسن کو کیوں مارا؟''

''چوری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نہیں کرنے دی۔''

''کیا چرانا چاہتا تھا؟''

اس سوال کا جواب نہ تھا۔ ہم لڑکے اپنے خاص کرتوتوں کا ذکر ہر کسی سے نہیں کرتے تھے۔ خاص کر فلم بازی کا جو بالکل ممنوع تھی۔ اس لیے میں چپ رہا۔ ناظم بولا:

Scanned with CamScanner

''تمھیں آ کر مجھ سے کہنا چاہیے تھا، لڑکے!'' یہ بات اس نے زور سے کہی۔ پہلے کی طرح نرم آواز میں نہیں۔ میں اسی طرح چپ کھڑا رہا۔

''اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ استادوں سے ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ اب میں تمھیں ایک گھنٹے کی سزا دے رہا ہوں تاکہ تم اپنی اصلاح کرو۔ یاد رکھو، اگر اگلی بار ایسا ہوا تو تمھیں اسکول سے نکال دیا جائے گا۔'' بولتے بولتے اس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ لیکن سب لڑکے جا چکے تھے۔ جس وقت میری گدی میں جلن ہو رہی تھی تب وہ ایک ایک کر کے آ رہے تھے اور حساب کے ٹیچر اور ناظم کے پیچھے سے نکل گئے تھے۔ اس لیے مجھے اطمینان تھا۔ پھر ناظم نے اسی طرح چیخ کر جمعدار کو بلایا اور مجھے اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا، ''اسے گھنٹہ بھر بند رکھو۔ جمعے کی شام خراب ہو گی تو پھر زبان درازی نہیں کرے گا۔'' اس نے چھڑی اس کے ہاتھ میں دی اور چلا گیا۔ جمعدار نے اس کے جانے کے بعد دروازہ بند کیا اور چھڑی مجھے دیتے ہوئے کہا، ''اسے ناظم کی میز پر رکھ کر کمرہ نمبر دو میں آ جاؤ۔''

میں چھڑی رکھ کر کمرہ نمبر دو میں پہنچا۔ جمعدار ایک ایک بنچ کو زور لگا کر اٹھا رہا تھا اور ڈیسک کے اوپر رکھ رہا تھا تاکہ کمرے کے فرش پر جھاڑو دے سکے۔ میں اس کی مدد کرنے لگا۔ ساری بنچیں اٹھا کر رکھنے میں پتا نہیں کتنی دیر لگی ہو گی۔ یہاں تک کہ سارے کمرے جھاڑو کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے کہا، ''میں جا کر پانی لے آتا ہوں تاکہ فرش اچھی طرح دھل جائے۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور بولا، ''نہیں بابا، کل جمعہ ہے۔ تمھیں دیر ہو جائے گی۔ مجھے ڈر ہے حاجی آقا بگڑیں گے۔ تم جا کر ہاتھ دھو لو۔ مجھے تمھارے جانے کے بعد تالا لگانا ہے۔''

میں حوض کی طرف لپکا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ بابا آج ہی صبح قم گئے ہیں۔ وہ بابا کو جانتا تھا، لیکن صرف رمضان میں احیا کی راتوں کو مسجد میں آتا تھا۔ میں اس کا اچھی طرح خیال رکھتا تھا، خواہ خود مسجد میں خدمت پر مامور ہوں یا نہ ہوں۔ چائے کی پیالیوں پر پیالیاں، نذر کی مٹھائیاں، کھجوریں یا شکر پنیر۔ اصل میں اس نے میری ایک خدمت کی تھی۔ میں اسے مشدی یحییٰ کہتا تھا۔ شاید پچھلے سال احیا کی رات تھی۔ بابا کی امامت میں نماز ہونے والی تھی اور میں نے اقامت پڑھی۔ مجلس ختم ہوئی تو وہ میرے پاس آیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر بولا، ''بے شک، حاجی آقا خود بہتر جانتے ہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ تم اقامت پڑھتے ہو۔ یہ تو بقال بچوں کا کام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلنے کو ہوا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

ذرا سوچا، پھر طے کیا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ اس لیے میں اس کے پیچھے لپکا اور اس سے پوچھا، ''مشدی یحییٰ، تمھارے نام کا شبِ احیا سے کیا تعلق ہے؟''

اس نے میری طرف دیکھا اور بولا، ''اگر مجھے ان باتوں کی خبر ہوتی تو جاروب کشی نہ کر رہا ہوتا۔ جاؤ جا کر حاجی آقا سے پوچھو۔'' یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اذان دینا اور اقامت پڑھنا، سب چھوڑ دیا۔ اسی لیے بابا کا خیال تھا کہ اسکول میں بچوں کو بے دین بنایا جاتا ہے۔ میں اسکول کے حوض پر ہاتھ منھ دھو چکا تھا اور یہی سب سوچتے ہوئے پانی سے کھیل رہا تھا کہ اسکول کے پھاٹک کی آواز سنائی دی۔ میں بھول گیا تھا کہ کہاں ہوں۔ میں نے خود سے جلدی کرنے کو کہا۔ لیکن جب اٹھنے لگا تو معلوم ہوا میرے پیر سو گئے ہیں۔ میں نے اپنی رانوں پر ذرا مالش کی اور اٹھا تو محسوس ہوا کہ میری گدی میں اب بھی تھوڑی تھوڑی جلن ہو رہی ہے۔ جب میں اسکول کے پھاٹک سے باہر نکل رہا تھا تو مشدی یحییٰ نے کہا، ''اس احمق کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ اس نے ابھی کچھ دن پہلے عمامہ پہننا چھوڑا ہے اور عالموں کا بالکل لحاظ نہیں کرتا۔ اپنے بابا سے میرا سلام کہنا۔''

جب میں گھر پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ جس کا مطلب تھا بابا گئے ہوئے ہیں۔ دروازہ چھوٹی بہن نے کھولا۔ میں نے اس کے گال پر چٹکی لے کر کہا، ''کتیا! اتنی دیر میں دروازہ کیوں کھولا؟''

''خدایا! اماں، دیکھیے یہ عباس ذلیل پھر آ گیا!''

گھر عجیب سنسان سا ہو رہا تھا۔ مغرب کے وقت ایسا ہی لگتا تھا۔ در و دیوار بتا دیتے تھے کہ بابا اس وقت مسجد گئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس بار وہ مسجد نہیں گئے تھے، قم گئے ہوئے تھے۔ جس وقت بابا گھر پر ہوتے تو خواہ حکم نہ بھی چلا رہے ہوں یا ان کے پاس کوئی نہ بیٹھا ہو یا ان کے کمرے کی بتیاں بجھی ہوئی ہوں، ان کے ہونے کا پتا چل جاتا تھا۔ گھر کی ہوا جیسے بوجھل ہو جاتی تھی۔ ہر چیز خاموش اور اپنی جگہ پر ہوتی۔ کسی چیز کو چھونے کی اجازت نہ ہوتی۔ ایسے وقت میں بھلا میں چھوٹی بہن کو چھیڑنے کی جرأت سکتا تھا؟ لیکن اس وقت تو وہ نہیں تھے... میں سیدھا باورچی خانے میں جا پہنچا۔

''سلام اماں، آج کھانے میں کیا ملے گا؟''

Scanned with CamScanner

کہ اچانک میری نظر اماں کی خالہ پر پڑی جو ایک کونے میں بیٹھے کسی بڑی بھاری بے ڈول سی چیز کو دھو رہی تھیں۔ میں سچ مچ شرمندہ ہو گیا۔ اماں چولھے کے پاس نیچی چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور انھوں نے سر اٹھائے بغیر میرے سلام کا جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ اماں کی خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور وہ بڑی سی بے ڈول چیز انھوں نے باورچی خانے کے کونے میں ڈال دی۔ دیوار کے پاس۔ اس وقت مجھے سیسے کی چمک دکھائی دی۔ چولھے کے بغیر دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے شعلوں کا عکس سیسے کی ٹیڑھی میڑھی، اونچی نیچی، ناہموار سطحوں پر پڑ رہا تھا جیسے ان میں سے ہر شعلہ وہاں الگ الگ جھلملا رہا ہو۔ مجھے ایک دم آپا کا خیال آیا۔ میں اوپر لپکا۔ مغرب کے وقت کے جھٹپٹے میں آپا پلنگ پر سیدھی لیٹی تھیں اور رضائی نے انھیں ٹھوڑی تک ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ بہنوئی ان کے سرہانے، سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے اور ان کی پیٹھ لرز رہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ان کا چہرہ مجھے بھیگا ہوا دکھائی دیا۔ انھوں نے ایک دو بار سر جھٹکا اور میرے سلام کے جواب میں بولے:

''عباس جان، تمھاری آپا ہمارے پاس سے جا رہی ہیں...''

اور یہ کہہ کر سسکیاں لینے لگے۔ بالکل اس طرح جیسے بوڑھے لوگ منبر کے قدموں میں بیٹھ کر روتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھ میں تاب نہیں۔ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔

''اماں، آپ نے آپا کے ساتھ کیا کیا ہے؟ کیا ہے جس کا صنم برکو پتا ہے اور مجھے پتا نہیں؟''

شاید میں پھر رو پڑا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ اماں کی خالہ نے مجھ سے جو سلوک کیا اس کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں۔ انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''بری بات ہے بیٹے۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ ماں سے اس طرح بات نہیں کی جاتی۔''

پھر وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے باورچی خانے سے باہر لے آئیں اور سرگوشی میں مجھ سے کہا کہ ان کے گھر جا کر پتا نہیں کیا چیز لے آؤں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ انھوں نے ''خلبت'' کہا تھا یا ''خلبت'' یا ایسا ہی کچھ۔ ان کا گھر پا قاپوق کے دوسری طرف تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میں جو کچھ وہ منگوا رہی ہیں لینے کب جاؤں گا اور کب واپس آؤں گا، لیکن چارہ ہی کیا تھا۔ میں فوراً روانہ ہو گیا۔ راستے بھر میں مکڑی اور سرطان اور آپا کے بارے میں اور گرم سیسے سے داغنے کی جو باتیں سنی تھیں ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اماں کی خالہ

Scanned with CamScanner

کے گھر پہنچا تو بجائے اس کے کہ وہاں مجھے کوئی چیز دے کر واپس بھیجا جاتا، مجھے وہیں روک لیا گیا اور کھانا کھلا کر سلا دیا گیا۔ اگلے دن صبح سویرے ان کا بیٹا مجھے شاہ عبدالعظیم لے گیا اور جب سہ پہر کو میں اس کے ساتھ اپنے گھر واپس پہنچا تو گھر سنسان پڑا تھا اور وہاں چھوٹی بہن اور ایک بڑی بہن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میرے ساتھ آنے والے کے لیے چائے تیار کی جانے لگی اور میں اوپر کے کمرے میں چلا گیا۔ دیکھا کہ وہاں نہ آپا ہیں اور نہ ان کا پلنگ۔ لیکن مکڑی اپنے جالے اور اس میں پھنسی ہوئی مردہ مکھیوں سمیت اسی طرح کھڑکی کے اوپر دیوار پر موجود تھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں نے جوتا اتارا اور اس کی طرف کھینچ مارا، اتنے زور سے کہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔

❁❁

(فارسی عنوان: ''خواہرم وعنکبوت'')

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

امریکی شوہر

"... وودکا؟ نہیں، شکریہ۔ وودکا مجھ سے نہیں چلتی۔ وِسکی ہو تو ٹھیک ہے۔ زیادہ نہیں، بس گلاس کی تہہ بھر۔ بہت شکریہ۔ نہیں، پانی بھی نہیں۔ سوڈا ہوگا؟ افسوس! اس غلیظ شخص کی عادتوں نے مجھ پر بھی اثر ڈال دیا ہے۔ آپ نہیں جانتے وسکی اور سوڈا کس طرح پیا کرتا تھا۔ جب تک میں پاپا کے گھر میں تھی، میں نے کبھی چکھی تک نہ تھی۔ خود پاپا نے بھی کبھی نہ چکھی تھی۔ نہیں، وہ مومن یا پاکباز نہیں تھے۔ بس، یونہی، ہمارے گھر میں رواج ہی نہیں تھا۔ لیکن پہلی چیز جو اس شخص نے مجھے سکھائی وہ وسکی سوڈا بنانا تھا۔ کام سے جوں ہی واپس آتا، راہداری میں گھستے ہی اسے وسکی سوڈا چاہیے ہوتا تھا۔ ہاتھ دھونے سے بھی پہلے۔ اور کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے ان ہاتھوں سے کیا کام کرتا ہے... جب وہ گھر پر نہ ہوتا، کبھی کبھی مجھے وسکی چکھنے کی خواہش ہوتی۔ ہاں، اس وقت میری بیٹی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور تنہائی سے میں بالکل اکتا چکی تھی۔ لیکن مجھے اچھی نہیں لگی۔ حلق بری طرح جلنے لگتا تھا۔ اس نے کتنی ہی ضد کی، میں نے اس کے ساتھ کبھی نہیں پی۔ لیکن جب حاملہ ہوئی تو اس نے اصرار کیا کہ میں بیئر ضرور پیوں۔ کہ یہ میرے دودھ کے لیے اچھی ہوگی۔ لیکن وسکی کبھی نہیں۔ آخر تک مجھے اس کی عادت نہیں پڑی۔ لیکن جس دن مجھے اس کے پیشے کا پتا چلا، میں نے بے اختیار وسکی اپنے اندر انڈیل لی۔ میں نے ایک گلاس اپنے لیے بنایا اور ایک اس لڑکی کے لیے جو اس کی 'گرل فرینڈ' تھی۔ یا سابق منگیتر۔ دراصل اسی نے آکر مجھے اطلاع دی تھی۔ پھر ہم دونوں بیٹھ کر وسکی پینے اور دردِ دل کہنے لگے۔ اگر تب نہ روتی تو کب

Scanned with CamScanner

روتی؟ آپ خود سوچیے۔ انسان ڈگری یافتہ ہو، خوش شکل ہو... آپ دیکھیے۔ پھر میرے پاپا حیثیت والے آدمی۔ خوشحال گھر۔ اور انگریزی پڑھی ہوئی۔ یعنی کسی طرح کی مجبوری نہیں کہ کسی بھی مرد کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ اور اس پر یہ سب!... سچ کہیے، آپ کو یقین آ سکتا ہے؟ سارا ملک جوان، پڑھے لکھے لڑکوں سے بھرا پڑا ہے۔ انجینئر، ڈاکٹر، سب... لیکن وہ سب کے سب کمبخت جا کر فرنگنیں پکڑ لاتے ہیں یا امریکنیں۔ محلے کے ڈاکیے کی بیٹی، یا سپر مارکیٹ کی سیلز گرل، یا دنداں ساز کی مددگار جس نے کبھی ان کے منھ میں روئی کا پھاہا رکھا ہوگا۔ اور پھر ذرا انھیں دیکھیے، کیسی اتراتی پھرتی ہیں! جیسے سوزن ہیورڈ ہوں یا شرلی میکلین یا الزبتھ ٹیلر۔ ٹھہریے، میں بتاتی ہوں ان کے بارے میں۔ ابھی پرسوں شام ہی میں نے ایسی ایک لڑکی کو دیکھا۔ دو مہینے پہلے ایک ایرانی لڑکے سے شادی کی ہے اور یہاں ابھی پندرہ دن پہلے ہی آئی ہے۔ اس کے شوہر کو ٹیلیگرام بھیج کر بلایا گیا کیونکہ اسے مجلس کی رکنیت دے دی گئی ہے۔ مالک مکان نے مجھے بلوا بھیجا تھا کہ اس کی غیر ملکی مہمان تنہائی محسوس نہ کرے، کسی سے اپنی زبان میں بات کر سکے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے کی بات ہے۔ لڑکی کا لہجہ بالکل ٹیکسس والوں کا سا... نہیں، ہنسیے مت۔ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ منھ ایسا پھاڑتی تھی کہ پوچھیے مت۔ ناخن ابھی تک گندے تھے۔ معلوم ہوتا تھا روز ڈھیروں برتن دھویا کرتی ہے۔ اس پر معلوم ہے کیا بولی؟ کہتی ہے: ہم نے آ کر تم لوگوں کو تہذیب سکھلائی اور بتلایا کہ گیس کی بتیاں اور واشنگ مشین کیسے استعمال کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اور خود اس کے ہاتھوں سے صاف لگ رہا تھا کہ ٹیکسس میں ٹب میں کپڑے ڈال کر ہاتھ سے دھوتی ہوگی۔ اور اس پر یہ اتراہٹ! کسی مویشی پالنے والے کی بیٹی ہے۔ ان میں سے نہیں جن کی زمین پر تیل نکل آتا ہے اور وہ خدا کے بندے ہی نہیں رہتے۔ نہیں، بلکہ دوسروں کے مویشی پالنے والا۔ ظاہر ہے میں نے تو اس سے کچھ کہا نہیں۔ لیکن وہاں بیٹھا ہوا ایک اور آدمی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بول پڑا کہ اگر یہی تہذیب ہے جو تم کہہ رہی ہو تو جس کمپنی نے واشنگ مشین کے ساتھ تمھیں تحفے کے طور پر بھیجا ہے، یہ سب کچھ اسی کو مبارک ہو۔ لیکن لڑکی کچھ سمجھی نہیں۔ یعنی اس آدمی کی انگریزی اس کے پلّے نہ پڑی۔ ناچار مجھے اس کی بات کا ترجمہ کرنا پڑا۔ تو بجائے اس کے کہ اس آدمی کو جواب دیتی، اس نے میری طرف رخ کر لیا اور کہنے لگی کہ تم ضرور آوارہ اور ایسی ویسی عورت رہی ہوگی کہ شوہر نے تمھیں طلاق دے دی۔ بالکل صاف صاف! کیونکہ میں نے، اس آدمی کی سخت بات کا اثر کم کرنے کے لیے

اور اس لڑکی کا دل بہلانے کے لیے اسے اپنا قصہ سنا دیا تھا کہ کس طرح امریکہ میں تھی اور شوہر امریکی تھا اور پھر کس طرح طلاق لے کر واپس آ گئی۔ اور جب میں نے اسے بتایا کہ میرے شوہر کا پیشہ کیا تھا جس کی وجہ سے میں نے طلاق لی، تو معلوم ہے کیا بولی؟ کہنے لگی کہ اس میں کیا برائی تھی۔ پیشے میں کیسی شرم۔۔۔۔ ضرور اس کا خاندان تم سے جان چھڑانا چاہتا ہو گا تا کہ تمھارا بچہ اس کی میراث میں حصے دار نہ بن جائے۔ یا پھر تم بدچلن ہو گی، وغیرہ وغیرہ۔ اسے اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ وہ یہاں نئی آئی ہے! ایسا برتاؤ کر رہی تھی جیسے ہم اس کے ماتحت ہوں۔ خیر، ظاہر ہے، اس کا شوہر مجلس کا رکن جو ہوا۔ اگر یہ کمبخت جا کے ان چھنالوں کو نہ پکڑ لایا کریں تو مجھ جیسی لڑکی کو وہاں جا کے خود کو اس مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت۔۔۔ نہیں بس شکریہ۔ اتنی زیادہ مت دیجیے۔ میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، خالی پیٹ وسکی پینے سے۔ بس گلاس کی تہہ بھر۔ تھوڑا سا پنیر مل جاتا تو اچھا تھا۔۔۔ شکریہ۔ اوہ! یہ پنیر ہے؟ اتنا سفید کیوں ہے؟ اور نمکین۔ کہاں کا ہے؟۔۔۔ لیقوان؟ وہ کہاں ہے؟۔۔۔ اچھا، میں اس سے واقف نہیں۔ ہالینڈ اور ڈنمارک کے پنیر کو جانتی ہوں، اس والے کو نہیں جانتی۔ مجھے پسند نہیں آیا۔ پستے والا اچھا ہوتا ہے۔ شکریہ۔ میں کیا کہہ رہی تھی؟ ہاں، میری اس سے جان پہچان امریکی کلب میں ہوئی تھی۔ ایک سال سے انگریزی کی کلاس میں جا رہی تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں ان میں کتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ ڈپلوما لینے کے بعد میں نے یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان کے لیے نام لکھوایا تھا۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں، بیس تیس ہزار امیدواروں میں کہاں داخلہ ملتا ہے۔ اس لیے پاپا نے کہا، زبان کی کلاس میں داخلہ لے لو۔ مزہ بھی رہے گا اور ایک غیر ملکی زبان بھی سیکھ جاؤ گی۔ اس وقت وہ غلیظ آدمی انگریزی کلاس کا استاد تھا۔ لمبا قد تھا، خوش شکل، سنہری بال۔ پرفیکٹ امریکی۔ ہاتھ اتنے بڑے بڑے تھے، پوری ورک بک ڈھک جاتی تھی۔ خیر۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ شروع ہی سے۔ اس کے طور اطوار بڑے شائستہ تھے۔ پہلے اس نے مجھے مصوری کی نمائش دیکھنے کی دعوت دی۔ عباس آباد کے نئے کلب میں۔ اس قسم کی تصویریں تھیں جن میں بغیر جسم کا سر دکھایا جاتا ہے، یا رنگوں کے دھبوں کی قطاریں، یا آدمی کے نام پر تکیے کی تصویر بنا دیتے ہیں اور اس کے اوپر بڑا سا پیالہ دھر دیتے ہیں، یا دو میٹر کے کینوس کے بیچ میں قہوے کے رنگ کے دو گولے بنا دیتے ہیں۔ پاپا اور ماما کو بھی اس نے مدعو کیا تھا۔ ان کے تو دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ پھر وہ ہمیں اپنی کار میں گھر پہنچانے آیا۔ بڑی شائستگی کے ساتھ، کار کا

دروازہ کھولنا، وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ بھی پاپا اور ماما کے لیے جن کے پاس خود اس وقت کار نہیں تھی۔ خیر۔ اس شام کے بعد سے سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر وہ مجھے رقص کی محفل میں لے گیا۔ ان لوگوں کا کوئی تہوار تھا۔ غالباً تھینکس گِونگ۔ ارے! آپ کو نہیں معلوم؟ ایک ہی تو امریکہ ہے اور ایک ہی تھینکس گِونگ۔ یعنی یومِ شکر گذاری۔ اس دن امریکیوں نے آخری ریڈ انڈین کو ختم کیا تھا۔ پاپا نے فوراً اجازت دے دی۔ کیسے نہ دیتے؟ کلاس سے باہر انگریزی بولنے کی مشق کرنے کے لیے میرے پاس اور کون تھا؟ زبان کی جب تک مشق نہ کی جائے تب تک کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پھر یہ طے ہوا کہ میں اسے فارسی سکھاؤں گی۔ ظاہر ہے کلاس سے باہر۔ اس کے لیے وہ ہفتے میں ایک بار ہمارے گھر آنے لگا۔ یہی طے ہوا تھا۔ خیر، اس رقص کی محفل کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کیسا جشن تھا! ایک کدو میں سوراخ کر کے آنکھیں، ناک اور منھ بنا دیے گئے تھے اور اس کے اندر بتی روشن کر دی گئی تھی۔ اور کیسا رقص تھا! اس وقت تک مجھے انگریزی کچھ کچھ آ گئی تھی، اس لیے مجھے محفل میں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ وہاں بہت سے ایرانی بھی تھے۔ لیکن اس رات اس کے بہت اصرار کرنے پر بھی میں نے بیئر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ اس پر بھی خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس رات جب وہ مجھے گھر چھوڑنے آیا تو ماما سے کہنے لگا، ایسی بیٹی کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میں نے اس کی بات کا خود ترجمہ کیا۔ اس وقت تک میں ایک طرح کی ترجمان بن چکی تھی۔ آٹھ مہینے تک ہم اسی طرح ملتے رہے۔ کشتی رانی کے لیے کرج بند پر جاتے، سنیما جاتے، میوزیم جاتے۔ بازار جاتے۔ شاہ عبدالعظیم جاتے۔ اور بہت سی جگہیں جو اگر وہ نہ ہوتا تو میں شاید زندگی بھر نہ دیکھتی۔ کرسمس کی شب اس نے ہم سب کو اپنے گھر مدعو کیا۔ کرسمس کی شب تو جانتے ہیں نا؟ پاپا اور ماما بھی تھے۔ ففر بھی تھا۔ اسے نہیں جانتے؟ میرا بھائی ہے نا، فریدون۔ دو بھنی ہوئی بطخیں اس کے لیے لاس اینجلس سے بھیجی گئی تھیں۔... اوہو! تو پھر جانتے کیا ہیں؟ ارے وہی شہر جہاں ہالی وُڈ ہے۔ بطخیں اکیلے اس کے لیے نہیں بھیجی گئی تھیں۔ اُن سب کے لیے بھیجی جاتی ہیں تاکہ انھیں تہوار کی رات غیر ملک میں تنہائی کا احساس نہ ہو۔ جب اس جیسے غلیظ آدمی کو کسی خاص کام سے تہران بھیجتے ہیں تو پھر اس کے لیے بطخیں، اور بیئر اور سگریٹ اور وسکی اور چاکلیٹ، سب کچھ بھیجتے ہیں۔ یقین کیجیے اگر وہ آدمی قاتل ہوتا، چور ڈاکو ہوتا، گینگسٹر ہوتا، تب بھی مجھے منظور تھا، لیکن ایسا کام؟... مہربانی کر کے تھوڑی سی وسکی اور دیجیے، بس گلاس کی تہ بھر... یہ وسکی امریکی نہیں لگتی۔ وہاں بور بن پیتے

ہیں۔ مٹی جیسا ذائقہ ہوتا ہے اس کا۔ ہاں، یہ اسکاچ ہے۔ بہت تیز ہے، بالکل انگریزوں کی طرح۔ اچھا، میں کیا کہہ رہی تھی؟ ہاں، اسی رات اس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ باقاعدہ، کھانے کی میز پر۔ اس کا بھی میں نے خود ترجمہ کیا۔ مزے کی بات ہے نا؟ کسی لڑکی کو اس طرح شوہر نہیں ملا ہوگا۔ پہلے اس نے بطخ کے پارچے کاٹے اور ہم سب کی رکابیوں میں رکھے۔ پھر شمپین کی بوتل کھولی اور پاپا اور ماما کے لیے بھی انڈیلی۔ سب کے لیے انڈیلی۔ ماما نے تو نہیں پی۔ لیکن پاپا نے پی۔ خود میں نے بھی چکھی۔ پہلے مجھے تلخ اور تیزابی سی لگی۔ لیکن جب اس کی تلخی جاتی رہی تو مٹھاس باقی رہ گئی۔ پھر اس نے کہا، پاپا کو بتاؤ کہ میں تمھارا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔ اس کا اصرار تھا کہ اس کی باتیں جملہ بہ جملہ دہراؤں، واضح طور پر۔ کہ اس نے ملٹری سروس کی ہے، اس کا ٹیکس معاف ہے، خون کا گروپ بی ہے، کوئی بیماری نہیں ہے، تنخواہ ۱۵۰۰ ڈالر ماہانہ ہے، جو واپس جانے پر ۸۰۰ ڈالر رہ جائے گی۔ لیکن واشنگٹن میں اس کا اپنا مکان ہے، اور اسے کوئی کرایہ یا قرضے کی قسط نہیں دینی پڑتی۔ اس کے والدین لاس اینجلس میں ہیں اور اس کی زندگی میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ اور اسی طرح کی باتیں۔ پاپا تو پہلی رات ہی سے راضی تھے۔ انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ بیٹی، احتیاط سے کام لینا، ہزاروں میں سے کسی ایک لڑکی کو کسی امریکی کی بیوی بننے کا موقع ملتا ہے۔ مذاق کی بات نہیں، ایسی خوش قسمتی کسے نصیب ہوتی ہے۔ ان کی بات اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ تم خود سمجھدار ہو۔ شوہر کے ساتھ زندگی تمھیں بسر کرنی ہے۔ اس سے ایک ہفتے کی مہلت مانگ لو تا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں نے یہی کیا۔ ظاہر ہے، معاملہ تو شروع ہی سے طے ہو چکا تھا۔ پورا کنبہ جانتا تھا۔ دو تین دعوتیں اور مہمان نوازیاں وغیرہ بھی ہوئیں۔ اور اس قدر رشک! کتنی ساری لڑکیوں کو اس کے سامنے پریڈ کرائی گئی۔ اس معاملے پر میری خالہ اور چچا کی بیٹیوں نے مجھ سے بول چال بند کر دی۔ پاپا ٹھیک کہتے تھے، کوئی مذاق نہیں تھا۔ سب لڑکیاں یہی تمنا رکھتی تھیں۔ لیکن اس نے میرا رشتہ مانگا۔ کیا میں اپنی قربانی دے کر کسی اور لڑکی کو اپنی جگہ دے دیتی؟ اس تمام کے دوران صرف دادی جان ایسی تھیں جو بڑبڑاتی رہیں۔ کہتی تھیں کہ ہمارے کنبے میں کاشان، اصفہان، یہاں تک کہ بوشہر تک کے لوگ ہیں، سب جانے پہچانے۔ لیکن امریکہ کا کوئی نہیں۔ ہمیں کیا پتا یہ کون شخص ہے۔ اس کے خاندان اور گھر اور ہمسایوں اور سب چیزوں کی تحقیق کیسے کی جائے گی؟ اسی طرح کی دادی اماؤں کی سی باتیں۔ وہ ہماری شادی میں بھی شریک نہیں ہوئیں۔ اٹھ کر مشہد چلی گئیں

Scanned with CamScanner

تا کہ موجود ہی نہ ہوں۔ لیکن میرا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ ہم نے رجسٹرار کو اطلاع کر دی تھی۔ شادی کی تقریب میں پورا کنبہ موجود تھا، اور کئی امریکی بھی۔ اور کیا تصویریں تھیں شادی کی دعوت کی! میرے شوہر کے ایک دوست نے فلم بھی بنائی۔ لیکن ان امریکیوں سے خدا بچائے! ہر چیز جاننا چاہتے تھے۔ ایک ایک آ آ کے ہر قسم کے سوال کرتا رہا۔ یعنی میں دلہن بنی بیٹھی ہوں، اور انھیں ذرا جو خیال ہو! کہ اس کو کیا کہتے ہیں؟ شکر کی ڈلیوں کو توڑ کیوں رہے ہیں؟ کیک پر کیا لکھا ہے؟ یہ جنگلی اسپند کہاں سے آتی ہے؟ ... بہر حال، یہ سب کچھ گزر گیا۔ تقریب کے دن کنبے کے دو افراد کو، جو پہلے سے تیار تھے، اس کے دفتر میں ڈرائیور کے طور پر ملازمت دی گئی۔ ایک لاکھ تومان مہر مقرر ہوا۔ شادی کی تقریب میں اس نے کلمہ پڑھا۔ اور کس قدر مشکل سے! اور اس کے تلفظ پر ہم کتنا ہنسے تھے!... یہ سب شادی کو شرعی بنانے کے لیے۔ اس کا پیشہ؟ انگریزی کا استاد تھا وہ۔ بعد میں شادی کی دستاویز میں اسے وکیل لکھا گیا۔ سفارت خانے کے دو افراد اس کی طرف سے گواہ تھے۔ اس نے مجھ سے جو جھوٹ بولا تھا صرف اس کی بنیاد پر میں اسے جیل بھجوا سکتی تھی۔ اور ہرجانہ بھی مانگ سکتی تھی۔ کم از کم اسے اس پر تو مجبور کر سکتی تھی کہ جو چار سو ڈالر وہ میری بیٹی کے خرچے کے لیے بھجواتا ہے، اس کے علاوہ چھ سو ڈالر مجھے بھی ادا کیا کرے۔ لیکن فائدہ کیا؟ اب تو اس کی شکل دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ میں اسے گھنٹے بھر کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بچی کو میرے سپرد کرنے پر راضی ہو گیا، ورنہ وہاں کے قانون کے مطابق وہ اسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ بے شک مہر میں نے معاف کر دیا۔ اپنا پیسہ وہ چاہے قبر میں لے جائے! کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ وہ یہ پیسہ کماتا کس ذریعے سے تھا... اس پیسے سے سونے کا ہار بنوا کے کوئی گلے میں پہن سکتا ہے؟ یا گوشت اور چاول خرید کے کھا سکتا ہے؟ وہ لڑکی بھی اس روز یہی کہہ رہی تھی۔ وہی اس کی سابق گرل فرینڈ۔ یا ساتھ رہنے والی۔ یا منگیتر۔ مجھے کیا پتا؟ پہلی اور آخری بار اسے اسی وقت دیکھا تھا۔ ہوائی جہاز میں سیدھی لاس اینجلس سے واشنگٹن پہنچی تھی۔ اور ایرپورٹ سے کرائے کی گاڑی لے کر سیدھی ہمارے گھر۔ پورے دو سال جو میں واشنگٹن میں رہی، اس کے خاندان کے کسی فرد سے ملنا نہیں ہوا۔ کہتا تھا، فاصلے بہت زیادہ ہیں، اور سب اپنے اپنے معاملات میں مصروف ہیں، وغیرہ۔ میں بھی سکون سے تھی۔ کوئی میرے سر پر سوار نہ تھا۔ بس کبھی کبھی ان لوگوں کو خط لکھ دیتی، یا ان کا خط آ جاتا۔ میں نے اپنی بیٹی کی تصویریں بھی انھیں بھیجیں۔ انھوں نے اس کے لیے تحفے بھیجے۔ میں نے اس کی پہلی

Scanned with CamScanner

سالگرہ کی تصویریں بھی بھیجیں۔اس کے بعد سے ان کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔ پھر یہ لڑکی آ پہنچی۔ اس نے آ کر سلام دعا کی اور اپنا تعارف کرایا، بڑی تمیز سے بات کی۔ پوچھنے لگی کہ مجھے تنہائی سے گھبراہٹ تو نہیں ہوتی۔ میری بیٹی کی خوب تعریفیں کیں کہ کتنی پیاری ہے۔وغیرہ وغیرہ۔ میں اس وقت واشنگ مشین سے الجھ رہی تھی جس میں کچھ خرابی تھی۔ وہ بڑی سادگی سے آ کر میری مدد کرنے لگی۔ ہم نے اسے ٹھیک کیا، اس میں کپڑے ڈالے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ ان دونوں کی منگنی ہوئی تھی، پھر اُسے کوریا کی جنگ میں بھیج دیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ لاس اینجلس لوٹا ہی نہیں۔ یہیں واشنگٹن میں ملازمت کر لی۔ کہنے لگی، پتا نہیں ان جوانوں کو کوریا میں کس مصیبت سے پالا پڑا ہوگا کہ واپس آ کر وہ اس قسم کے کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا، کیسا کام؟ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ مجھے اپنے شوہر کا پیشہ بھی نہیں معلوم۔ کہنے لگی کہ خیر، یوں تو کسی کام میں عار نہیں، لیکن اس کے پورے کنبے نے اسے اس کام کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو بہت سمجھایا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔... اب میرا دل اس بات سے ہولنے لگا کہ کہیں جلاد نہ ہو۔ یا گیس چیمبر یا بجلی کی کرسی پر مامور نہ نکلے۔ اس قسم کے کام بھی بہر حال کسی نہ کسی طرح قانونی کام ہی گنے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا کام؟ جب اس لڑکی نے مجھے بتایا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میری حالت ایسی خراب ہوئی کہ لڑکی خود اٹھ کر بوفے میں گئی اور وسکی کی بوتل لے کر آئی۔ مجھے ایک گلاس بنا کر دیا، خود اپنے لیے بھی ایک گلاس بنایا اور پھر بیٹھ کر اپنا قصہ سنانے لگی۔... یہ تیسرا منگیتر تھا جو اس طرح اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلا کوریا کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ دوسرا ویت نام چلا گیا اور تیسرا یہ... بولی، کچھ پتا نہیں چلتا کیوں، یہ لوگ جب واپس آتے ہیں تو یا اس قسم کے عجیب وغریب کام کرنے لگتے ہیں یا سڑی، دیوانے، قاتل اور چور بن جاتے ہیں۔ اور کہنے لگی، عجیب بات ہے کہ میں اب تک اپنے شوہر کے پیشے سے لاعلم رہی۔ آخر میں کسی گھریلو ملازمہ کی بیٹی یا راستے پر پڑی ہوئی یا یتیم خانے میں پلنے والی لڑکی تو ہوں نہیں۔ ڈگری یافتہ ہوں، ماں باپ رکھتی ہوں، خوش شکل ہوں، وغیرہ وغیرہ۔... ہاں، شکریہ۔ ایک اور ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ آپ کے مہمان تو اب تک آئے نہیں۔ میرا حلق بری طرح خشک ہو رہا ہے۔ بری بات یہ تھی کہ اس لڑکی نے میرے دل میں جگہ بنا لی۔ اچھی صاف ستھری، تمیزدار لڑکی تھی۔ کہنے لگی، سات سال ہو گئے لاس اینجلس میں شوہر کی تلاش میں ہوں اور فلمی ستارہ بننے کی

Scanned with CamScanner

دُھن ہے۔ پھر ہم دونوں ساتھ اٹھے، دھلے ہوئے کپڑے پھیلائے، بچی کو اس کے گڈولنے سمیت کار کی پچھلی سیٹ پر جمایا اور شوہر کے کام کرنے کی جگہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ اور جب تک اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیتی آ بھی نہ سکتا تھا۔ پہلے ہم اس کے دفتر پہنچے۔ سلام دعا کے بعد دفتر والوں نے پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ کیسی کیسی تصویریں وہاں لگی ہوئی تھیں پارکوں اور درختوں کی۔ اگر آپ کو معلوم نہ ہو کہ وہ کیا جگہ ہے تو آپ یہ خیال کریں گے کہ وہاں کوئی ہنی مون کاٹیج تعمیر کیا جا رہا ہے۔ ہر چیز کا باقاعدہ نقشہ تھا۔ ناپ تول، حساب کتاب، دونوں طرف دستے اور آنکڑے، اور اوپر ایک بڑا سا گلدستہ۔ لکڑی اور اس پر ڈالا جانے والا کپڑا اور رسومات جیسی آپ چاہیں۔ اور لے جانے والی گاڑی کتنے گھوڑوں والی ہو، یا پٹرول سے چلنے والی، جو سستی پڑتی ہے، اور کون سا ماڈل، وغیرہ۔ ساتھ چلنے کے لیے کتنے آدمی چاہییں اور فی آدمی کیا لاگت آئے گی، جس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ کتنے سوگوار دکھائی دیں اور کن رشتے داروں کی کمی پوری کریں، کس قسم کا لباس پہنیں اور کس گرجا گھر میں پیش ہوں... پتا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔ دفتر کے کونے کونے میں معلوماتی کتابچے رکھے تھے اور ماچسیں اور کاغذی رومال۔ ان کتابچوں میں سب تفصیلات تصویروں سمیت دی گئی تھیں اور اس طرح کے جملے درج تھے کہ "مخمل میں ابدی نیند"، یا "فلاں پارک بہشتِ ثانی ہے" وغیرہ۔ دفتر کے کارندے ہمارے آس پاس منڈلا رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ ہمیں ایک فرد کے لیے جگہ چاہیے یا پورے خاندان کے لیے۔ اور یا اگر خاندان کے لیے چاہیے تو کتنے افراد کا خاندان؟ اور آپ کے لیے خاص رعایت ہے کہ اگر پورے خاندان کے لیے لیں تو آدھی قیمت پر جگہ مل جائے گی اور قسطوں میں ادائیگی کی بھی سہولت موجود ہے۔... اور میرا دل تھا کہ پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ میرے شوہر کا پیشہ یہ ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ وکیل ہے۔ لایر! آخر ہم نے اپنا تعارف کرایا اور پوچھا کہ میرا شوہر کس جگہ کام کر رہا ہے۔ یہ ہم نے عام سے انداز میں دریافت کیا تا کہ انھیں کوئی شک نہ ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ یہ خاتون اس کی بہن ہے، اسے آج سہ پہر ہی لاس اینجلس واپس جانا ہے اور جانے سے پہلے اسے بہت ضروری کام کے سلسلے میں میرے شوہر سے ملنا ہے اور میں نہیں جانتی کہ میرے شوہر کی ڈیوٹی آج کس جگہ ہے۔... پھر ہم دفتر سے باہر نکل آئے اور سیدھے اس جگہ پہنچے جہاں وہ کام کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت تک یقین نہ آیا

Scanned with CamScanner

جب تک میں نے اسے شمشاد کے درختوں کی قطار کے پیچھے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا۔ اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں، ڈانگری پہن رکھی تھی اور باغ کی زمین کا ناپ لے رہا تھا۔ قطعے کے چاروں کونوں پر نشان لگا کر اس نے برقی پھاوڑا اٹھایا اور پورے قطعے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھودا۔ پھر اگلے مقام پر چلا گیا۔ پھر دو سیاہ فام آدمی آئے اور کھدے ہوئے گڑھوں میں سے گھاس ملی مٹی نکال کر بوریوں میں ڈالنے اور بوریوں کو ایک چھوٹے ٹرک میں رکھنے لگے۔ پھر میرا شوہر واپس آیا اور اس نے کھدائی کا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ دونوں سیاہ فام آدمی بھی وہی مٹی نکال کر بوریوں میں ڈالنے اور ٹرک میں رکھنے کا کام کرنے لگے۔ وہ اسی طرح اوپر اور نیچے آتا جاتا رہا اور دونوں سیاہ فام آدمیوں میں سے ایک اس کے پیچھے پیچھے رہا۔ تینوں نے ایک ہی طرح کی ڈانگری پہن رکھی تھی۔ اور تینوں کس قدر توجہ سے کام کر رہے تھے۔ مٹی کا ایک ذرہ بھی چمن پر اردگرد نہ گرنے دیتے تھے۔ ہم دونوں اسی طرح کار کے اندر بیٹھے آدھے گھنٹے تک سڑک کے کنارے لگے شمشاد کے درختوں کی قطار میں سے یہ سب تماشا دیکھتے رہے اور زار زار روتے رہے۔ چھوٹے ٹرک گھاس ملی مٹی کی بوریاں لادے ہماری گاڑی کے برابر سے گزر کر باہر جا رہے تھے اور دوسرے ٹرک نئے تابوت اٹھائے آ آ کر چمن کے باہر کھدائی کا کام پورا ہونے کے انتظار میں قطار میں کھڑے ہو رہے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ویت نام سے فوجیوں کی لاشیں لائی جا رہی تھیں۔ دستوں کی صورت میں۔ دن میں دو دو سو، تین تین سو۔ اور وہاں سب لوگ بے انتہا مصروف تھے۔ میرا شوہر جس ٹولی میں تھا اس کے علاوہ بھی دس بارہ ٹولیاں کام کر رہی تھیں۔ چمن کے مختلف گوشوں میں۔ اور کیا چمن تھا! اس کا نام آرلنگٹن ہے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ امریکہ کا ایک ہی صدر مقام ہے اور اس میں ایک ہی آرلنگٹن۔ پوری دنیا میں مشہور ہے۔ امریکہ میں ایک ہی تو آرلنگٹن ہے۔ یہ سب مجھے اسی دن اس لڑکی نے بتایا۔ یہ جگہ جنگِ آزادی کے وقت سے مشہور ہے۔ کینیڈی بھی یہیں ہے۔ لوگ وہاں اس مقام کو دیکھنے جاتے ہیں۔ احترامی گارڈ بھی متعین ہے اور اس کی تبدیلی بڑے طمطراق سے ہوتی ہے۔ دور دور تک چمن اور پہاڑیاں پھیلی ہیں۔ دور دور تک زمین کے ہر قطعے پر گھاس اگی ہے اور درخت اور جھاڑیاں، اور ہر شخص کے سر کے اوپر ایک سفید پتھر نصب ہے جس پر اس کا نام اور دوسری تفصیل لکھی ہے۔ کرنل اس طرف، میجر اُس طرف اور عام سپاہی اُدھر تیسری طرف۔ لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ ان کی قطاریں ان کے فوجی عہدے کے حساب سے بنی

Scanned with CamScanner

ہوئی ہیں۔ پتا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔ لڑکی بولی، ہم امریکیوں کی تمام کوششیں یہاں آرلنگٹن میں آ کر ختم ہو جاتی ہیں۔... اس کے دل پر کیا کیا صدمے گزرے تھے۔ سات سال انتظار کیا اور تین منگیتر جاتے رہے۔ پہلے دو کا مقام بھی مجھے دکھلایا۔ اور کینیڈی کا بھی۔ اور وہ جگہ بھی جہاں احترامی گارڈ کی تبدیلی ہوتی ہے۔ لیکن تماشا دیکھنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے باہر کھایا۔ پھر سینما چلے گئے جہاں میری بیٹی متواتر روتی رہی اور میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی چار بجے سہ پہر وہ مجھے گھر پہنچا کر چلی گئی۔ اس نے دو طرفہ رعایتی ٹکٹ خریدا تھا اور اس کا اسی روز واپس جانا ضروری تھا۔ جانتے ہیں اس نے جاتے ہوئے آخری بات مجھ سے کیا کہی؟ کہنے لگی، یہ لوگ جنگ کے معاملات میں اتنے کھوئے ہوئے ہیں کہ ہماری زندگیوں کو فراموش کر چکے ہیں۔...

اس شام مغرب کے وقت جب میرا شوہر گھر لوٹا تو میں نے یہ موضوع چھیڑا۔ اس لڑکی کے جانے کے بعد سے میں اسی سوچ میں تھی اور ٹیلیفون پر جان پہچان کے ایرانیوں سے مشورہ کرتی رہی تھی۔ مجھے وہ دن یاد آیا جب ایران میں وہ مجھے اصرار کر کے مسگر آباد لے گیا تھا۔ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ہم گلستان میوزیم دیکھنے جا رہے ہوں۔ اس وقت مجھے بالکل پتا نہ تھا کہ مسگر آباد کیا ہے اور کہاں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتا تو میں تہران کی بہت سی جگہوں کو نہ جان پاتی۔ اس وقت مجھے اس کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ اس کے دفتر کے ڈرائیور کو معلوم تھا۔ میں نے ترجمانی کی۔ وہ رسوم اور آداب کے بارے میں سوال کرتا رہا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ڈرائیور بھی آرمینیائی تھا اور ہمارے رسم و رواج سے ناواقف۔ لیکن وہ جا کر مسلر آباد کے ایک دربان کو بلا لایا جو سب کچھ بتاتا گیا اور میں ترجمہ کرتی گئی۔ مجھے اس وقت ذرا اندازہ نہ تھا کہ اس سوال جواب سے اس کی غرض کیا ہے۔ لیکن مجھے یاد ہے دادی جان نے اس واقعے کو بھی اعتراض کا بہانہ بنایا تھا۔ کہ اس کا کیا مطلب ہوا؟ ایک بے نمازی شخص آ کر لڑکی کا رشتہ مانگتا ہے اور پھر اسے ساتھ لے کر مسگر آباد چلا جاتا ہے؟... مجھے یاد ہے اس دن میرے شوہر کے ساتھ ایک اور امریکی بھی تھا۔ جب میں دربان کی باتوں کا ترجمہ کر رہی تھی، میں نے سنا وہ میرے شوہر سے کہہ رہا تھا، دیکھا، یہ لوگ تابوت بھی استعمال نہیں کرتے، صرف کپڑے کا ایک بڑا سا پارچہ، جس پر کچھ زیادہ خرچ نہیں آتا۔... میں اسے پہچانتی تھی۔ ادارۂ منصوبہ بندی کا مشیر تھا۔ میرا خیال ہے انھوں نے آپس میں یہ بھی طے کیا کہ ادارۂ منصوبہ بندی سے اس بارے میں بات

کریں گے۔ اور میری سنیے کہ اس دن میری سمجھ میں کوئی بات ہی نہ آئی۔ اس دن جب اسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ تابوت استعمال نہیں کرتے تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ہاں لوگوں کو دولھا اور دلہن کی طرح سجا سنوار کر تابوت میں لٹایا جاتا ہے۔ اگر کوئی بوڑھا شخص ہو تو اس کے منھ میں روئی بھری جاتی ہے اور بالوں میں گھونگھر ڈالے جاتے ہیں، اور اس پر بہت خرچ آتا ہے۔ اس روز رات کے کھانے پر میں نے دادی جان سے ان باتوں کا ذکر کر دیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ اور لگیں بنکارنے۔ پھر جب شادی کا وقت آیا تو مشہد چلی گئیں۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے، مجھے کسی بات کا احساس ہوا ہو گا؟ آپ ہی بتایئے۔ ایک بیس سالہ لڑکی، جس کا ہاتھ اس کے خواستگار کے ہاتھ میں ہو، اور وہ بھی امریکی، اور خوش شکل، مالدار اور معزز۔ اس کے پاس شک کی کون سی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ اور مجھے مسگر آباد کے معاملوں سے بھلا کیا لینا دینا؟ یہ تو بہت دنوں بعد میں نے دادی جان کی طرح ان باتوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ جب میں واشنگٹن میں تھی کبھی کبھی وہ کام سے واپس گھر آ کر شکایت کرتا کہ کس طرح سیاہ فام لوگ ان کی روزی ہتھیاتے جا رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے پوچھا کہ کیا کالوں کو جج کا عہدہ بھی دیا جاتا ہے۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ وہ وکیل ہے اور اس کا تعلق عدالت وغیرہ ہی سے ہے۔

... بہرحال، اس دن جب وہ گھر لوٹا تو میں نے وسکی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا اور ایک گلاس خود اپنے لیے بنا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور اس معاملے پر بات شروع کی۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا اور سب لوگوں کے مشوروں پر بھی غور کر چکی تھی۔ میری ایک ایرانی دوست نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ یہ سب اسی طرح کے کام کرتے ہیں۔ انسانیت کے خلاف! میں نے اسے ٹوکا کہ یہ کیا نعرے لگانے کا موقع ہے۔ مگر میں جانتی تھی کہ اسے ان لوگوں سے شکایت ہے۔ اس کا پاسپورٹ منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اب وہ نہ واپس جا سکتی تھی اور نہ یہاں رہ سکتی تھی۔ اب وہ یہاں کی شہریت چھوڑ کر مصر کی شہریت لینے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن اس سے یہ پوچھنے کا موقع نہ تھا کہ اگر ایسی بات ہے تو وہ امریکہ میں کیوں رہ رہی ہے۔ ایک اور دوست تھا، جوان اور خوب صورت، جس کے بارے میں میں اکثر آرزو کرتی کہ کاش میں اس کی بیوی ہوتی، پتا ہے اس نے کیا جواب دیا؟ کہنے لگا، ارے بابا، میرا خیال ہے تم پر امریکی مسرتوں نے غلبہ پا لیا ہے۔ بالکل یہی بات! اور آپ کو پتا ہے خود کیا کرتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ دو امریکی عورتیں اس کا خرچ اٹھاتی تھیں۔ یہ مت سمجھیے گا کہ میں نشے میں ہوں یا

Scanned with CamScanner

یونہی گپ مار رہی ہوں۔ ان میں سے ایک عورت پڑھاتی تھی اور دوسری ایر ہوسٹس تھی۔ دونوں کے پاس اپنا اپنا گھر تھا۔ اور وہ شخص تین دن ایک کے گھر میں اور چار دن دوسری کے گھر میں رہا کرتا۔ شاہی کر رہا تھا! نہ پڑھتا تھا نہ کوئی کام کاج کرتا تھا۔ نہ کہیں سے اس کے پاس پیسے آتے تھے۔ بالکل خلیج کے شیخوں کی طرح۔ ایرانیوں کو اصرار کر کے اس گھر میں لے جاتا جہاں رہ رہا ہوتا، تاکہ انھیں اپنی زندگی کا نظارہ کرا سکے، اور اسے اس میں کوئی عیب دکھائی نہ دیتا۔۔۔ خیر، تو اس طرح ہوا کہ تیئیس سال کی عمر میں مجھے اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر واپس آنا پڑا۔ لیکن اس ایرانی کے باپ کی خدا مغفرت کرے۔ میں نے اس سے بات کر کے فون رکھا، اور تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی۔ پتا چلا کہ ایک اور جوان ایرانی شخص ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ اس کا دوست تھا۔ وہ قانون کا طالب علم تھا اور اسے معلوم ہوا تھا کہ میں کسی مسئلے میں گرفتار ہوں۔ اس نے میری ہر ممکن مدد کرنے کی پیشکش کی۔ میں نے کہا، ہاں، تو وہ مجھ سے ملنے آ گیا۔ ہم نے آدھ گھنٹہ بیٹھ کر معاملے پر تفصیل سے بات کی اور میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس لیے جب میرا شوہر اُس دن کام سے واپس آیا تو میں سکون سے تھی اور جانتی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں رات دس بجے تک بیٹھی اس سے بات کرتی اور وسکی پیتی رہی اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ اب میں امریکہ میں رہنے کو تیار نہیں ہوں۔ اس نے ہزار پوچھا کہ مجھے یہ سب کہاں سے معلوم ہوا، میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کے والدین یا بہن بھائیوں کا کیا دھرا ہے۔ میں نے نہ ہاں کہا نہ نہ۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ چلو آج کہیں گھومنے چلتے ہیں، سینما یا کلب میں وقت گزارتے ہیں، اور اس مسئلے پر کل بات کریں گے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ جب میں وہ سب کہہ چکی جو مجھے کہنا تھا تو میں کمرے میں اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی، اندر سے دروازہ بند کر لیا اور پاگل سی ہو کر گر پڑی۔ مجھے سخت نشہ چڑھ چکا تھا۔ بالکل جیسے اِس وقت۔ صبح اٹھ کر عدالت گئی۔ مزے کی بات یہ کہ جج بولا، یہ بھی تو اور پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے۔ اس پر طلاق نہیں ہو سکتی۔۔۔ میں نے اس سے کہا، جج صاحب، اگر آپ کی بیٹی ہو تو کیا آپ اس کا ہاتھ ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیں گے؟ وہ بولا، مجھے افسوس ہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں۔ میں نے پوچھا، اور بہو؟ کہنے لگا، ہاں، بہو تو ہے۔ میں نے کہا، اگر کل کو وہ آپ کے پاس آئے اور کہے کہ اس کا شوہر جس نے خود کو استاد ظاہر کیا تھا، اس پیشے سے تعلق رکھتا ہے، اور اس نے جھوٹ بولا تھا، تب؟ ۔۔۔ میرا شوہر بیچ بیچ میں میری بات کاٹتا رہا۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جھوٹ بولنے کی بات سامنے

آئے۔ چنانچہ وہ جلدی سے راضی ہو گیا۔ اس نے بچی کا خرچ اٹھانے کے کاغذ پر دستخط کر دیے، اور مجھے واپسی کا کرایہ بھی اس سے اسی وقت دلوا دیا گیا۔ تو اس طرح۔ یہ تھا قصہ میرے امریکی شوہر کا۔ وسکی کا ایک گلاس اور دیجیے۔ شکریہ۔ آپ کے مہمان جو آنے والے تھے کہاں رہ گئے؟... لیکن... اے دلِ غافل... کبھی سوچتی ہوں کہ کہیں اس لڑکی نے مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا؟ اس کی گرل فرینڈ کو کہہ رہی ہوں۔ ہاں؟...

❊❊

(فارسی عنوان: ''شوہرِ امریکائی'')

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

بے وقت افطار

آمیز رضا اپنے نچلے بدن پر پرانا کمبل اوڑھے، ہاتھ میں جھلنے والا پنکھا لیے، چھت پر بچھے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

گرم ہوا جو شہر کے اس جنوبی حصے کی دھوپ کھائی ہوئی کچی اینٹوں کی چھتوں کے اوپر چل رہی تھی، شہر کی بھیڑ بھری سڑکوں کے شور و غل، کسی بس کے ہارن کی لمبی چیخ یا کسی خوشحال گھر میں بجتے ریڈیو کی دور دست اور خوابناک آواز کو اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ یہ ہوا اس کی پسینے سے تر قمیص کو چھو رہی تھی لیکن اترتی شام کی سخت گرمی کو کم کرنے کے لیے کافی نہ تھی، اور اسے، جو قمیص اوپر کیے دستی پنکھا جھلنے میں مصروف تھا، کسی طرح ٹھنڈک نہ پہنچا رہی تھی۔

گرد و غبار جو معمول کے مطابق مغرب کے قریب تہران کے آسمان کو ڈھانپ لیتا ہے، اب تک جنوب شہر کے اس خاک آلود محلے میں تیرتا پھر رہا تھا، اور ایک کھمبے پر لگے ٹمٹماتا بلب اور کھمبے کے تار دھندلی، نیم تاریک ہوا میں سے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اگر ریڈیو کے آڑے ترچھے ایریل یا مچھردانیوں کے بانس نہ ہوتے تو ہر شے ان کچی اینٹوں سے ڈھکی ہوئی معلوم ہوتی۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی خاک رنگ چھتیں اور ان کی چھوٹی بڑی بنّیاں دکھائی دیتی تھیں اور کہیں کہیں کوئی اونچا سا بھدا بادگیر، تہہ خانے کی گھٹی ہوئی سیلن زدہ ہوا کو محلے کے تنگ آسمان تک پہنچاتا ہوا، چاند کی پھیکی روشنی میں دکھائی دے جاتا۔

Scanned with CamScanner

چھت کی اونچی نیچی منڈیروں میں سے اردگرد ہونے والی ہر چیز آدمی کو کم یا بیش دکھائی دے سکتی تھی۔ گلی کے کھمبے میں لگے بلب اور شروع مہینے کے بے نور چاند کی روشنی میں ہمسائے کے گھر کی چھت پر تازہ بچھائے ہوئے بستر نظر آ رہے تھے، اور ان کے نیچے بچھی ہوئی چٹائیاں اور پرانے لحاف گدوں کی مسکی ہوئی جگہوں میں سے جھانکتی روئی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

چھتیں اب تک خالی تھیں۔ لوگ رات کے لیے اپنے بستر وہاں بچھا کر اس وقت تک کے لیے لوٹ گئے تھے جب جلتے ہوئے سورج کی تپش چھتوں سے چلی جائے اور وہ اپنے تھکے ہوئے سروں اور خستہ حال جسموں کو رات بھر کی نیند کے لیے ان بستروں پر پھیلا سکیں اور دم بھر کو آرام پا سکیں۔

شہر کے شمالی حصے کا شوروشغب اب تک نہ تھما تھا، نہ گاڑیوں کے ہارنوں کی کرخت آوازیں کم ہوئی تھیں۔ دور کہیں دو اخبار فروشوں کی اونچی آوازیں، اس تمام شوروغل کے درمیان سے، اخبار کی خاص خاص خبروں کو جنوب شہر کے باشندوں تک پہنچا رہی تھیں، جو نہ تو پڑھنا جانتے تھے اور نہ اگر پڑھنا جانتے بھی ہوتے تو اخبار خریدنے کی سکت رکھتے تھے۔

گلیوں میں بھیک مانگنے والوں کی صدائیں رفتہ رفتہ خاموش پڑتی جا رہی تھیں۔ یہ لوگ، جو صبح سویرے راستے کے کنارے پر اپنی ہزار طرح کی بساطیں بچھا کر بیٹھ جاتے، اور ایک سے ایک بڑھ کر رقت انگیز طریقوں سے راہگیروں کے سامنے اپنی بدبختی اور مفلسی کے اسباب کی نمائش کیا کرتے تھے، اب گلیوں میں اترتے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنے معرکے کے میدان سے ایک ایک کر کے کھسکتے اور پیچھے کی تنگ گلیوں کے الجھاوے میں گم ہوتے جا رہے تھے اور اپنی بے سود آہ و بکا اور رائیگاں دعاؤں کو بھی اپنے پیچھے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔

ماہ مبارک کی ساتویں شب تھی۔ آمیز رضا، جس نے افطار کے وقت پیٹ بھر کر تربوز کھایا تھا اور برف کے پانی کے گلاس پر گلاس پیے تھے، دوسرے لوگوں سے پہلے ہی چھت پر چلا آیا تھا اور چاند کی پھیکی روشنی میں بستر پر دراز ہو کر اپنے پھولے ہوئے پیٹ کو ہوا جھل رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پورے مہینے وہ کس طرح روزے رکھ سکے گا۔ ابھی پہلے چھ روزے ہی گزرے تھے اور وہ جس نے احتیاطاً ایک روز پہلے ہی سے روزے رکھنے شروع کر دیے تھے، ساتویں روزے پر اپنا دم نکلتا محسوس کر رہا تھا۔

بھوک کی اس کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن پیاس... الامان! وہ جو محض، ایک خردہ

Scanned with CamScanner

فروش دلال تھا، اور جسے ان لمبے دنوں کی تیز دھوپ میں صبح سے شام تک اِدھر سے اُدھر آنا جانا پڑتا تھا، کس طرح اپنی پیاس کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔

وہ بازار کے ان خوشحال دلالوں میں سے نہ تھا جو گرم بازاری میں اتنا کما لیتے ہیں کہ ان کے لیے سال بھر کو کافی ہو، جو جامع مسجد کے چالیس ستونوں والے خنک ہال کے ایک کونے میں صبح دس بجے سے سہ پہر تین بجے تک نماز اور دعا میں مشغول رہ سکتے ہیں اور وہاں سے نکل کر سیدھے اپنے گھروں کے ٹھنڈے تہہ خانے میں جا پہنچتے ہیں اور افطار سے پہلے وہاں سے باہر نہیں نکلتے۔ اور نہ وہ کوئی ایسا معتبر، صاحبِ دفتر تاجر تھا جو دوپہر سے کچھ پہلے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بازار پہنچے کہ اپنے کاروبار کا جائزہ لے سکے اور پھر شمیران کے مالدار محلے کو لوٹ کر اپنے باغیچے کے گوشے میں گدے دار آرام کرسی پر دراز ہو جائے جبکہ اس کی تازہ بیاہ کر لائی ہوئی دلہن اس کے پہلو میں ہو۔ اور وہ خدا کو بھولے ہوئے ان بے دین لوگوں میں سے بھی نہ تھا کہ کسی نہ کسی بہانے سے اس مبارک مہینے کے روزوں سے دور رہتے تھے۔

آمیز رضا ایک بے مایہ مگر خدا ترس دلال تھا اور ہرگز اس پر تیار نہ تھا کہ پچھلے چند برسوں کے اپنے ہمکاروں کی طرح غلط سلط طریقوں سے اپنی آمدنی بڑھائے۔ وہ اب تک اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اسی دوڑ بھاگ پر مجبور تھا۔

اب تک اس کی ایک بیٹی کی شادی ہوئی تھی اور چوتھا بیٹا جو ابھی پانچ مہینے کا ہوا تھا، دودھ کی کمی اور سخت گرمی کے باعث رو رو کر اس کے اور اس کی بیوی کے لیے دن کے اجالے کو اندھیری رات کیے دیتا تھا۔ خاص طور پر ماہِ مبارک کے ان دنوں میں، جب اس کی بیوی روزہ چھوڑنے پر تیار نہ تھی، بچہ مسلسل رویا کرتا یہاں تک کہ متواتر چیخ پکار سے اِس کے فوطے پھول گئے اور اس کے ماں باپ کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔

آمیز رضا دن بھر میں چار بوری شکر یا دو تھیلے ہلدی کے سودے پر بھی مطمئن ہو جاتا اور اس سے زیادہ کے لیے دوڑ دھوپ نہ کرتا، کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر اس سے زیادہ کی ہوس کی تو سوائے جوتے گھسانے کے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسے گویا معلوم تھا کہ روزِ ازل سے اس کی قسمت میں اس سے بھی کم روزی لکھ دی گئی تھی۔ جب کبھی اس کی آمدنی اس سطح سے بڑھ جاتی یا مہینے میں ایک آدھ سودا زیادہ ہو جاتا تو وہ بوکھلا جاتا اور اسے یقین ہو جاتا کہ وہ کسی اور کی روزی چھین رہا ہے، اور اس خیال سے کہ

Scanned with CamScanner

دوسروں سے چھینا ہوا نوالہ کہیں اس کے حلق میں اٹک نہ جائے، جاڑوں میں قم جا کر چند دن زیارت میں مصروف رہتا اور اگر آج کل کی طرح گرمیاں ہوتیں تو بیوی بچوں کو ساتھ لے کر امامزادہ داؤد کے مزار کی زیارت کے لیے کچھ روز فرح زادیا اوین کے مقام پر گزارتا۔

ابھی تک کربلا یا مکہ جانے کی آرزو تک نے اس کے ذہن میں سر نہ اٹھایا تھا اور جب کبھی وہ مسجد میں یا اور جگہوں پر لوگوں کو نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتے دیکھتا کہ خدا ان کی آرزو پوری کر دے، تو اپنے خیالوں میں ڈوب جاتا۔ اپنی دعا یا آیت کو بھول کر وہ ٹکٹکی باندھ کر اپنی سجدہ گاہ کو تکنے لگتا اور مسحور سا ہو جاتا۔ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ایسے وقت میں کون سے خیالات اس کے ذہن سے گزرتے تھے۔ لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ ایسی دور دراز کی آرزو کا اس کے ذہن میں کبھی گزر نہیں ہوا تھا اور اس نے اس کے لیے کبھی چھوٹی سی دعا تک نہ کی تھی۔

اپنی واجبی حرف شناسی کی بدولت، جب کبھی اس کا بڑا بیٹا اخبار گھر میں لے آتا تو وہ اخبار کا نام اور سرخیاں پڑھ سکتا تھا لیکن سمجھ کچھ نہ پاتا، اور بیٹے سے اس کی تشریح کرنے کو کہتا۔

ایک بات پر اس کا دل بہت جلتا تھا، وہ یہ کہ اس کا بیٹا، جس نے پارسال چھٹی جماعت پاس کی تھی، قرآن پڑھنے سے نابلد تھا، اور اس سے بھی بدتر یہ کہ جب کبھی وہ یہ شکایت لے کر اس کے اسکول گیا تو اسے یہ ڈھٹائی بھرا جواب ملا: ”... ارے صاحب، اس پر کیوں اصرار کرتے ہیں! آخر آگے چل کر اس کا بچے کو کیا فائدہ ہوگا؟ اور آج کل کون ان چیزوں کی پروا کرتا ہے!...“ لیکن وہ اس مبہم جواب سے مطمئن نہ ہوتا اور اس بے دین پرور نظام پر لعنت بھیجا کرتا، مگر چونکہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا، اپنی یہ کوفت وہ اپنی بیوی پر اتارتا اور تمام قصور اسی کے سر منڈھتا۔

دن بھر تہران کی سڑکوں پر دوڑتے بھاگتے اسے یہ سوچنے کی مہلت نہ ملتی کہ لوگ پچھلے برسوں کی بہ نسبت اس قدر بے دین کیوں ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات برداشت نہ کر سکتا تھا کہ کوئی بے دین شخص سر بازار کچھ کھا رہا ہو یا سگریٹ پی رہا ہو اور وہ خاموش رہے۔

گلی میں چلتے اور زیر لب دعا پڑھتے ہوئے وہ سوچا کرتا: خدا کی پناہ! امسال مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جو ان بے دینوں میں سے نہ ہو۔ شاید یہ لوگ اس مبارک مہینے سے اپنی عداوت ظاہر کرنے کے لیے جان بوجھ کر گلیوں میں سگریٹ پھونکا کرتے ہیں۔ یا نہیں، صرف اس کو اشتعال

Scanned with CamScanner

دلانے کے لیے یہ دکھاوا کرتے ہیں۔

اسے باور نہ آتا تھا کہ بے دینی اس قدر بڑھ گئی ہے اور لوگ اتنے بے پروا، بے شرم اور خوفِ خدا و بندگانِ خدا سے اتنے بے نیاز ہو گئے ہیں کہ سرِ عام اسے جتاتے پھرتے ہیں۔ اب تک کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ وہ ان لندھوروں سے الجھ پڑا اور انھیں وہ تمام آبدار اور ناتراشیدہ گالیاں سنا ڈالیں جو اس کی روزہ دار زبان سے ادا ہو سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک بار تو اسے اس کا پانچ تومان اور دس ریال جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا، اور اگر تھانے دار، خدا ... کے باپ کی مغفرت کرے، مسلمان آدمی نہ ہوتا اور انھی لاابالی لوگوں کی قماش کا ہوتا تو یقیناً اس سے کہیں زیادہ جرمانہ وصول کرتا۔ بلکہ اس بھک منگے کو ہرجانہ دینے کا بھی مطالبہ کرتا اور کچھ دن کے لیے حوالات میں بھی ڈال دیتا۔

اس واقعے کا، جو ماہِ مبارک کی دوسری تاریخ کو پیش آیا تھا، اس نے اپنی بیوی سے بالکل ذکر نہ کیا تھا، اور کوئی اور شخص بھی نہ جانتا تھا کہ کس طرح اس نے سڑک کے کنارے بیٹھ کر چلم پیتے ہوئے اس بھک منگے کے منھ پر طمانچہ مارا تھا اور اس کی ناک کو خونم خون کر دیا تھا۔

وہ بھک منگا بھی غالباً اپنا سبق خوب یاد کیے ہوے تھا۔ اس نے ایسی چیخ پکار مچائی اور اس شہر میں اپنے نووارد اجنبی ہونے کی ایسی دہائی دی کہ لوگ جمع ہو گئے اور اسے ملامت کرنے لگے کہ ''صاحب، تمھیں کیا پتا، شاید یہ بیمار ہو۔ ایسی بات خدا کو پسند نہیں آئے گی۔'' اور آمیز رضا نے، جس کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور چہرہ شعلے کی طرح سرخ ہو رہا تھا، چیخ کر ان لوگوں کو جواب دیا تھا: ''اس حرامزادے کی گردن ٹوٹے! یہ کسی کونے کھدرے میں جا کر زہر مار کیوں نہیں کرتا! سرِ بازار چلم پینا، یہ تو خدا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے!'' اس کے بعد کہیں سے سپاہی نمودار ہو گیا اور ان دونوں کو تھانے لے گیا۔ لیکن پھر بھی شکر کا مقام ہے کہ جرمانہ زیادہ نہیں ہوا۔ اس کے باوجود، سچ یہ ہے کہ دل کی تہہ میں وہ خوش تھا کہ اس نے نہی عن المنکر کا فرض نبھا دیا۔

آمیز رضا پر اس قدر تھکن طاری تھی کہ اسے سونا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اب تک خود کو پنکھا جھل رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسی حالت میں، اور تربوز اور پانی کے گلاسوں سے افطار کرنے کے نتیجے میں پھولے ہوے پیٹ کے ساتھ وہ کیونکر برکت بھری راتوں میں شب زندہ داری کر سکے گا، اور کس طرح کل صبح منھ اندھیرے اٹھ کر مسجد جا سکے گا۔

Scanned with CamScanner

ان چھ دنوں میں وہ خود کو ہر شام بڑی دقت سے چھت تک پہنچاتا رہا تھا۔ پھر مسجد تک جانا، چھ شبانہ روز قضا نماز پڑھنا، صبح تک جاگنا، ہر رات کم سے کم تین مرتبہ دعائے کمیل اور سمات اور جوشن کبیر ختم کرنا، اور آخر قرآن سر پر رکھ کر بلند آواز سے یا اللہ والغوث پڑھنا... سچ مچ وہ ایک طرح کی بند گلی میں پھنس گیا تھا۔

روزہ خوری تو وہ ہرگز نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اگر روزہ رکھنے کے بعد ہر شام اس کی یہی حالت ہو اور وہ اسی طرح بستر پر لاش کی طرح پڑ جایا کرے تب بھی ان برکت بھری راتوں کے فرائض کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا: سال میں یہی دو تین راتیں ہوتی ہیں جن میں سب کچھ پیش آتا ہے — عفو ورحمت، تقسیم روزی، تعین تقدیر، سب کچھ انھی راتوں میں پیشانی سے لوح محفوظ پر منتقل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ان بابرکت راتوں میں اپنے گناہوں کی تلافی نہ کرسکا، اور شاید اس پر کوئی افتاد آپڑے اور وہ مر جائے، اگلا رمضان دیکھ ہی نہ سکے، تو اپنے سر پر کیسی کیسی خاک ڈالے گا۔

آمیز رضا یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اسے نیند نے آلیا۔

•

سہ پہر دو بجے کا وقت تھا۔ سڑکوں پر دکانیں سب بند تھیں اور ان کے مالک یا تو دکانوں کے بند دروازوں کے پیچھے چھپ کر کھانا کھا رہے تھے یا اگر مومن تھے تو وعظ سننے مسجد گئے ہوئے تھے۔

بازار سنسان تھا۔ لوگ جنھیں کوئی کام نہ تھا، تیز دھوپ سے نڈھال ہو کر بازار کے گنبدوں اور محرابوں کے سائے میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ دکاندار مکھیاں اڑا رہے تھے اور کارندوں اور منشیوں کو چھٹی مل گئی تھی کہ حال میں پائی ہوئی بخشش یا مالک سے چوری چھپے بیچے ہوئے مال کے بارے میں بات چیت کریں اور آپس میں صلاح مشورے کریں۔

آمیز رضا، جس کا دن بھر کی دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی سودا نہ پٹا تھا، اور جس کی دو تھیلے ہلدی مسالہ فروش نے اس سے وعدہ کرنے کے باوجود اس سے ایک شاہی فی تومان کم پر کسی اور کو بیچ دی تھی، افسردہ اور نڈھال جامع مسجد سے باہر نکلا۔

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسی حالت میں وہ باجماعت نماز کیونکر ادا کرے۔ قرآن کی جو

Scanned with CamScanner

سورت اسے پڑھنی تھی اس نے نہ پڑھی اور واعظ کا بھی انتظار نہ کیا جسے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جانماز سمیٹ لی اور اپنے چپل مسجد کے ستون کے پاس سے اٹھا کر بغل میں داب لیے، اور تسبیح ہاتھ میں تھامے، کہ نماز کے بعد کی دعا راستے میں پڑھ سکے، مسجد سے باہر نکل آیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ اس صبح اس نے کتنی مسافت طے کی۔ جو بھی ہو، اس کی زبان ماچس کی تیلی کی طرح سوکھ گئی تھی اور پیاس کے مارے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اس نے کربلا کے صحرا اور فرزندانِ زہرا کی تشنگی کو یاد کرنے کی کتنی ہی کوشش کی، اس کی پیاس رفع نہ ہوئی۔ جیب میں رکھے پیتل کے جام کو مسجد کے تالاب کے پانی سے بھر کر سر اور منھ پر ڈالتا رہا، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ پاگل سا ہوا جا رہا تھا۔

مسجد کے دروازے سے باہر آیا۔ لیکن کہاں جائے؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ ہر روز کے مقابلے میں زیادہ دیر تک بازار میں رہا تھا اور اب اس نے خود کو سڑک کے بیچ سہ پہر کے وقت سخت دھوپ میں پایا۔ وہ کسی ارادے کے بغیر چل رہا تھا، لیکن کدھر؟... شاید اپنے دماغ کی تہہ میں وہ جانتا تھا کہ کدھر جا رہا ہے لیکن اسے اپنے تخیل پر آشکار اور بے پردہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس کوشش میں تھا کہ اس کے روبرو نہ ہونا پڑے۔

رات کی ٹوپی اس نے جیب سے نکال کر سر پر اوڑھ لی۔ تسبیح، جس پر ذکر پڑھنا اب تک اس کے ذہن سے فراموش رہا تھا، جیب میں ڈال لی اور قدم تیز کر دیے۔ دو نمبر کی بس میں سوار ہوا اور سیدھا قزوین کے بس اڈے پر جا اترا۔

اسے کچھ ٹھیک سے یاد نہ تھا کہ کسی گاڑی یا بس میں سوار ہوا تھا، لیکن آخر بچہ تہران کا تھا اور اس کے کونوں کھدروں سے اچھی طرح واقف۔ اور پھر پیاس کی شدت اسے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔

کرج کو جانے والی بس بھر چکی تھی اور روانہ ہونے ہی کو تھی کہ آمیز رضا نے اسے جا لیا۔ وہ سیدھے ہاتھ پر مسافروں کے درمیان جا بیٹھا۔ بس بہت تیز چل رہی تھی۔ راستے میں نہ اس کا ٹائر پنکچر ہوا نہ اس میں پانی ڈالنے کی ضرورت پڑی۔ لیکن کوئی نہ جان سکا کہ آمیز رضا نے یہ مدت کس طرح بسر کی۔ صرف ڈرائیور کا شاگرد کرایہ جمع کرتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو اسے سویا ہوا پایا اور اس کا دل نہ ہوا کہ جگا دے۔ اس نے سوچا کہ اترتے وقت کرایہ وصول کر لے گا۔ اس رات، افطار کے بعد، جب وہ اس دن کے واقعات اپنی بیوی کو سنا رہا تھا، اور سونے کے بعد ہونے والے معاملے کی تفصیل بیان کر رہا تھا،

Scanned with CamScanner

تب بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بس میں بیٹھ کر کس طرح کرج جا پہنچا، اور آیا وہ سو رہا تھا کہ اپنے حال سے بے خبر ہو چکا تھا۔

بس روانہ ہونے کے گھنٹے بھر کے اندر کرج جا پہنچی۔ سب مسافر اتر کر اپنے اپنے کاموں کی سمت چل پڑے۔ آمیز رضا، جو اس تمام مملکت میں شاہ عبدالعظیم اور شمیران کے سوا کسی مقام سے واقف نہ تھا، پوچھتا پاچھتا کسی طرح ایک قہوہ خانے تک پہنچا۔ اس نے قہوہ خانے کے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ایک دو گھنٹے بعد جب اسے کرج لانے والی بس کے تہران واپس جانے کا وقت ہوا وہ اس میں سوار ہو کر افطار کے وقت تہران واپس پہنچ گیا۔

افطار کے وقت نہ اس نے تربوز کھایا اور نہ برف کے پانی کی طرف کچھ رغبت دکھائی۔ اس نے صرف چند لقمے نان کے شامی کوفتوں کے ساتھ کھائے اور اس پر چائے کے دو تین پیالے پیے۔ اس کی بیوی، جو کہیں زیادہ ہوشیار تھی، فوراً تاڑ گئی کہ کچھ بات ضرور ہے۔ اس نے بھی خود میں بات چھپانے کا بوتا نہ پا کر سب کچھ کہہ سنایا۔

اس کا بیٹا یہ بات سن کر بے اختیار ہنس پڑا، لیکن پھر ماں کی جھڑکی سن کر بسورتا ہوا ایک کونے میں جا بیٹھا۔ موضوع چنداں بحث کے قابل نہ تھا۔ لیکن اس کی بیوی، جو خدا جانے مسجد میں کسی سے جانماز پر جھگڑا ہونے پر چڑی ہوئی تھی یا اس روز بھوک جھیلنے سے بے حال ہو رہی تھی، معاملے کو یوں جانے دینے پر تیار نہ ہوئی۔ اس نے اپنا منھ کھولا اور ملامت اور کوسنوں کا ایک سیلاب امڈ آیا:

"واہ! احمق گدھے! میں تو جیسے آدمی کا بچہ ہوں نہیں جو دن بھر شیر خوار بچے کے ساتھ اپنا جگر نوچا کروں، جیسے پیٹ میں کسی نے چاقو گھونپ دیا ہو۔ شرم نہیں آتی کہ کرج آنے جانے میں چار تومان خرچ کر ڈالے اور وہاں چائے کے پیالے سے روزہ توڑ ڈالا؟ اور وہ بھی سہ پہر کے وقت؟ اور اس پر خدا سے رحم کی بھی امید رکھتے ہو؟ اگر مرد نہیں ہو تو روزہ رکھنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ کسی نے تمھیں مجبور کیا تھا؟ یہ نہ ہوا کہ ان چار تومان کے انگور خرید لاتے کہ میں اور تمھاری اولادیں افطار کے وقت زہر مار کر لیتیں!"

آمیز رضا جو جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا تھا، ڈرتا تھا کہ چیخ پکار سن کر ہمسائے اپنی چھتوں کی منڈیروں

Scanned with CamScanner

پر آ کر تماشا دیکھنے لگیں گے اور پوری بات جان جائیں گے، دبی ہوئی آواز میں اپنی بیوی کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''بڑھیا، اب بس کر! خدا ناراض ہوگا۔ چھتوں پر سب لوگ سن رہے ہیں۔ عورت! آخر سوچ کہ تو کیا کہہ رہی ہے! مجھے اپنے فرائض تجھ سے اچھی طرح معلوم ہیں۔ میں نے آقا سے مسئلہ پوچھ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی اشکال نہیں۔ تو پھر تو کیوں ضد پر اڑی ہوئی ہے...''

جب اس کی بیوی کو پتا چلا کہ اس نے آقا سے مسئلہ بھی دریافت کر لیا ہے تو بے اختیار ہنسنے لگی۔ اپنا غصہ بھول کر ہنسی روکتے ہوئے مذاق کے انداز میں کہنے لگی، ''واہ! تمھارے سر میں خاک! تم اور تمھارا آقا! شرم تو نہیں آتی۔ واجبات تک کے مسئلوں سے واقف نہیں!''

آمیز رضا اس آخری بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے عورت کو خاموش کرایا اور اس تمام جھگڑے کو جلدی سے نمٹانے کی کوشش میں اپنا دستی پنکھا لے کر چھت پر چلا آیا۔

شیر خوار بچہ متواتر چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ گرم ہوا جواب تک چل رہی تھی، کہیں دور سے عزاداری کی آوازیں اپنے ساتھ لا رہی تھی، شہر کے کسی کونے سے آتی ہوئی 'یا حسین!' اور 'یا ابوالفضل!' کی صدائیں اور سینہ زنی کی ہم آہنگ گونج شہر کے اوپر ہر طرف پھیل رہی تھی۔ ہمسایوں کی چھت پر دھویں سے اٹی لالٹین کی کمزور روشنی میں کچھ لوگ حلقہ بنا کر کسی سے مثنوی سننے میں ہمہ تن گوش تھے۔

آٹھویں تاریخ کا چاند آسمان کے ایک کونے میں دبکا ہوا تھا اور افسردہ اور غمگین قیافے کے ساتھ اس پوری بساط کو حسرت سے تک رہا تھا۔ ستارے کچھ تو اس تمام بے عقلی اور مفلسی کو تکتے رہنے سے اپنی تاب و تواں گنوا کر ناگہاں موت کا شکار ہو گئے تھے اور آسمان میں اپنے مقام سے گر کر تاریکی اور وحشت کی دنیا میں گم ہو رہے تھے اور اپنے پیچھے اپنی زندگی کی آخری رمق کے طور پر روشنی کی ایک لکیر چھوڑتے جا رہے تھے، اور کچھ جو زیادہ دلیر اور قوی تھے وہ، سورج کو نگاہ جما کر دیکھنے والے لوگوں کی طرح، اس رنج و مذلت کی دنیا کو خیرہ ہو کر تک رہے تھے اور ان کی پلکیں نابینا ہو جانے کے خوف سے بار بار بند ہو رہی تھیں۔ یا... میں نہیں کہہ سکتا، شاید اس تمام بدبختی اور جہل کو دیکھ کر ہنس رہے ہوں، ایک دوسرے کو چشم و ابرو سے اشارے کر کر کے ہمارا مذاق اڑا رہے ہوں!

❋ ❋

(فارسی عنوان: ''افطار بیموقع'')

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

زیارت

تین بار میں قرآن اور پانی اور آٹا بھرے برتنوں کے نیچے سے گزرا، تیسری بار میں نے قرآن کو بوسہ دے کر پیشانی سے لگایا۔ اپنے اقربا کی پڑھ کر پھونکی ہوئی آیت الکرسی اور چہار قل کے اثر والی ہوا کے درمیان مجھے مسجد اور حرم کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی — بالکل حرم کی ہوا جس میں سے صرف موم جلنے اور موم بتیوں کی تیز بو غائب تھی۔ اور بہنوں اور چھوٹے بھائی کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے درمیان میں گھر کے دروازے سے باہر آیا۔ گلی کے نکڑ تک پہنچتے پہنچتے، آشنا یا اجنبی، محلے کا باسی یا کوئی اور، جس کسی سے میرا سامنا ہوا، یہ بھانپتے ہی کہ میں زیارت پر روانہ ہو رہا ہوں، ہر ایک نے تہِ دل سے مجھ سے دعا میں یاد رکھنے کی درخواست کی۔ مجھے مجبوراً ان تمام مومنین کو جواب دینا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ میں بھی محتاجِ دعا ہوں۔ ان میں سے بعض جن سے میری زیادہ واقفیت تھی، انھوں نے میرے کانوں میں اذانیں اور زادِ راہ کے طور پر مجرب آیتیں پڑھے بغیر مجھے آگے نہ بڑھنے دیا۔

کیا کیا جائے! اس آخری دم پر میں بندگانِ خدا کا دل کیسے توڑ سکتا تھا۔ میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا: اس کے علاوہ یہ خدا کو بھی خوش نہ آتا کہ میں دوسروں کے لیے رنج کا باعث بنوں۔ چنانچہ ہر ایک کی سورۂ یاسین کے لیے کان آگے بڑھانے کے سوا کیا چارہ تھا!

نکڑ تک پہنچتے پہنچتے نہ معلوم کتنے لوگوں نے میرے چہرے کو بوسہ دیا اور دعائیں پڑھیں، یا اس عمل میں کتنی دیر لگی۔ لیکن جو بھی ہو، جونہی میں نے گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے کے لیے پائیدان پر پیر رکھا، تو

Scanned with CamScanner

مجھے دو تین بوڑھی عورتوں کے سبکیاں لے لے کر رونے کی آواز سنائی دی جوان کی سیاہ عباؤں میں سے آرہی تھی جنھیں معلوم ہوتا تھا برسوں بقچے میں تہہ کر کے رکھنے کے بعد نکالا گیا ہے۔

اس روز تک مجھے یہ احساس نہ ہوا تھا کہ دوسرے لوگ بھی میری طرح کی آرزوئیں رکھتے ہیں اور میں نہیں جانتا تھا کہ جو سودائے عشق میرے سر میں ہے اسی مالیخولیا سے یہ سب لوگ بھی دوچار ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لوگ کس قدر حسرت رکھتے ہیں کہ کاش میری جگہ وہ ہوتے اور اس وقت ان مقدس مقامات کی زیارت پر روانہ ہو رہے ہوتے۔ اس روز، گھر سے نکلتے ہوئے، میں نے ایک شخص کے حلق سے نکلتی ہوئی مناجات سنی جسے اسی وقت معلوم ہوا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، "اللھم ارزقنا... زیارۃ ال..."

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھے خوش ہونا چاہیے یا غمگین۔ میری زندگی کی پتلی سی آبجو کے معمول کے بہاؤ میں اس زیارت سے ایک غیر معمولی موڑ واقع ہو رہا تھا۔ اور اس تبدیلی سے، خواہی نخواہی، میرے دماغ میں ایک غلغلہ اور ولولہ اٹھ رہا تھا جو میری خاموش، مخصوص رخ پر چلنے والی زندگی میں ایک سمجھ میں نہ آنے والا تلاطم سا برپا کر رہا تھا۔

راستے بھر میرے ذہن میں اس کے سوا کوئی خیال نہ تھا اور جب میں بس اڈے پر پہنچا اور وہ موقع آیا جب مجھے رسم کے مطابق لوگوں میں آقورہ بانٹنا تھا، تب بھی میرے دماغ سے اس سویوں والے آش کا خیال محو نہ ہوتا تھا جو میرے جانے کے بعد لوگوں کو کھلانے کے لیے تیار کیا جانے والا تھا۔ یہ باریک اور لمبی سویاں، بہن کاٹے گی اور پودینے کے قدرے لگے ہوئے کاسوں میں اس آش کو دور اور قریب کے عزیزوں کو بھیجا جائے گا۔ اور اس موقعے کی مناسبت سے میرے گھر میں جشن و سرور برپا ہوگا اور میرے خیریت سے لوٹنے کے لیے نذر بھی دی جائے گی۔

ہاں، ایران اور اس کی رسمیں: عید نوروز کی شب سبزی پلاؤ، س سے شروع ہونے والے ناموں والی سات غذائیں، شلہ زرد اور سمنو، سویوں کا پلاؤ، سویوں کا آش، اور ہزاروں دوسری رسمیں جو پہلی نظر میں بے معنی عادات اور خرافات معلوم ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت ایران کے مخصوص طرز زندگی کی پیداوار اور تابع ہیں۔

رُوبوسی اختتام کو پہنچی اور میری جیبیں بھی آقورہ بانٹنے سے خالی ہوگئیں، اور اگرچہ ہمیں مغرب

کے وقت روانہ ہونا تھا، اب رات کے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں وہیں کھڑے کھڑے رات کا کھانا کھا رہا تھا کہ الوداع کہنے والوں کے سلام وصلوات کے درمیان بس آ پہنچی اور پھر شہر کی اندھیری سنسان سڑکوں سے گزرتی ہوئی ہمیں دنیا کی مقدس ترین سرزمین کی طرف لے چلی۔

سڑک ہماری بس کے استقبال کے لیے تیزی سے آگے بڑھتی اور اس آتشیں رہوار کے آہنی بمپر کے پاس پہنچ کر گویا ہراساں ہو کر دو ٹکڑوں میں دائیں بائیں سرک جاتی، جیسے ہمیں گزرنے کا راستہ دے رہی ہو۔ بس کے پیچھے بھی سڑک تیزی سے دور بھاگتی دکھائی دیتی جیسے ہماری دلیری سے خوفزدہ ہو، گویا اسے معلوم ہو کہ ہم زائر ہیں۔

بس کے فرش میں میرے پیروں کے پاس ایک سوراخ میں سے نیچے سڑک پر بچھی باریک بجری دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بجری دو چوڑی، بے رنگ، متوازی پٹیوں کی شکل میں تھی اور ایسی تیزی سے متحرک تھی جیسے کمان سے چھوٹا ہوا تیر ہو۔ سڑک کے دونوں کناروں پر تمام چیزیں بہت تیز رفتاری سے ہم سے دور بھاگ رہی تھیں۔ یہ ٹھیک سے پتا نہ چلتا تھا کہ وہ ہم سے خوفزدہ ہیں یا ابھی تک ہمیں پہچان نہیں سکیں۔ مگر خیر، ہر چیز اور ہر شخص ہم سے گریزاں ہے تو ہوا کرے! ہم ایسی جگہ جا رہے تھے جہاں جانے کا سہانا خواب ہر کوئی تاریک راتوں کی نیند میں دیکھا کرتا ہے، جس کی حسرت میں لوگ آہیں بھرتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اگر ہر چیز ہم سے دور بھاگ رہی تھی تو وہ مقام جس کی ہمیں آرزو تھی اتنی ہی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شہرِ مقدس جہاں بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھلتا ہے، ہمیں اپنے متبرک دروازوں میں داخل کرنے والا تھا۔ وصالِ دوست کے لیے ہمیں ہر شے کا فراق منظور تھا۔ ہم نے اپنے ماں باپ اور عزیزوں کو منتظر چھوڑ کر کسی اور کی طرف جانے والی راہ اختیار کی تھی۔

اس راہ میں ہمیں کئی دن گزر گئے اور ابھی کئی اور دن ہمیں اس دشت اور صحرا کا مہمان رہنا تھا۔ شہر میں گزرنے والی یکساں زندگی کی جگہ صحرا کی یکساں زندگی نے لے لی تھی۔

راستے میں ہمیں ان چھوٹے چھوٹے قہوہ خانوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا جو بستیوں کے باہر ان کی نمائندگی کرنے کو موجود ہوتے ہیں اور انھی بستیوں کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور ان قہوہ خانوں میں ہمارا سامنا اس یکسانی کے سوا کسی شے سے نہ ہوا جو اس دشت کے، جسے ایران کہتے ہیں،

Scanned with CamScanner

ہر گوشے میں پائی جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے ایک بنچ، اس کے برابر میں قہوہ خانے کا دھویں سے سیاہ، تنگ دروازہ؛ اندر گنبد نما چھت کے نیچے لمبے چوڑے چبوترے۔ ان چبوتروں پر خاک آلود دریاں یا رشت کی بنی ہوئی دھان کی چٹائیاں بچھی ہوئیں، اور ان پر تمباکو اور افیون کے دھویں کے درمیان اپنے آپ میں گم بیٹھے ہوئے سوکھے، مڑے تڑے لوگ۔ کبھی کبھار کسی بستی کے اندر یا شہر کے قریب واقع کسی قہوہ خانے میں پچھلی دیوار کے پاس کونے میں رکھی شراب کی بوتلیں دکھائی دے جاتیں، اور اگر ہم وہاں رات دیر گئے پہنچے ہوتے تو نشے میں دھت، دھول میں اٹے اور دھوپ میں سنولائے ہوئے بس ڈرائیوروں کے مستانہ نعرے یا خراٹے ہمارا استقبال کرتے۔

ایک خاص ماحول میں بسر ہونے والی روزمرہ زندگی ہمیں اس ماحول کی تمام باریک تفصیلوں اور نشیب و فراز سے مانوس کر دیتی ہے، اور ہر روز دکھائی دینے والے لوگ بے اہمیت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن یہ اچانک مڈبھیڑ، اور یہ سرسری اور زود گزر جھلکیاں ایسے حقائق کو ہمارے سامنے روشن کر دیتی ہیں جن سے ہم اب تک ناواقف رہے تھے۔

ایک قہوہ خانے میں، جس کے مالک کے صاحبِ ایمان اور نیک دل ہونے کے بارے میں ڈرائیور نے ہم سب مسافروں کو اطمینان دلایا تھا، ہم سہ پہر کے وقت اترے۔ طے ہوا تھا کہ رات کا کھانا وہیں کھا کر آگے روانہ ہوں گے۔ ابھی سورج چمک رہا تھا اور قہوہ خانے میں، جس کا رخ مغرب کی سمت تھا، مسافروں اور گاہکوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے چٹائی کی چق سائبان کے طور پر تان دی گئی تھی۔ اس ہاتھ کے بنائے ہوئے سائبان کے نیچے کچھ لوگ، نمدے کی ٹوپیاں اوڑھے، گھٹنوں کو اوپر کیے اور ان کے گرد بازو لپیٹے بیٹھے تھے، اور دیہاتیوں کے برخلاف جو ہمیشہ اپنی گایوں اور گدھوں، اور مرگ و شادی، اور سوگ اور جشن کے بارے میں بتیاتے رہتے ہیں، یہ لوگ خاموش اور گوش برآواز تھے۔ ایک دیہی آخوند (ذاکر) جو ایامِ عزا کے نزدیک ہونے کی مناسبت سے شہر سے ابھی آیا تھا اور تازہ آواز میں قافلۂ اہلِ عبا کی روانگی کے موضوع پر ایک روضہ (مرثیہ) پڑھ رہا تھا۔ میں ایک گوشے میں چبوترے کے کونے پر بیٹھ کر روضہ سننے لگا۔ بڑھتی ہوئی گرمی کے باعث میری پیاس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سورج کی لال ٹکیہ جو رفتہ رفتہ آسمان میں نیچے کی طرف اترتی جاتی تھی، مجھے عزیزانِ زہرا کا خون آلود، رفتہ رفتہ سرنگوں ہوتا ہوا پرچم معلوم ہو رہی تھی...

Scanned with CamScanner

اپنے خیالوں میں گم ہو کر میں رفتہ رفتہ ایسی جگہ جا پہنچا جہاں مجھے آخوند کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔ میں زیارت پر جا رہا ہوں، وہ مزار و بارگاہ میری منتظر ہے، مجھے اس برکت کے لیے ڈرائیور کے شاگرد کو کچھ بخشش دینی چاہیے، حرم میں پہنچ کر مجھے کیا کیا روضے سننے کو ملیں گے، اور زیارت کی کون کون سی دعائیں پڑھوں گا، ضریح کے در و دیوار جنھیں چوموں گا، اور اس کی ٹھنڈی جالیوں میں منت کی جو کترنیں باندھوں گا، جہاں بوڑھی عورتوں کے ضریح کو بوسے دینے کی آوازوں میں کوئی دوسری آواز سنائی نہیں پڑے گی، اور بہت سی دوسری چیزوں کے خیالات تھے کہ آئے چلے جا رہے تھے۔

اچانک میرے ایک ہم سفر نے مجھے جگایا۔ رات ہو چکی تھی۔ کہنے لگا کہ آج عظما کے فیض سے برکت بھری رات ہے، اور مجھے اس سے بے خبر سوتے رہنے پر سرزنش کرنے لگا۔ ٹھیک کہتا تھا۔ اس ہفتے میں یہ پہلی رات تھی کہ میں نماز باجماعت میں شریک نہ ہوا۔ سب لوگ اس دیہاتی ملا کے پیچھے نماز پڑھ چکے تھے اور میں نے اپنی بس کے ڈرائیور کو دیکھا جو نماز سے فارغ ہو کر ملا سے مصافحہ کرتے ہوئے ''تقبل اللہ'' کہہ رہا تھا۔ میں اس فیض سے محروم رہ جانے پر پشیمان تھا۔ استغفار کیا اور بس کی طرف چل پڑا۔

بس تیز رفتار سے چل رہی تھی اور زائرین کے وجود اور صلوات کی برکت سے راستے بھر میں ایک بار بھی اس کا ٹائر پنکچر نہ ہوا تھا۔ پچھلے روز میرے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے حاجی آقا کی بیوی اپنے برابر بیٹھے شوہر سے کسی طویل گفتگو کے بیچ میں کہنے لگی، ''دیکھی خدا کی قدرت! اس مشین گاڑی کو بھی معلوم ہو گیا کہ ہم کس کی بارگاہ میں پابوسی کے لیے جا رہے ہیں۔''

میرے برابر کی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا جس نے بتایا کہ اس کی کریانے کی دکان ہے۔ بتانے لگا، ''دو سال پہلے تک قزوین کی کارواں سرائے میں ایک دکان دار کے پاس کام کرتا تھا اور پچیس قران مزدوری میں کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کے پانچ افراد کا پیٹ پالتا تھا۔ سچ کہتا ہوں کہ میرا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ ایک رات مسجد میں نماز کے بعد میں نے بہت گریہ کیا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات قنوت میں میں نے اتنی بار الغوث الغوث پڑھا اور اسے اتنا طول دیا کہ باقی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ میں اس قدر رویا کہ سچ مچ ہر شخص کا دل میرے حال پر مغموم ہو گیا۔ یقیناً اس رات خدا

Scanned with CamScanner

نے مجھ بد بخت کے حال پر رحم کیا اور پنجتن کی برکت سے مجھے نجات بخشی۔ خلاصہ یہ کہ میں نے خدا سے رو رو کر دعا کی کہ اس آخری عمر میں مجھے ذلت اور نوکری کی زندگی سے نجات دلائے اور میری اور میرے بال بچوں کی روزی کا کوئی اور حوالہ پیدا کر دے۔ کسی ایسی جگہ پہنچا دے جہاں سر چھپانے کا ٹھکانا میسر ہو اور اپنی چھوٹی موٹی دکانداری جس کی آمدنی میں گزر بسر ہونے کے بعد اتنا بچ رہے کہ کسی ضرورت مند مسلمان کو دو روٹی کھلا سکوں۔ اپنے آقا امام حسین کے تصدق اور آپ کے سر کے تصدق، پچھلے دو برس میں کسی نہ کسی طرح مجھے اس نوکری سے نجات مل گئی اور نمعلوم کتنے قرضوں قولوں کے بعد اسی کارواں سرائے قزوین میں میری اپنی چھوٹی سی دکانداری ہو گئی۔ کریانے کا معمولی سا کام، لیکن بہر حال میری اپنی دکان۔ اور خدا نے اس میں اتنی برکت دی کہ اس خراب شدہ بازار سے باہر نکل کر خیابان سیروس میں چھوٹی سی دکان کھول لی۔''

یہاں پہنچ کر وہ ذرا سا رکا، بس کے سامنے والے شیشے سے سڑک پر اس نقطے کو دیکھتے ہوئے جہاں دونوں کنارے ایک دوسرے سے مل رہے تھے، بلند آواز میں ''الحمدللہ'' پڑھی، گلاب پاش سے عرق ترش اپنے ہاتھوں پر چھڑکا اور مجھے بھی پیش کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی:

''خیر یہ حال اب گزر چکا ہے، لیکن ان دنوں میرے دل کو چین نہ آتا تھا۔ ہر رات مسجد میں نماز کے بعد پیش امام کہتا کہ دولت اکٹھا کرنا حرام ہے، حرام، اور جو لوگ داڑھی تراشتے اور دولت جمع کرتے ہیں سب جہنمی ہیں۔ میں اپنے محلے کے ملا کو بھی دیکھتا تھا کہ ہر مہینے کے شروع میں مختلف محکموں کے لوگ اس کے گھر پر جمع ہو جاتے اور اپنی آمدنی کو حلال کروایا کرتے۔ لیکن آخر کیا کیا جا سکتا تھا؟ میں نوآموز تھا اور اپنے بال بچوں کے لیے روزی کمانا میرے لیے ضروری تھا۔ جس طرح بھی بن پڑا، سال بھر روزی کمائی۔ لیکن خدا شاہد ہے، حالانکہ میں دیکھتا تھا کہ میرے ہمکار ہزار غلط سلط طریقوں سے مال کما رہے ہیں، میں نے کبھی اپنے دست و پا کو خطا کرنے کی اجازت نہ دی، اور جس ضریح کو بوسہ دینے والا ہوں اس کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ دوسروں کا ایک شاہی بھر حصہ بھی میں نے نہیں کھایا... '' وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا۔

کہنے لگا، ''جنگ کے ان برسوں میں میری آنکھوں کے سامنے تہہ بازاری کے دلال اور شاگرد لکھ پتی بن گئے، لیکن میں پہلے کی طرح آقا محمد حسین، خوردہ فروش، خیابان سیروس رہا، اور دن بھر میں جو

Scanned with CamScanner

کچھ کماتا، اس سے بندگان خدا کی مدد بھی کرتا رہا اور زیارت کے لیے اس میں سے بچاتا بھی رہا۔ خدا ہمارے رفتگاں کی مغفرت کرے، میرے بابا بیچارے کو ہمیشہ یہی آرزو رہی اور ہمیشہ مجھے وصیت کیا کرتے تھے کہ بیٹا، اگر کبھی اس قابل ہو جاؤ کہ اس بزرگ کی پابوسی کو جاسکو تو مجھے فراموش مت کرنا! آخر وہ میرے باپ تھے اور میری گردن پر ان کا حق ہے، اب جبکہ میں اس بارگاہ میں جا رہا ہوں، متواتر مرحوم کی روح کو یاد کرتا ہوں کہ شاید قبر کی تاریکی میں ان کی مونس ہو...'' اس نے بس کی چھت پر نظر جما کر مرنے والوں کے لیے فاتحہ پڑھ کر پھونکی۔ بولا ''لیکن اس تمام کے باوجود میرا ارادہ ہے کہ انشاءاللہ پہنچنے کے بعد جونہی فرصت ملی، میں مجتہد کے پاس جا کر اپنے پیسے کو حلال کروالوں گا۔ میں نے خود منبر کے قدموں میں بیٹھ کر وعظ سنا ہے کہ خدا خود کہتا ہے کہ پل صراط پر نادہندوں کو گردن سے پکڑ لیا جائے گا اور جب تک ان سے واجب الادا رقم کا سوگنا وصول نہیں کر لیا جائے گا آگے جانے کی اجازت نہ ملے گی... نعوذ باللہ...''

وہ بہت دیر تک اپنا دردِ دل کہتا رہا اور خلاصہ یہ کہ اس قدر تھکن کے باوجود رات بھر میری پلک سے پلک نہ لگی۔ اس نے اتنی عمدہ باتیں کیں اور کتاب فرج بعد از شدت میں سے اتنی باتیں مجھے یادداشت سے سنائیں کہ میں نے خود سے عہد کیا کہ واپس پہنچ کر پہلی فرصت میں یہ کتاب پڑھ ڈالوں گا۔

میرا پڑوسی صرف مجھی کو فیض نہیں پہنچا رہا تھا بلکہ بس کے دوسرے مسافر بھی اس کے دمِ گرم سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی گرم آواز میں، جو معلوم ہوتا تھا جوانی میں ماتمی دستوں میں نوحہ خوانی کے کام آتی رہی تھی، چاووشی گانے لگتا اور سننے والے کی روح کو تازہ دم کر دیتا۔ رات کو جب ہم اس بے آرام بند جگہ میں زبردستی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کر رہے ہوتے، اور ابھی آنکھ لگے گھنٹہ بھر ہی بمشکل گزرا ہوتا، کہ آقای محمد حسین کی دلنشیں آواز بس کی فضا میں تیرنے لگتی۔ وہ گنگنا رہا ہوتا،

''اول... بہ مدینہ... مصطفیٰ را... صلوات... دوم بہ نجف... شیرِ خدا را...''

میں نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ بس کی کھلی کھڑکی سے خوشگوار ہوا داخل ہو کر میرے چہرے اور گردن کو چھو رہی تھی۔ اور میری قمیص کے کھلے گلے میں گھس کر سینے پر ٹھنڈے پانی کی طرح پڑ رہی تھی۔ میرا دماغ خیالات سے بالکل عاری تھا...

Scanned with CamScanner

معلوم نہیں میں نیند میں تھا یا جاگ رہا تھا... لیکن مجھے مسافروں کی کسی ٹولی میں کسی کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور یہ آواز بس کے انجن کے شور میں مدغم ہو رہی تھی۔ "بر... مشامم... می رسد... ہر..."

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ میرا پڑوسی تھا جو ہمیشہ کی طرح چاووشی پڑھ رہا تھا، یا یہ سب میں نے خواب میں دیکھا تھا، یا کھڑکی سے آنے والی ہوا اس آشنا صدا کو کسی دور دراز کی ناآشنا جگہ سے بہا کر میرے کانوں تک لا رہی تھی۔

❋

فضا میں ہر طرف دبی دبی آوازیں بھری ہوئی تھیں۔ سخت گرمی اور زائروں کے کھچا کھچ بھرے ہونے کے باعث میری پیاس متواتر بڑھ رہی تھی اور اس وقت میری واحد خواہش یہ تھی کہ سوکھے حلق کو تر کرنے کے لیے دو گھونٹ ٹھنڈا پانی مل جائے۔ میں نے زور لگا کر خود کو لوگوں کے ہجوم سے باہر نکالا اور کسی نہ کسی طرح ضریح کو مضبوطی سے تھام کر اپنے جلتے ہوئے چہرے کو ٹھنڈی جالی سے لگا لیا۔ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنی حالت کو بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اپنے برابر میں کھڑی عورت کے ہچکیاں لے لے کر رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور یہ ہچکیاں اسے دعا مانگنے اور اپنی حاجتیں بیان کرنے کی بھی مہلت نہ دیتی تھیں۔ وہ بار بار اپنے ناتواں ہاتھوں سے ضریح کی چوکھٹ کو جھنجھوڑ رہی تھی جس سے صرف اس کے کونوں پر پڑے ہوئے بند تالے جھول رہے تھے۔ وہ لوگ جو ہجوم میں زور لگا کر راہ بناتے ہوئے حرم کے گرد طواف کر رہے تھے اور پتا نہیں، شاید خود سے عہد کیے ہوئے تھے کہ ضریح کے ہر حصے کو بوسہ دیں گے، جب مجھ تک پہنچتے اور دیکھتے کہ میں وہاں سے ہٹنے یا انھیں راستہ دینے پر آمادہ نہیں تو وہ مایوس ہو کر اپنے عہد کو کسی ایسے وقت تک کے لیے ملتوی کر دیتے جب بھیڑ کم ہو اور زیر لب بڑبڑاہٹ کے ذریعے اپنی ناراضی مجھ تک پہنچاتے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ جو ضریح سے گرنے والے گرد و غبار کو اپنے کپڑوں پر پڑنے دینے اور اسے تبرک کے طور پر ساتھ لے جانے کے لیے، بڑی مشکل سے رگڑ کھاتے ہوئے میرے پاس سے گزرتے۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ نرم و ملائم گرد اوپر سے میرے سر اور چہرے پر پڑ رہی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے لوگ یہ آرزو کر رہے ہیں کہ کاش وہ میری جگہ ہوتے اور ضریح سے گرنے والے اس گرد و غبار کو سمیٹ کر

اپنے شہر یا دیہہ کے لوگوں کے لیے گرامی ترین سوغات کے طور پر ساتھ لے جا سکتے تا کہ مریضوں کا علاج کر سکیں اور انھیں معالجے کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھانے سے بچا سکیں۔ اگر چہ اب تک مجھے کل محمد ولی جیسی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی جو پارسال لوٹا تھا اور بتاتا تھا کہ حرم کے سبز غلاف کی ایک کترن اور خود قبرِ مطہر کی دو مٹھی خاک، خود سید کلید بردار نے اسے ہدیہ کی تھی۔ لیکن ابھی میرے پاس وقت تھا اور امید رکھتا تھا کہ اس ماہ کے آخر میں جب حرم کا دروازہ دھلائی کے لیے بند کیا جائے گا، خدامِ حرم کے وسیلے سے کچھ نہ کچھ پالوں گا۔ ایک دو افراد میری نظر میں بھی تھے اور پنجتن کی عنایت سے امید تھی کہ مایوس واپس نہیں جاؤں گا۔

اسی کل محمد ولی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا جوان بیٹا جو پارسال تیرہ روز ٹائیفس کے بخار میں پھنکتا رہا تھا اسی تربت کے پانی کا ایک قطرہ گلے میں ٹپکانے کی بدولت شفایاب ہو گیا تھا۔ پانچ بھیڑیں جو نذر کی گئی تھیں ایک ہی روز ذبح کی گئیں اور محلے کے چالیس فقیروں میں ان کا گوشت بانٹا گیا۔

مجھے خوب یاد آیا، نمعلوم دو سال یا تین سال پہلے ایسا تھا کہ آقا شیخ — اسد اللہ، ہمارا ہفتہ وار روضہ خواں — جو ہر دوشنبے کی رات کو آ کر کمرے کی پچھلی دیوار کے پاس جا بیٹھتا اور خواہ کوئی موجود ہو یا نہ ہو، اپنا روضہ پڑھ کر چلا جاتا اور ہر مہینے کے شروع میں اپنی اجرت لے جاتا تھا، ایک بار سرِ منبر کہنے لگا، ''جوانی کے برسوں میں میں جہاز میں سوار پہلوی سے آستارا جا رہا تھا۔ ابھی سمندر کے درمیان میں تھا کہ طوفان آ گیا۔ سب کی حالت خراب ہو گئی اور میں ایک تنہا گوشے میں آ پڑا اور قے کرنے لگا۔ اچانک دیکھا کہ جہاز کا ایک ملاح مجھے ڈھونڈھتا ہوا آیا اور کہنے لگا، چلو، کپتان تمھیں بلا رہا ہے۔ اس نے زور لگا کر مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیا اور کپتان کے پاس لے گیا۔ میں اس کی زبان نہیں جانتا تھا، لیکن اگر وہ مر گیا ہے تو خدا اس پر رحمت کرے، اگر چہ وہ میری نظر میں ہنوز کافر تھا لیکن میں نے خود اس کی پیشانی سے ایمان کا نور جھلکتا دیکھا...

''اس آقا نے، تمھارے جدِ امجد کی قسم، ایسی باتیں کیں کہ جب ملاح نے مجھے ترجمہ کر کے بتائیں تو میں گنگ رہ گیا اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد سے میرے ایمان میں ایک دنیا بھر کا اضافہ ہو گیا۔ پوری ایک دنیا! ملاح نے بتایا کہ کپتان خاکِ تربت مانگتا ہے۔ اب میری حالت بھی کچھ سنبھل چکی تھی۔ میں اپنے عمامے میں تربت کی چھوٹی سی ٹکیہ ضرور رکھتا ہوں، میں نے ٹکیہ باہر نکالی اور اس کے

Scanned with CamScanner

ہاتھ میں دے دی۔اس نے ٹکیہ لے کر سمندر میں ڈال دی۔

''خدا کی قدرت اور پنجتن کی برکت، پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ طوفان تھم گیا اور لہروں نے آپس میں ٹکرانا بند کر دیا۔ہم صحیح سلامت منزل پر پہنچے اور وہاں میں نے دس دن تک وہی روضہ جو جہاز میں مانا تھا آستارا میں پڑھا...''

میں خود بچپن میں ایک بار بہت بیمار ہو گیا تھا۔اب تک یاد ہے کہ صرف آب تربت سے مجھے شفا نصیب ہوئی۔بعض وقت جب میری بیماری کی شدت بہت بڑھ جاتی، اماں صلوات کی پانچ تسبیحوں کی منت مانتیں۔

میری پیاس ختم ہو چکی تھی اور چہرے کی جلن بھی خوشگوار ٹھنڈک میں بدل گئی تھی۔میرا کام پورا ہوا، زیارت خوب اچھی طرح مکمل کی۔میں نے ایک بار اپنی آنکھوں کو قبر کی ضریح کی جالیوں سے اور اس کے قیمتی سنگ سے لگایا اور میرے دل کی خفتہ آرزوؤں میں ایک بار پھر جنبش پیدا ہوئی اور ان کی جوشش میرے منھ سے چند لمبی آہوں کی صورت ظاہر ہوئی۔میں نہیں جانتا تھا کہ کیا چاہتا ہوں اور اَور کون سی حاجتیں رکھتا ہوں۔ایک بار پھر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اب میں بھی طواف کر رہا تھا۔سستے سگریٹوں کا دھواں اور ایک دوسرے سے مس ہو کر گزرتے ہوئے لوگوں کے سانس آپس میں مل کر اور بدن کے پسینے میں آمیختہ ہو کر ایک خاص قسم کی بو میں ڈھل گئے تھے۔عود کی ٹہنیاں جو کونوں میں رکھی سلگ رہی تھیں اور آہستہ آہستہ دھواں چھوڑ رہی تھیں اس بو کو کسی قدر کم کر رہی تھیں۔مقدس کلمات اونچے اور وسیع گنبد سے ٹکرا کر گونج رہے تھے اور ایک ایسا محیط وجود میں لا رہے تھے جس سے ہر سمت عربی کلمات برس رہے تھے۔در و دیوار پر، کتبوں پر، چھت کی آئینہ کاری کے درمیان جن میں اس جم غفیر کا عکس جھلک رہا تھا اور یہ جھلک آئینوں کے بے شمار ٹکڑوں سے تیزی سے گزر رہی تھی۔دروازوں، مقدس کتابوں کے سامنے اور پشت پر، زائرین کے تھامے ہوئے دعائی کتابچوں پر، ضریح کی پیشانی اور حاشیوں پر، حرم کے بڑے دروازے کے نقرئی تالوں پر اور اَور جگہوں پر عربی کلمات اپنے ہزار نقش و نگار اور گوناگوں زیب و زیور کے ساتھ لکڑی، اینٹوں، کاشی، چاندی اور سونے، ہر چیز پر اپنا عکس ڈال رہے تھے۔خدا جانتا ہے کتنے برسوں سے یہ کلمات اسی طرح

Scanned with CamScanner

وہاں سے تیزی سے گزرنے والے زائروں پر اپنا عکس ڈالتے رہے تھے اور ان کے ابروؤں پر ذرا بھی خم نہ آیا تھا۔ ان کتبوں اور کلمات سے کتنے ہی ہزار حاجت مندوں نے اپنے چہرے رگڑے تھے، انھیں اپنے گرم اور نمکین آنسوؤں میں نہلایا تھا، کہ رفتہ رفتہ یہ اپنی چمک کھو بیٹھے تھے۔ اب چاندی اور سونے کے صاف اور صیقل کیے ہوئے ٹکڑوں کے سوا جو اپنے دلوں میں کتنی ہی صدیوں کے لوگوں کے نہفتہ راز چھپائے ہوئے تھے، کچھ باقی نہ بچا تھا...

گرد و غبار کے ذرات جو دبیز اور نرم قالینوں سے اٹھ رہے تھے وہ اس مقدس فضا میں گنبد کے روشندانوں سے آتی روشنی میں اور چمکدار اور صیقل کی ہوئی چاندی پر جگمگا رہے تھے، اور ان کے درمیان دھوئیں کے جو چھلے رقصاں تھے، وہ اوپر کی طرف اٹھ رہے تھے اور کسی فرد یا کئی افراد کی تیز حرکت سے تیزی سے اوپر نیچے ہونے لگتے تھے۔

ہر شخص ایک خاص کیفیت میں تھا اور میرے سوا وہاں کوئی تماشائی نہ تھا۔ ایک شخص ایک کونے میں سمٹا بیٹھا تھا اور اس نے اپنے عمامے کا سرا، جسے وہ نماز کے وقت سر پر لپیٹتا تھا، داہنی طرف سے گردن میں لپیٹ رکھا تھا، سر دیوار سے ٹکا رکھا تھا اور بے محابا، زار زار رو رہا تھا اور مجھے اتنی دور سے صرف اس کے ہونٹ حرکت کرتے اور اس کا چہرہ اس کی آنسو بھری آنکھوں کی سمت اوپر اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

سچ مچ مردہ لوگ کس قدر خوش قسمت ہیں... میرا بہت دل کرتا ہے کہ جب میں مروں تو لوگ مجھ سے یہی سلوک کریں۔ بلاشبہ ایسی صورت میں کوئی انسان موت سے خوفزدہ نہیں ہوگا۔ مُردوں کو طواف کرایا جا رہا تھا: انھیں کئی بار پورے احترام سے حرم کے گرد گھمایا جاتا اور پھر باہر لے جایا جاتا۔ ان پر چھڑکے ہوئے بے تحاشا کافور کی بو فضا میں جگہ جگہ باقی رہ جاتی اور مجھے سوچ میں ڈال دیتی۔ اگرچہ مجھے افسوس تھا کہ اب ان مُردوں کو حرم میں کیوں دفن نہیں کیا جاتا، لیکن مجھے ایک روضہ خواں کی کہی ہوئی یہ بات یاد تھی کہ حرم کے اردگرد کی ساٹھ فرسنگ زمین ایسی محترم ہے کہ منکر نکیر وہاں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہاں، اگرچہ مجھے یقین تھا کہ چاہے میں وصیت کر کے ہی کیوں نہ مروں، مجھے حرم مطہر کے علاقے میں دفن نہیں کیا جا سکتا، لیکن کم سے کم یہاں کے قبرستان میں تو جگہ مل سکتی ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔ کاش میں اس وقت، ابھی مر جاتا... مگر نہیں، مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے تو ابھی وصیت ہی نہیں کی کہ مجھے کہاں دفن کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ میں کس قدر

Scanned with CamScanner

بے پروا ہو گیا کہ اپنے لیے اب تک کفن کا بھی بندوبست نہ کیا۔ پس تو میں پہلے جا کر اپنے لیے موت کا لباس حاصل کروں گا، پھر اسے لا کر خود طواف دوں گا اور اس کے بعد یہ وصیت کر کے کہ مجھے کس جگہ دفن کیا جائے، مر جاؤں گا۔

❊❊

(فارسی عنوان: ''زیارت'')

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

گناہ

وہ ہمارے یہاں ہفتہ وار روضہ خوانی کی رات تھی۔ میں نے گھر کی چھت کو جھاڑو اور پانی سے اچھی طرح دھو کر بستر بچھا دیے تھے۔ اندھیرا چھا گیا تھا اور روضہ سننے والے آ پہنچے تھے۔ ہمارا صحن، گرمیوں میں جس کے کناروں پر دیوار کے ساتھ ساتھ قالین بچھا دیے جاتے تھے اور حوض کے گرد گلدان سجا دیے جاتے تھے، اب پوری طرح بھر چکا تھا۔ میں اپنا کام ختم کر کے اندھیرے میں چھت پر بیٹھی تھی اور نیچے صحن کا نظارہ کر رہی تھی۔ گرمیوں میں جب روضہ باہر صحن میں پڑھا جاتا، میں ایسا ہی کرتی تھی۔ اس رات بھی میں دیر تک صحن کا تماشا کرتی رہی۔ میں اس طرح بیٹھی تھی کہ میرا سر اور بدن اندھیرے میں تھا۔ میں روشن صحن میں ہر ایک کو داخل ہوتے اور اپنی اپنی مخصوص جگہ بیٹھتے دیکھتی رہی۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے۔ ایک بڑے میاں، کہ جب گریہ کرتے تو معلوم ہوتا تھا ہنس رہے ہیں، آئے اور اپنی مخصوص جگہ، روضہ خواں کی کرسی کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ ان کے گریہ کرنے کی آواز پر مجھے اور میری بہن کو ہمیشہ ہنسی آ جاتی تھی۔ اس پر اماں ہمیں ڈانٹتیں اور اپنی ہتھیلی کی پشت دانتوں سے کاٹتے ہوئے ہم سے استغفار کرنے کو کہتیں۔ ایک اور صاحب تھے جو روتے وقت اپنا چہرہ کبھی نہ چھپاتے، نہ سر جھکاتے۔ باقی سب لوگ ایسا کرتے تھے، گویا انھیں اس پر شرم آتی ہو کہ دوسرے لوگ انھیں آنسو بہاتے دیکھیں۔ لیکن یہ صاحب نہ سر نیچا کرتے اور نہ ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے۔ روضہ خواں پڑھ رہا ہوتا اور یہ سامنے کی طرف دیکھتے رہتے اور آنکھوں سے آنسو بے آواز ڈھلک کر ان کے خشخشی کھچڑی

Scanned with CamScanner

داڑھی والے چہرے پر بہا کرتے۔ روضہ ختم ہوتے ہی وہ سید ھے حوض کے پاس پہنچتے اور چہرہ دھوتے۔ پھر گیلے چہرے کے ساتھ چائے پیتے اور چلے جاتے۔ جاڑوں میں وہ کیا کرتے تھے، مجھے معلوم نہیں، کیونکہ اُن دنوں روضہ اندر پنج دری میں پڑھا جاتا۔ لیکن گرمیوں میں، جب میں اوپر چھت سے صحن میں روضے کی بساط کو دیکھا کرتی، ایسا ہی ہوتا تھا۔ مجھے ان بڑے میاں سے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ جب میں اکیلی ہوتی تو ان کے رونے کی آواز سن کر مجھے ہنسی نہ آتی۔ لیکن جب کبھی میری وہ آفت کی پرکالہ بہن ساتھ ہوتی تو زور کا قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی اور مجھے بھی ہنسا دیتی۔ پھر اماں ناراض ہوتیں۔ دوسرے صاحب کی کوئی مخصوص جگہ نہ تھی۔ ہر بار کسی اور جگہ بیٹھ جاتے۔ مجھے ان کا رونا اس لیے پسند تھا کہ وہ بے آواز تھا۔ ان کے کندھے بھی نہ کپکپاتے۔ وہ سیدھے، بے حرکت بیٹھے رہتے اور آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر ان کی کھچڑی داڑھی میں جذب ہوتے رہتے اور اس کے اوپر بھی چہرہ گیلا دکھائی دیتا۔ اُس رات وہ دوسروں کی طرح آئے اور چلے گئے۔ صحن میں سامنے کی طرف چٹائی پر بیٹھے تھے اور چہرہ میری طرف تھا۔ ہمارے صحن کے چاروں کناروں پر بچھانے کے لیے قالین کافی نہ تھے، اس لیے باقی جگہ پر چٹائیاں بچھائی جاتیں۔ صحن کا پچھلا حصہ ہمیشہ کی طرح بھر چکا تھا۔ بابا کے دوست سب دالان میں بیٹھے تھے۔ پانی پلانے والا ملازم گلدانوں کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا اور مجھے صرف اس کے نماز پڑھنے کی اونچی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا کتنا جی کرتا تھا کہ اونچی آواز میں نماز پڑھوں۔ کیسی عجیب خواہش تھی! جس وقت سے میں نے نماز پڑھنا سیکھا تھا، اچھی طرح یاد ہے، یہ خواہش ہمیشہ اسی طرح میرے دل میں رہی تھی اور کبھی خیال نہ تھا کہ یہ کبھی عملی صورت اختیار کر سکے گی۔ کر بھی نہیں سکی۔ ایک لڑکی کے لیے، عورت کے لیے، جسے اونچی آواز میں نماز پڑھنا منع ہے، اس خواہش پر عمل کرنا کیونکر ممکن تھا! تو میں کہہ رہی تھی، اس رات دیر تک صحن میں روضہ خوانی کا نظارہ کرتی رہی اور بعد میں جب بابا نماز پڑھ کر مسجد سے لوٹے تو جلدی سے منڈیر سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اب نیچے جھانک کر دیکھنا ضروری نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور لوگ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے بابا کو واپس آتے ہوئے دیکھا نہیں۔ ان کے جوتوں کی آواز گلی سے دالان میں داخل ہوتی سنائی دی، اور پھر ان کے چپلوں کی شڑپ شڑپ دالان کی سلوں پر پڑی، اور مجھے پتا چل گیا۔ ان کے پیچھے پیچھے اینٹوں کے فرش پر کچھ اور لوگوں کے قدموں کی چاپ بھی میں نے سنی۔ یہ بابا کی مسجد کے موذن اور ان کے مرید تھے جو ان کے ساتھ مسجد سے لوٹے تھے۔ مجھے

Scanned with CamScanner

معلوم تھا کہ بابا اب اپنے جوتے دیوار کے ساتھ کونے میں رکھ دیں گے اور اپنے چھوٹے ترکمانی قالین پر کچھ دیر کھڑے رہیں گے، اور سب لوگ جو صحن میں اور کمرے میں بیٹھے چائے اور حقہ پی رہے ہیں، ان کے احترام میں کھڑے ہو جائیں گے اور پھر سب ایک ساتھ بیٹھیں گے۔ یہ سب کچھ دیکھنا ضروری نہ تھا، مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ گرمیاں ختم ہو رہی تھیں اور شاید یہ گرمیوں کا تیسرا موسم تھا جب میں ہر روضہ خوانی کی رات چھت پر بستر بچھانے کے بعد منڈیر پر سے صحن کا نظارہ کرتی تھی۔ اماں نے دو ایک بار مجھے بے خبری میں پکڑا تھا۔ جس وقت میں تماشا دیکھنے میں محو تھی، وہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں اور آہستہ سے مجھے پکارا۔ میں ڈر اور شرم کے مارے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ پھر خاموشی سے اماں کے سامنے کھڑے ہو کر دل میں عہد کیا کہ اب کبھی چھت کی منڈیر کے نزدیک نہیں جاؤں گی۔ لیکن ایسا کیونکر ہو سکتا تھا! آخر کسی بارہ تیرہ سال کی لڑکی کے لیے، جیسا کہ میں اس وقت تھی، ان باتوں پر کان دھرنا کہاں ممکن تھا۔ خیر، میں کہہ رہی تھی، بابا کے آتے ہی میں منڈیر سے ہٹ کر بستروں کے پاس آ گئی۔ اچھی بات یہ تھی کہ بابا کو اب تک نہیں معلوم تھا کہ میں روضے والی رات کو چھت کی منڈیر سے مردوں کو دیکھا کرتی ہوں۔ اگر انھیں معلوم ہو جاتا تو بہت برا ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اماں بابا سے میری چغلی نہیں کھائیں گی۔ ہماری اماں بہت نرم دل تھیں۔ انھوں نے کبھی بھی ہماری شکایت نہیں کی، ہمیشہ ہماری طرفداری کی اور وہ ہمارے لیے نماز کی نئی چادریں خریدنے پر بابا سے بحث تکرار بھی کرتی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بستر بچھے ہوئے تھے۔ رات کے وقت موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا اور جب میں اپنے گدے پر، جو اکیلے میرا نہیں تھا بلکہ میری سات سال کی بہن بھی اس پر میرے ساتھ سوتی تھی، بیٹھی تو دیکھا کہ وہ بہت ٹھنڈا ہے۔ مجھے سب کچھ کتنی اچھی طرح یاد ہے۔ کس نے دیکھا ہے کہ آدمی کو جو چیز دل سے پسند ہو اور اسے یاد رکھنا چاہے، وہ اسے جلدی سے فراموش ہو جائے؟ لیکن بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ایسی یادداشت میں بیٹھ جاتی ہیں کہ کبھی محو نہیں ہوتیں۔ اُس رات کی ایک ایک بات مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ پڑوس والوں کی لڑکی پر، جو اپنی چھت پر بستر بچھانے آئی تھی اور منڈیر کے پاس آ کر مجھے آواز دے رہی تھی، میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ میں سوتی بن گئی اور اسے کچھ جواب نہ دیا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا، لیکن بستر اس قدر ٹھنڈا لگ رہا تھا کہ میں وہاں سے

Scanned with CamScanner

ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ لڑکی نیچے چلی گئی تب میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں میں کیا کیا سوچ رہی تھی، لیکن اچانک ایک بات میرے ذہن میں آئی۔ مجھے سوجھی کہ آہستہ سے جا کر بابا کے بستر پر لیٹ جاؤں، جیسا کہ میری بہت دنوں سے خواہش تھی۔ یہ آرزو کرنے کی مجھے اب تک جرأت نہ ہوئی تھی کہ ان کے بستر پر سو جاؤں۔ صرف وہاں لیٹنا چاہتی تھی۔ بابا کا بستر چھت پر دوسری جانب الگ بچھایا جاتا تھا۔ میں اور دوسرے بچے اماں کے ساتھ اِس طرف سوتے تھے اور مجھ سے دو سال بڑے بھائی کا بستر اس قطار میں سب سے آخر میں بچھتا تھا۔ جونہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا، ہمیشہ کی طرح پہلے مجھے خود سے بڑی شرم آئی اور میں نے بابا کے بستر کی طرف سے نظریں پھیر لیں۔ اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ دیر آسمان کو تکتی رہی۔ دو ستارے ٹوٹ کر گرتے سے دکھائی دیے، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ میں اٹھی اور آہستہ آہستہ، جھک کر، تاکہ میرا سر صحن کی روشنی میں دکھائی نہ دے جائے، اس طرف گئی اور جا کر بابا کے بستر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ صرف ان کے بستر پر چادر بچھتی تھی۔ مجھے سب اچھی طرح یاد ہے۔ ہر رات بستر بچھاتے وقت جب میں ان کے گدے کو جھاڑتی اور اس کے سرہانے تکیہ جماتی اور لحاف تہہ کر کے پائینتی کی طرف رکھتی تو ایک بڑی سی سفید چادر بھی ہوتی جسے میں ان سب چیزوں کے اوپر بچھاتی اور ہاتھوں سے اس کی سلوٹیں دور کرتی۔ اندھیرے میں بھی ان کے بستر کی سفید چادر صاف دکھائی دیتی اور ہر رات یہی خیال میرے ذہن میں آتا۔ ہر رات یہ خواہش پیدا ہوتی کہ چند منٹ کے لیے، صرف آدھے گھنٹے کے لیے اس پر لیٹ جاؤں۔ خاص طور پر چاندنی راتوں میں، چودھویں کی رات کو جب چادر زیادہ سفید، بالکل برف جیسی دکھائی دے رہی ہوتی۔ یہ خیال مجھے کس قدر اذیت پہنچاتا تھا! لیکن اس رات سے پہلے میں نے ایسا کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ معلوم نہیں یہ کیا تھا۔ مجھے دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو مجھے نہیں معلوم اس میں کیا غلط بات تھی۔ لیکن جب بھی یہ خیال ذہن میں آتا، میں بے چین ہو جاتی۔ چہرہ سلگ اٹھتا، ہونٹ جلنے لگتے، پسینہ آ جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ ابھی گر پڑوں گی۔ میں کچھ دیر دودِلے پن سے کھڑی رہتی، پھر خود کو سنبھال کر بھاگتی اور اپنے گدے پر آ کر پڑ جاتی۔ ایک رات، مجھے یاد ہے، میں خوب روئی بھی تھی۔ بعد میں ایسا کرنے پر خود پر ہنسی بھی آئی اور میں نے اس بات کا چھوٹی بہن سے بھی تذکرہ نہ کیا۔ لیکن اس رات کا رونا کیسی ہنسی کی بات تھی! میں نے خود کو اپنے بستر پر گرا دیا اور روتی رہی، پھر نیند اور بیداری کے درمیان ہی تھی کہ بہن نے اوپر آ

کر مجھے پکارا اور کہا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اس رات بھی جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا تو مجھے ہمیشہ کی طرح بہت بے چینی ہوئی۔ بابا کے بستر کی سفید چادر مجھے خواب میں بھی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن کیا مجھ میں اس کے پاس جانے کی ہمت تھی؟ لیکن اس رات پتا نہیں کیسے مجھ میں ہمت آ گئی۔ دیر تک ان کے بستر کے پاس کھڑی سفید چادر اور گدے کو تکتی رہی، اور پھر اچانک پتا نہیں کیا ہوا کہ میں نے اپنے دل کو گویا سمندر میں ڈال دیا اور خود کو بابا کے بستر پر گرا دیا۔ چادر بہت ٹھنڈی تھی اور میری پیٹھ کو پیروں تک اس قدر ٹھنڈک پہنچی کہ آج تک اس کے خیال سے لطف آتا ہے۔ شاید اس ٹھنڈک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن چہرہ سلگ رہا تھا اور دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے کسی نامحرم نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ جیسے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بابا کمرے میں آ جائیں اور میں شرم کے مارے گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوں۔ اس وقت کی طرح آج بھی مجھے بعض چیزوں پر ایسی ہی شرم اور گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت میری شرم زیادہ دیر تک نہ رہی۔ میری پیٹھ رفتہ رفتہ گرم ہو گئی۔ پسینہ خشک ہو گیا اور چہرے کی جلن بھی دور ہو گئی۔ اور بابا کے بستر پر لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔

بھائی مدرسے چلا جاتا تھا تو میں گھر کے کاموں میں اماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دن بھر کے کام کاج اور بستر بچھانے کی تھکن ایسی تھی کہ پتا نہیں کس طرح مجھ پر اتنی شیطانی نیند سوار ہو گئی۔ اب بھی جب اس رات کا خیال آتا ہے تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب ہوا کیسے۔ جب آنکھ کھلی تو پایا کہ بابا کی رُلائی سینے تک مجھے ڈھانپے ہوئے ہے اور برابر میں جیسے کوئی سو رہا ہے۔ ہائے! کوئی نہیں جان سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی! خدایا! میں نے آہستہ سے، پھر جلدی سے کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی سر سے پیر تک پسینے میں تر ہو گئی اور ہلنا جلنا بند کر دیا۔

پورا بدن سلگ رہا تھا اور دانت کٹکٹا رہے تھے۔ میں نے ہولے ہولے ٹانگیں سمیٹیں اور گھٹنوں کو سینے سے لگا لیا۔ بابا میری طرف پیٹھ کیے کروٹ سے لیٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھ رکھا تھا اور چلم پی رہے تھے۔ چونکہ میں کروٹ نہیں لے سکتی تھی، مجھے ان کے سر کے اوپر چلم کا دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ صحن میں روضہ خوانی کے لیے جلائی گئی بتیاں بجھ چکی تھیں۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی، سوائے پڑوسیوں کی چھت پر سے آتی برتنوں کی کھنکناہٹ کے، جہاں رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ ہائے، میں کتنی گہری نیند سو رہی تھی! آخر میری آنکھ کس طرح لگ گئی؟ میرے دانت اب بھی بج رہے تھے اور سمجھ

Scanned with CamScanner

میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ اٹھ جاؤں؟ مگر اٹھوں کیسے؟ اسی طرح سو جاؤں؟ مگر بابا کے برابر میں لیٹ کر کیسے سوؤں؟ میں چاہتی تھی کہ چھت پھٹ جائے اور مجھے اپنے ساتھ نیچے لے جائے۔ اف، میری کیسی بری حالت ہو رہی تھی! اپنی اب تک کی چالیس سالہ زندگی میں مجھے پھر کبھی ایسی حالت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ دل کرتا تھا کسی طرح نیست و نابود ہو جاؤں تاکہ بابا جب اس طرف کروٹ بدلیں تو میں انھیں دکھائی نہ دوں۔ دل کرتا تھا بابا کی نظروں سے بچ کر ان کی چلم کے دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاؤں اور وہ مجھے اس بے حیائی کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹا نہ دیکھ پائیں۔ ہائے، میری کیسی حالت ہوئی! ہوا رہ رہ کر میرے پسینے سے تر پیراہن سے ٹکراتی تھی اور اسے ٹھنڈا کیے دیتی تھی۔ لیکن مجھ میں اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی ہمت کہاں تھی! اسی طرح ساکت پڑی رہی۔ نہ چت اور نہ کروٹ کے بل۔ گھٹنے اسی طرح سینے سے لگے ہوئے تھے اور بابا اسی طرح میری طرف پیٹھ کیے لیٹے چلم پی رہے تھے۔ کبھی کبھی جب میں اُس رات کے بارے میں سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر بابا نے آخر کار بات نہ کی ہوتی تو میں کیا کرتی۔ مجھ میں کچھ بھی تو کرنے کی سکت نہ تھی، اور یقیناً صبح تک اسی حالت میں پڑے پڑے، سردی سے یا ڈر اور شرم سے اکڑ کر رہ جاتی۔ لیکن آخر کار بابا نے بات شروع کی اور وہ بھی اس طرح کہ چلم کا سرا منھ میں تھا اور آواز دانتوں میں سے ہو کر نکل رہی تھی۔ بولے، ''بیٹی، نماز پڑھ لی؟'' میں نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ سرِ شام اوپر چھت پر آنے کے بعد سے نیچے گئی ہی نہیں تھی۔ لیکن اگر نماز پڑھ بھی چکی ہوتی تو بابا کے سوال کے جواب میں جھوٹ بول دیتی اور کہتی کہ نہیں پڑھی۔ آخر یہی راہِ فرار تھی جس کے ذریعے اس حالت سے نجات پا سکتی تھی۔ لیکن شرم اور ڈر کے مارے اس قدر بے حال تھی کہ پہلے پہل تو میری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ میں نے بابا کو کیا جواب دیا۔ بعد میں سوچنے پر یاد آیا، جیسے میں نے جواب میں کہا ہو کہ ''ہاں بابا، پڑھ لی۔'' لیکن آخر اسی سوال جواب سے مجھے موقع ملا کہ پلک جھپکتے میں کھڑی ہو گئی، اپنی چپلیں ہاتھ میں لیں اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ بابا کے سوال نے جیسے مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ جب نیچے ایوان میں آئی تو اماں میرا مہتابی زرد چہرہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ پوچھنے لگیں، ''تمھارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟'' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے انھیں پوری بات بتائی تو انھوں نے تیزی سے میری طرف سے چہرہ پھیر لیا اور باہر جاتے ہوئے بولیں، ''ٹھیک ہے بیٹی، کوئی گناہِ کبیرہ تو نہیں کیا تم نے!'' لیکن میں کھانا کھانے اور نماز پڑھنے کے دوران اسی فکر میں رہی، اور خود سے اور ہر چیز سے

شرماتی رہی۔ جیسے کوئی گناہ کر بیٹھی ہوں۔ گناہ کبیرہ۔ جیسے بابا کا بستر کوئی نامحرم مرد تھا جس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس بات کا یہی مطلب آتا تھا۔ لیکن اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس وقت مجھے جو خجالت محسوس ہو رہی تھی وہ اس عورت کی سی تھی جو کسی نامحرم مرد کے پہلو میں سو گئی ہو۔ خیر، اس سب کے بعد میں دوبارہ چھت پر گئی اور چپکے سے اپنے بستر پر سر تک لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں بابا کے پاس بیٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں، ''تو آپ کو کچھ پتا ہی نہیں کہ آپ کی بیٹی کس قدر گھبرا گئی تھی؟ وہ تو سمجھتی ہے اس سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔'' بابا نہ ہنسے اور نہ کچھ بولے۔ صرف ان کے چلم کے لمبے لمبے کش لینے کی آواز آتی رہی یہاں تک میری آنکھ لگ گئی۔

❊❊

(فارسی عنوان: ''گناہ'')

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

سہ تار

اس کے ہاتھ میں ایک نیا اور بے غلاف سہ تار تھا اور وہ کھلے کالر کے ساتھ بے پروائی سے چلتا آ رہا تھا۔ وہ مسجدِ شاہ کی سیڑھیاں تیزی سے اترا اور خوانچہ فروشوں اور ان لوگوں کے ہجوم میں سے جو کچھ بھی نہیں جانتے تھے کہ کس چیز کی تلاش میں ہیں، اپنا راستہ بنا کر گزرنے لگا۔

سہ تار کو اس نے ایک ہاتھ سے پیٹ پر تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے تار قمیص کے بٹنوں میں نہ الجھ جائیں، یا کسی حمال کے اٹھائے ہوئے سامان کی نوک میں پھنس کر ٹوٹ نہ جائیں۔

آخرکار آج اس کی پرانی خواہش پوری ہوئی تھی۔ اب اسے ضرورت نہ تھی کہ کسی مجلس میں جانے سے پہلے کسی سے سہ تار مانگے، اپنی خون پسینے کی کمائی سے اس کا کرایہ ادا کرے اور پھر دوسروں کا احسان بھی اٹھائے۔

اس کے بکھرے بال پیشانی پر پڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اس کی داہنی آنکھ کو بھی ڈھانپ لیا تھا۔ گال پچکے ہوئے اور رنگ زرد تھا۔ البتہ وہ بڑے جوش اور وجد کے عالم میں تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا۔ اگر اس وقت مجلس برپا ہوتی اور موقع ہوتا تو وہ ساز چھیڑ دیتا اور اپنے اندر کی شادمانی اور خوش بختی کو سب لوگوں میں پھیلا دیتا۔ لیکن ابھی، ان لوگوں کے ہجوم کے درمیان جو نہ معلوم کس کام سے یہاں پھر رہے تھے، وہ سوائے اس کے کیا کر سکتا تھا کہ دوڑتا ہوا چلے اور کسی جگہ پہنچ جائے۔ وہ خوشی میں لپکتا ہوا

Scanned with CamScanner

چل رہا تھا اور اس سہ تار کے بارے میں سوچ رہا تھا جواب اس کا اپنا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کا جب بھی جی چاہے گا وہ زخمے کو تاروں سے ہمکنار کر دے گا، پوری قوت اور بے اختیاری سے، یہ دل میں یہ وسوسہ لائے بغیر کہ کہیں تار ٹوٹ نہ جائیں اور ساز کا مالک اس کے روزِ روشن کو شبِ تار میں نہ بدل ڈالے۔ اب وہ اس فکر سے نجات پا چکا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اب اس ساز پر وہ ایسا ہنر دکھائے گا اور خود ساز سے ایسی داد پائے گا کہ خود بھی اس کی تاب نہ لا سکے گا اور گریہ کرنے لگے گا۔ نہ معلوم کیوں گریہ کرنے لگے گا۔ اس کے دل میں یہی آرزو تھی کہ اتنی اچھی طرح ساز بجائے کہ خود بھی رو پڑے۔ اسے یقین تھا کہ اسی صورت میں اس کا ہنر مکمل ہوگا کہ خود اسے بھی رلا دے۔ اب تک وہ اتنی اچھی طرح نہیں بجا سکا تھا جیسا کہ اسے آرزو تھی۔ اب تک وہ دوسرے لوگوں کے لیے بجاتا رہا تھا، ان تارزدہ لوگوں کے لیے جو اپنی گمشدہ اور مفرور شادمانیوں کو ساز کی صدا اور اس کی حزیں آواز میں ڈھونڈ ھتے تھے۔

ان تمام راتوں میں جب اس نے عیش و سرور کی مجلسوں میں گایا اور ساز بجایا تھا، ان تمام محفلوں میں اسے ایک بے چین کر دینے والی خوشی ملی تھی، اور وہ اپنے ساز کی صدا پر رو نہ سکا تھا۔ ایسا نغمہ پیدا نہ کر سکا تھا جو خود اسے رلا دے۔ یا وہ مجلسیں اس کے لیے مناسب نہ تھیں اور جو لوگ اسے پیسے دے کر دعوت میں بلاتے تھے، اس کے آنسوؤں کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھے، یا وہ خود اس ڈر سے کہ کہیں تار نہ ٹوٹ جائیں، زخمے کو بڑے ملائم ہاتھ اور آہستگی سے تاروں پر حرکت دیتا تھا، اس سے کہیں زیادہ آہستگی سے جس پر وہ قادر تھا۔ اس کا بھی اسے یقین تھا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ قوت سے تاروں کو چھیڑنے اور گانے پر قدرت رکھتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اب اس کے کام میں اس طرح کی کوئی خلش نہ رہ جائے۔ اب وہ احتیاط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب، جبکہ وہ بقول خود 'بے برکت' پیسہ خرچ کر کے ساز خرید پایا تھا، اس کی آرزو پوری ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنے ساز کا خود مالک تھا۔ اب وہ آرام سے، اپنی مرضی کا نغمہ بجا سکتا تھا، ایسا نغمہ جو خود اسے رلا دے۔

اسے ساز بجاتے اور گاتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ اسی دھن میں اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ وہ ہمیشہ کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھتا اور اپنے آپ گنگناتا رہتا۔ دوسرے ہم کلاس اسے یا تو

Scanned with CamScanner

اہمیت نہیں دیتے تھے یا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ لیکن حساب کا استاد بہت سخت گیر تھا۔ اس کی گنگناہٹ سے اتنا برہم ہوتا کہ طیش میں آ کر اسے کلاس سے باہر نکال دیتا۔ اس نے تین چار بار حکم دیا کہ کلاس میں گنگنانا بند کرے۔ لیکن ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟ صرف آخری سال ایسا تھا کہ کلاس کے پچھلے حصے سے اس کے گنگنانے کی آواز کسی کو سنائی نہیں دی۔ وہ اس قدر تھک جاتا اور راتوں کو اس قدر جاگتا کہ یا تو دوپہر تک بستر میں پڑا رہتا یا کلاس میں سوتا رہتا۔ لیکن اس داستان نے زیادہ طول نہ کھینچا اور جلد ہی اس نے اسکول ترک کر دیا۔

پہلا سال اس کے لیے بہت تھکا دینے والا ثابت ہوا۔ وہ ہر رات ساز بجاتا اور گاتا اور ہر روز دوپہر تک پڑا سویا کرتا۔ لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس نے اپنے معمولات میں باقاعدگی پیدا کر لی اور ہفتے میں دو تین بار سے زیادہ لوگوں کی دعوت قبول کرنا بند کر دیا۔ ہوتے ہوتے اس کی شہرت بھی ہو گئی اور اب اسے موسیقی کے اِس دستے یا اُس دستے کے پاس کام کی تلاش میں جانا نہیں پڑتا تھا۔ لوگ اسے جاننے لگے تھے اور اس کے افلاس زدہ گھر پر آ کر اس کی ماں کے پاس ہدایات چھوڑ جاتے۔ انھیں یقین ہوتا کہ وہ مقررہ وقت پر پہنچ جائے گا اور ان کی رات اچھی گزرے گی۔

اس کے باوجود، اس کا کام کمر توڑ حد تک سخت تھا۔ اس کی ماں محسوس کرتی تھی کہ وہ روز بروز دبلا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ خود اس پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ اسے تو بس یہی لگن تھی کہ کسی طرح اس کا اپنا ساز ہو جائے، اور اپنے ساز پر جیسا اس کا جی چاہے نغمہ پیدا کرے۔ یہ بھی آسانی سے ممکن نہ ہوا۔ صرف پچھلے کچھ عرصے سے، وہ بھی اگر کوئی ٹھاٹھ دار عروسی تقریب اس کے حصے میں آ جائے، وہ کچھ بچا پاتا تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ نیا سہ تار خریدنے کے قابل ہوا۔ اور اب، جب وہ اپنے ساز کا خود مالک تھا، نہیں جانتا تھا کہ اس کی اور کیا آرزو ہے۔ یقیناً اس کی اور بھی خواہشیں رہی ہوں گی۔ اس نے اب تک اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اور اس وقت وہ صرف اس فکر میں تھا کہ کسی طرح کہیں پہنچ جائے اور اپنے سہ تار کو اچھی طرح دیکھے بھالے اور اس سے مانوس ہو۔ ان مصنوعی عیش و سرور کے لمحوں میں بھی جب سہ تار اس کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ اس کے آہنگ سے اپنی آواز ملا رہا ہوتا، وہ آسودگی اور بےخودی میں اتنا ڈوب جاتا کہ ساز کو خود سے جدا کر کے رکھنے کو اس کا ہرگز جی نہ کرتا۔ لیکن ایسا کیونکر ممکن تھا؟ دوسروں کا گھر، دوسروں کا عیش و سرور — وہ تو بس دوسروں کی محفل گرم کرنے کا ذریعہ تھا اور بس۔ بےخودی کے ان

Scanned with CamScanner

تمام لمحوں میں بھی وہ خودکو، اپنے دل کو گرم کرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔

جاڑوں کی لمبی راتوں میں، جب وہ ایسی ہی کسی محفل سے لوٹتے ہوئے، بے اندازہ تھکن سے ہلاک ہوتے ہوئے، اندھیرے میں اپنے گھر کا راستہ ڈھونڈھ رہا ہوتا، اپنی اس اندرونی حرارت کی احتیاج اسے اس قدر زندہ اور جاندار محسوس ہوتی کہ اسے لگتا اس حرارت کے بغیر وہ گھر تک پہنچ نہیں سکے گا۔ ایسے کئی موقعوں پر اس پر وحشت سوار ہوگئی تھی اور کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ اس گم گشتہ حرارت کی جستجو میں اس نے پوری پوری رات مے خانے کے ایک کونے میں بیٹھے گزار دی تھی۔

وہ بہت کمزور تھا۔ پہلی نظر میں اس پر کسی افیونی کا شبہ ہوتا۔ لیکن آج اس پر جو جوش طاری تھا اور جو حرارت وہ اپنے اندر پچھلے گھنٹے بھر سے محسوس کر رہا تھا — جب سے وہ اس سہ تار کا مالک بنا تھا — اس کے رخساروں پر پھول سے کھل اٹھے تھے اور پیشانی گرم ہوگئی تھی۔

وہ اپنے انھی خیالوں میں گم مسجدِ شاہ کے دروازے تک پہنچا اور اس کے آستانے کے ہموار پتھر پر پاؤں دھرا ہی تھا کہ ایک عطر فروش لڑکا، جو مسجد کے دروازے سے متصل اپنی دکان پر سے تاکتے ہوئے کسی گاہک کا انتظار کرتے ہوئے تسبیح گھمار ہا تھا، اپنی دکان کے تھڑے سے نیچے اترا اور لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

''ارے بے دین! اس آلۂ کفر کے ساتھ مسجد میں گھس رہا ہے؟ خانۂ خدا میں؟''

اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جو حرارت ابھی ذرا دیر پہلے اس کے دل تک پہنچ رہی تھی، اچانک غائب ہوگئی۔ پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں کچھ نہ آیا، پھر رفتہ رفتہ سمجھا کہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ ابھی تک کسی کی توجہ اس طرف نہ ہوئی تھی۔ زیادہ لوگ آجا نہیں رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ خوانچہ فروشوں سے مول تول میں مصروف تھے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے اپنی کلائی چھڑا کر اپنا راستہ لینے کی کوشش کی لیکن عطر فروش لڑکا اسے چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ وہ اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑے پکڑے اونچی آواز میں اس پر لعن طعن کرتا رہا۔ ''مردود بے دین! خدا سے شرماتا تک نہیں! بے شرم، بے حیا!''

اس نے ایک بار پھر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی کہ اپنی راہ چلا جائے، لیکن لڑکا اتنی آسانی سے اسے جانے نہ دینا چاہتا تھا اور گویا اپنے دھندے کے مندا ہونے کا بدلہ اس سے لینے پر مصر تھا۔ ہوتے ہوتے ایک ایک دو دو افراد ان کی طرف متوجہ ہونے لگے اور اس کے گرد دائرے میں اکٹھے

Scanned with CamScanner

ہونے لگے، لیکن اب تک کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ ابھی تک کسی نے دخل بھی نہیں دیا تھا۔ اس کا بدن شل سا ہو رہا تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ جلد ہی کچھ نہ کچھ واقع ہونے والا ہے۔ لیکن اس کے دل پر جو سردی چھا گئی تھی رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ اس نے پہلے اپنے دل میں، پھر دماغ میں گرمی کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ وہ بپھر اٹھا۔ خود پر قابو کھو بیٹھا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے عطر فروش لڑکے کے گال پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔ لڑکے کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا اور اس نے اپنی ملامت اور گالیوں کو منھ ہی میں روک لیا۔ وہ اس کی کلائی بھول کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ لیکن اچانک وہ چونکا اور اپنی جگہ سے آگے لپکا۔ وہ اپنا سہ تار تھامے مسجد میں داخل ہو رہا تھا کہ لڑکے نے اس کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا اور اس کی کلائی پھر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔

جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس میں بہت سے لوگ شامل ہو گئے۔ لڑکا اب تک چلا رہا تھا، زور زور سے گالیاں دیتے ہوئے بے دینوں پر لعنتیں بھیج رہا تھا اور خانۂ خدا کی توہین ہونے پر جوش میں آ کر مسلمانوں سے مدد مانگ رہا تھا۔

کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیونکر ہوا۔ خود اس کی بھی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب اس کا سہ تار اپنے لکڑی کے کاسے سمیت زمین پر گرا اور مختصری جھنجھناہٹ کے ساتھ ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہو گیا اور تار مڑ کر ایک دوسرے میں الجھ گئے، وہ اچھل کر ایک طرف کو ہوا اور سکتے میں آ کر ہجوم کو تکنے لگا۔ عطر فروش لڑکا جسے یقین تھا کہ اس نے اپنا دینی فریضہ پورا کر دیا ہے، اب آسودہ خاطر تھا۔

اس نے تہہِ دل سے شکر ادا کیا اور دوبارہ اپنی دکان کے تھڑے پر جا بیٹھا اور پر سکون چہرے کے ساتھ تسبیح پھیرنے میں مشغول ہو گیا۔

سہ تار کے تاروں کی طرح اس کے تمام خیالات بھی ٹوٹے اور الجھے ہوئے تھے۔ اور اس سردی کی تہوں میں جو اس کے دل تک پہنچ چکی تھی اور آہستہ آہستہ دماغ میں بھی سرایت کر رہی تھی، وہ اکڑ کر ایک کونے میں گر پڑا تھا۔ اس کی امید کا پیالہ بھی ساز کے کاسے کی طرح تین ٹکڑے ہو گیا تھا اور یہ ٹکڑے اس کے دل میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔

❋❋

(فارسی عنوان: ''سہ تار'')

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

فالتو عورت

... میں اپنے ابا کے گھر میں کیسے رہ سکتی تھی؟ اس گھر کی دیواریں جیسے میرے دل کو بھینچے ڈالتی تھیں۔ یہ سب ابھی پرسوں کی بات ہے، لیکن ان دو راتوں میں ایک منٹ کے لیے بھی بھلا اپنے ابا کے گھر میں سکون سے رہ سکتی تھی؟ کیا تمھارے خیال میں ذرا دیر کو بھی میری آنکھ لگی ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ صبح تک بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی اور اسی سوچ میں رہی۔ کیا یہ وہی بستر نہ تھا جس پر ہمیشہ سے سوتی چلی آئی تھی؟ نہیں، یہ تو قبر کی طرح تھا۔ میرا دماغ ماؤف تھا۔ صبح تک اسی فکر میں اپنی جان جلاتی رہی۔ ہزار طرح کے برے برے خیالات ذہن میں آتے رہے۔ ہزاروں برے خیال۔ یہ وہی بستر تھا جس میں برسوں سے سوتی آئی تھی۔ گھر بھی وہی گھر تھا جس کے باورچی خانے میں ہر روز چولھا پھونکتی تھی۔ ہر بہار کے موسم میں اس کے باغیچے میں لالہ عباسی کے پھول اگائے تھے۔ اس کے حوض کے پاس بیٹھ کر کتنے ہی برتن دھوئے تھے۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ کب پانی کے نکاس کا راستہ بند ہوتا ہے اور کب پائپوں سے پانی رستا ہے۔ کوئی بھی چیز نہیں بدلی تھی۔ لیکن میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ لگتا تھا میرے لیے ہر چیز بدل گئی ہے۔ ان دو دنوں میں میں نے پانی کا گلاس بھی منھ سے نہیں لگایا۔ بے چاری اماں، اگر میرے رنج سے انھیں فالج نہیں ہوا تو غنیمت جانو۔ ابا کل صبح اٹھ کر پھر قم چلے گئے۔ جب بھی کوئی بری بات پیش آتی ہے، قم چلے جاتے ہیں۔ بھائی دل ہی دل میں کڑھتا رہا اور نہ تو مجھ سے، نہ اپنی بیوی سے اور نہ اماں سے کوئی بات کی۔ آخر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کی سمجھ میں نہ آئے کہ اس تمام عذاب کی وجہ اس کا اپنا وجود

Scanned with CamScanner

ہے؟ کیسے ممکن ہے کہ آدمی خود کو اس گھر میں فالتو محسوس نہ کرے؟ میری سمجھ میں یہ سب کیسے نہ آتا؟ میں اب اور نہیں سہہ سکتی تھی۔ آج صبح جب سب لوگ چائے پی رہے تھے اور بھائی گھر سے نکلا، میں نے بھی چادر لی اور اپنے راستے پر نکل کھڑی ہوئی۔

مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ کہاں جا رہی ہوں۔ بس یونہی گلیوں میں نکل گئی اور دو دن کے اس جہنم سے نجات پائی۔ کچھ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرنا چاہتی ہوں۔ خالہ کے گھر کے سامنے سے گزری۔ سید اسمٰعیل بھی مجھے گلی میں دکھائی دیا۔ لیکن اندر جانے کو میرا دل نہ چاہا۔ نہ خالہ کے گھر نہ سید اسمٰعیل کے۔ کیا فائدہ تھا؟ اسی طرح بازار میں داخل ہو گئی۔ بازار کے شور ہنگامے سے کچھ ہوش آیا اور سوچنا شروع کیا۔ جوں جوں سوچتی جاتی تھی احساس ہوتا جاتا تھا کہ اب ابا کے گھر واپس نہیں جا سکتی۔ اتنی بے آبروئی اور ذلت کے بعد! چونتیس برس ان کا دیا کھانے اور ان کے گھر میں سر چھپانے کے بعد! میں اسی طرح چلتی اور سوچتی رہی۔ آخر آدمی پاگل کیسے ہو جاتا ہے؟ کس طرح پانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے؟ یا افیون کھا لیتا ہے؟ خدا وہ دن نہ دکھائے۔

لیکن تمھیں کیا معلوم کہ کل رات اور اس سے پچھلی رات مجھ پر کیا بیتی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ ہر رات میں دس مرتبہ باہر صحن میں نکلی، دس بار چھت پر گئی۔ اور کس قدر روئی ہوں! خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن تسکین کہاں! رونے سے بھی سکون نہ ملتا تھا۔ آدمی ایسی باتیں کس سے کہہ سکتا ہے؟ اور اگر کسی سے نہ کہو تو دل پھٹا جاتا ہے۔ آخر یہ بات کس طرح برداشت ہو کہ ابا کے گھر میں چونتیس برس رہنے کے بعد، چالیس دن کے اندر اندر مجھے دوبارہ ان کے در پر پھینک دیا گیا! اب جب لوگ یہ باتیں کر ہی رہے ہیں تو میں خود کیوں نہ کہوں؟ اور پھر اے خدا، تو خود گواہ ہے کہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔ آخر کیا قصور تھا میرا؟ کبھی ایک جوڑی موزے بھی اپنے لیے بلا سبب خریدنے کی فرمائش نہیں کی۔ اُسے خود اچھی طرح معلوم تھا۔ جانتا تھا کہ میری عمر کیا ہے۔ ایک بار میرا چہرہ بھی دیکھ چکا تھا۔ ابا نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ایک بار دیکھنا حلال ہے۔ اسے میرے سر کے بالوں کا بھی اچھی طرح پتا تھا۔ اور وہ خود کون سا پھولوں کا دستہ تھا! لنگڑا، بدشکل، کھڑبڑی داڑھی والا۔ بڑی ساری ناک پر موٹی، لوہے کی کمانیوں والی عینک چڑھائے۔ اے خدا، اگر تو اسے معاف بھی کر دے تو میں معاف کرنے والی نہیں۔ آخر میں نے اس پر فدا ہونے کی دستاویز تو لکھ کر دی نہیں تھی۔ ہر چیز اسے خود پہلے سے معلوم تھی۔ پھر میرے سر پر یہ بلا کیوں لایا؟ مجھے اس ذلت

Scanned with CamScanner

میں کیوں ڈالا؟ اے خدا، اسے معاف مت کرنا۔ یہ لعنتی شخص چار بار ابا کے پاس آیا اور زبردستی خود کو ہمارے سر منڈھ دیا۔ خدا اس پر لعنت کرے۔ وہی اس مصیبت کا باعث اور بانی ہے۔

اس نے دفتر میں میرے بھائی سے میرے وصف سنے تھے۔ باقی سب کچھ اس نے خود کیا۔ جمعے کے دن ابا کے پاس آیا اور ان کی خوشامدیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ طے ہوا کہ اگلے جمعے کو وہ آ کر مجھے ایک نظر دیکھے گا۔ اے خدا، تو میرا گواہ ہے! اب بھی جب اُس وقت کا خیال آتا ہے تو میرا بدن لرزنے لگتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے اس کے لنگڑے پیر کی آہٹ اور اینٹوں پر لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میرا دل سینے سے باہر جا پڑے گا۔ جیسے اس کی لاٹھی کی نوک میرے دل میں چبھی جا رہی ہو۔ ہائے، تم کیا جانو میری کیا حالت ہو رہی تھی! اوپر آتے ہی وہ سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ یہ میرے بھائی کا کمرہ تھا جو ہمارے مہمان خانے کا بھی کام دیتا تھا۔ بھائی کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس کے بعد مجھے پانی لانے کے لیے آواز دی اور خود سگریٹ لانے کے بہانے باہر آ گیا۔

میں نے شربت تیار کر رکھا تھا۔ چادر سر پر ڈالی اور شربت سینی میں سجا کر اندر آ گئی۔ میرا اور اماں کا کمرہ بھائی کے کمرے کے برابر میں تھا۔ اماں نے میری دلداری کی۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ میرا رنگ کیسا اڑا جا رہا ہے۔ جب تک میں مہمان خانے کے دروازے تک پہنچی، یوں لگا جیسے میری آدھی عمر گزر گئی ہو۔ فاصلہ چار قدم سے زیادہ نہ تھا، لیکن مجھے زندگی بھر سے زیادہ طویل محسوس ہوا۔ ابا گھر پر نہ تھے۔ بھائی بھی نیچے اپنی بیوی کے پاس سگریٹ لینے چلا گیا تھا اور اماں کمرے کے در میں کھڑی آہستہ آواز میں مجھ سے کہہ رہی تھیں، ''جاؤ بیٹی جان، خدا سے امید لگا کر جاؤ۔'' لیکن میرے پاؤں بھلا اٹھتے تھے! دروازے کے پاس پہنچتے پہنچتے طاقت جواب دے گئی۔ سینی ہاتھ میں یوں لرز رہی تھی کہ آدھا شربت گلاس سے چھلک گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ واپس آ کر گلاس دوبارہ بھروں یا اسی طرح لے جاؤں؟ میرے بالوں کی جڑوں میں پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ دل لگتا تھا سینے کے باہر جا پڑے گا۔ خدایا، اگر اس نے مجھے پکار نہ لیا ہوتا تو میں کیا کرتی؟

اسی طرح پیروں کو ایک دوسرے سے جوڑے کھڑی تھی کہ اس کی آواز سنائی دی۔ لعنتی شخص اونچی آواز میں بولا، ''خانم، اگر آپ کو شرم آ رہی ہے تو بندہ خود آپ کی خدمت میں آ جائے!'' اے خدا،

Scanned with CamScanner

تو خود میرا گواہ ہے! اس کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ مجھے اس کے لنگڑے پیر کے قالین پر گھسٹنے کی آواز سنائی دی اور اس نے آکر دروازہ کھول دیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ اس لمحے کی یاد آنے پر اب بھی میری کلائی یوں سلگ اٹھتی ہے جیسے اس کے گرد آتشیں کڑا ڈال دیا گیا ہو۔ سینی اس نے میرے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دی۔ کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود میرے روبرو بیٹھ گیا۔ میں سوچنے لگی کہ شاید سر سے چادر بھی اتار دے گا۔ مگر نہیں، اتنی بے حیائی اس نے نہیں کی۔

خدا اسے معاف نہ کرے! چادر اسی طرح میرے سر پر تھی۔ اور جس وقت میں کرسی پر بیٹھی، مجھے یاد ہے کہ میں نے چادر کو سینے پر پھیلا لیا لیکن سر، چہرہ، گلا اور گردن دکھائی دے رہے تھے۔ چہرہ سلگ اٹھا تھا اور معلوم نہیں کیسی حالت ہو رہی تھی جب اس نے پھر بات شروع کی اور بولا، ''خانم، خدا نے خود اجازت دی ہے۔'' یہ کہہ کر اٹھا، میری کرسی کے گرد چکر لگایا اور پھر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ اس نے کیوں کیا۔ میں اور بھی زیادہ جلنے لگی اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے تاکہ وہ مجھے گونگا نہ سمجھے۔ بہت سوچا لیکن کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔ آخر مجھ جیسی کسی لڑکی کے لیے جس نے چونتیس برس اپنے باپ کے گھر میں گزار دیے ہوں، بھائی کے سوا کسی کو نہ دیکھا ہو، باقی تمام مردوں سے چہرہ چھپایا ہو اور غیر عورتوں تک سے حمام یا بازار کے سوا کبھی بات نہ کی ہو، کیونکر ممکن تھا کہ غیر مرد سامنے بیٹھا ہو اور اس کے حواس گم نہ ہو جائیں! میں آج کل کی اسکول پڑھی ہوئی خانہ بدوش لڑکیوں کی طرح تو تھی نہیں کہ ہزار مردوں سے تر و خشک کر چکی ہوں۔ اور غیر مرد بھی وہ جو میرا رشتہ لے کر آیا تھا۔ میں بالکل گونگی ہو کر رہ گئی تھی۔ خود کو کتنا ہی مجبور کیا لیکن ایک لفظ بھی منھ سے نہ نکال سکی۔ لیکن اچانک خدا نے میری مدد کی۔ میں میز پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی کہ مجھے شربت کا خیال آیا۔ آہستہ آواز میں بولی، ''شربت گرم ہوا جا رہا ہے، آقا۔'' لیکن آقا کا لفظ ٹھیک سے نہ بول سکی۔ گلے میں کوئی چیز اٹکنے لگی اور میں اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ جب اس کا ہاتھ شربت کے گلاس کی طرف بڑھا تو میں نے ذرا اور جرأت کر کے کہا، ''آقا، سگریٹ پئیں گے؟'' اور یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ہائے، کیسی بری حالت ہو رہی تھی! اگر بھائی گھر میں موجود نہ ہوا اور مجھے اس کے لیے سگریٹ لے کر خود جانا پڑا تو؟ لیکن خدا اس کی جوانی کو سلامت رکھے، کیسا نازنین بھائی ہے! اگر وہ بھی نہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟ جب اس نے مجھے بدحواسی میں سیڑھیاں اترتے دیکھا تو بولا، ''بہن، کیا ہوا؟ آخر ہوا کیا؟ ارے شادی کیا سب کی نہیں

ہوتی؟'' وہ اس کے لیے سگریٹ لے کر اوپر چلا گیا۔ اور بس، یوں کام پورا ہو گیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ میں نے اسے دیکھا اور اس نے مجھے۔ خدا گواہ ہے کہ جتنی دیر میں کمرے میں رہی، یہی چاہتی رہی کہ کسی طرح اسے معلوم ہو جائے کہ میرے سر کے بال مصنوعی ہیں۔ لیکن یہ بات بھلا میں خود سے کیسے کہتی؟ وہی ایک آدھ جملہ کہنے میں جان لبوں پر آ گئی تھی۔ بعد میں جب حواس بحال ہوئے تو میں نے اماں کو یہ بات بتائی۔ وہ کہنے لگیں، ''بیٹی، کوئی بات نہیں۔ تمھارا بھائی سب سنبھال لے گا۔'' مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ بات فوراً اسے نہ بتائی گئی تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ شادی کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسے پتا نہ چلے کہ مصنوعی بال ہیں۔ جب آگے چل کر اسے پتا چلنا ہی ہے تو پہلے سے ہی کیوں نہ بتا دیا جائے؟ میں جانتی تھی کہ یہ بات اسے وہاں پہنچ کر معلوم ہوئی تو چار دن میں مجھے نکال باہر کرے گا۔ اور دیکھ لو اب اس نے کیا کیا! اور ذرا بتاؤ میں اس بات سے کیسی دہشت میں رہتی تھی۔ خدایا، اگر تو اسے معاف بھی کر دے تو میں نہیں معاف کرنے والی۔ آخر میں نے کیا قصور کیا تھا؟ اسے کون سا دھوکا دیا تھا کہ اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا؟ میں سال بھر انتظار کرنے اور اس کی ماں اور بہن کی خدمت کرنے کو تیار تھی۔ لیکن وہ مجھے رکھنے کو تیار نہ ہوا۔ جانتی ہوں لوگ بیٹھے باتیں بناتے ہیں کہ چالیس دن کے اندر اندر شوہر نے باپ کے گھر واپس بھجوا دیا۔ اگر سال بھر اس کے گھر میں رہ جاتی تو بھی بڑی بات ہوتی۔ یہ گمان مت کرنا کہ کہیں مجھے اس سے الفت ہو گئی تھی۔ بخدا، ہرگز نہیں! اس لنگڑی ٹانگ والے بدشکل سے، ہرگز نہیں! لیکن ممکن ہے کہ میرے پیٹ میں بچہ آ گیا ہوتا اور سال بھر میں پیدا ہو جاتا۔ میں اس سب پر راضی تھی، کہ اب مجھے ابا کے گھر کی روٹیاں نہیں توڑنی پڑیں گی۔ میں تھک گئی تھی۔ چونتیس برس تک ہر صبح اسی گھر میں جاگنا اور ہر رات اسی گھر میں سونا۔ اور گھر بھی کیسا! برسوں خالی گزر گئے کہ کوئی نئی بات، کسی کا آنا جانا، کوئی شادی، اور میرے منھ میں خاک کوئی غمی تک نہیں ہوئی تھی۔ بھائی کی شادی کے بعد جب اس نے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا، تب صرف ان راتوں میں ہمارے گھر میں کچھ چہل پہل ہوتی جب پانی لایا جاتا۔ مگر یہ بھی مہینے میں ایک بار سے زیادہ نہ ہوتا۔ گلی محلے والوں نے کبھی کھانے کی رکابی تک نہیں بھیجی۔ تم کیا جانو میں کیا کہہ رہی ہوں۔ یہ بات نہیں کہ ابا کا گھر برا تھا۔ ہائے، نہیں! بے چارے ابا! لیکن بس میں تھک چکی تھی۔ کیا کرتی، بری طرح تھک گئی تھی۔ مثلاً یہ چاہتی تھی کہ اپنے گھر کی مالکن بنوں۔

Scanned with CamScanner

گھر کی مالکن! لیکن اس کے گھر کی مالکن تو اس کی ماں اور بہن تھیں۔ میں تو اس پر بھی تیار تھی کہ ان دونوں کی خدمت کروں اور ایک سال گزار دوں۔ لیکن وہ تیار نہ تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کیوں اس نے میرا آدھے سے زیادہ مہر نقد ادا کر دیا تھا۔ ساڑھے سات سو تومان مہر باندھا تھا۔ اس میں سے پانچ سو تومان نقد دے دیے۔ اس سے ہم نے گھر کا سامان خریدا اور اماں نے میرے جہیز کا کچھ بندوبست کیا۔ لیکن ڈھائی سو تومان اب بھی اس کے ذمے نکلتے تھے جب اس نے مجھے ابا کے گھر واپس بھجوا دیا۔ کہتا تھا میری عدت پوری ہونے پر دے دے گا۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ میں کس قدر گدھی تھی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان کوئی تکرار ہوئی، جھگڑا ہوا؟ یا میں نے کوئی بلا بدتر منہ سے نکالی کہ اس کے بدلے میں وہ مجھ پر یہ مصیبت لایا؟ حاشا و للہ! ان چالیس دنوں میں ایک بار بھی میری آواز کمرے سے باہر نہ گئی۔ نہ میری اور نہ اس بدشکل پدر سوختہ کی! لیکن جب مجھے اندازہ ہوا کہ اب ساس کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی تو میرا دل لرزنے لگا۔ جانتے ہو؟ بعض چیزوں کا آدمی کو احساس ہو جاتا ہے۔

مجھے نظر آ رہا تھا کہ جنجال برپا ہوگا اور ناچار میں بہت احتیاط سے کام لیتی تھی۔ یقین کرو، میں محض ایک کھوٹا سکہ تھی۔ نوکرانی سے بھی ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ چونتیس برس میں نے ابا کے گھر میں عزت واحترام سے گزارے تھے اور اب میری حیثیت نوکرانی کی ہوگئی جو اس کی ماں اور بہن کی خدمت پر مامور تھی۔ لیکن میں نے کوئی شکایت نہ کی۔ ہر چیز پر راضی رہی۔ ہماری شادی تک میں نہیں آئیں۔ یہی، اس کی ماں اور بہن کو کہہ رہی ہوں۔ انھیں دعوت دی گئی، پھر بھی نہیں آئیں۔ اور پھر سارا کام بگاڑ دیا۔ میرا شوہر خود کہتا تھا کہ ان کو میرے کام سے کچھ کام نہیں ہے۔ مگر جھوٹ کہتا تھا۔ ہوا کیا؟ ماں آدمی کو دودھ پلاتی ہے، پھر اس کے کام سے کام کیوں نہ رکھے گی؟ آخر کار خدا گواہ ہے، انھی دونوں نے اس کے سامنے میری حیثیت کھوٹے سکے کی کر ڈالی۔ ہماری شادی کی تقریب بہت مختصر تھی۔ نکاح اور رخصتی سب کچھ ایک ساتھ ہوا۔ بھائی میرا جہیز وغیرہ پہلے سے لے گیا تھا اور پورا گھر ٹھیک کر آیا تھا۔ اور گھر ہی کیا تھا، فقط دو کمرے۔ میرے جہیز سے ایک کمرہ درست کیا گیا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور رخصت کر دیا۔

ہائے! ذرا دل نہیں کرتا اس رات کو یاد کرنے کو۔ خدا ایسا وقت نہ دکھائے! خوشی اتنی مختصر ثابت

Scanned with CamScanner

ہوئی۔ فقط اتنا یاد ہے کہ نکاح ہوتے ہی اس نے آ کر میرے چہرے کو چوما اور میں نے آئینے میں اس کی عینک دار شکل دیکھی۔ میرے کان میں بولا، ''جانم، تمھارے لیے میں نے مصنوعی بالوں کی بڑی خوبصورت وگ بنوائی ہے۔'' تم جان نہیں سکتے کہ میری کیا حالت ہوئی۔ یقیناً مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اس کو اصلیت کا پتا چل گیا ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں اور وہ مجھے اس عیب سمیت قبول کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اس کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے سر میں کسی نے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ دل چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر عینک کے پیچھے سے اس کی اُبلی ہوئی آنکھ نکال ڈالوں۔ بدشکل پدر سوختہ! کیسا منحوس وقت تھا جب اس شادی نے مجھے بدبختی میں ڈالا۔ الٰہی، اسے عمر بھر خیر نصیب نہ ہو! کھانے کا ایک نوالہ تک میرے گلے سے نہ اترا۔ دل خون ہوا جا رہا تھا۔ اگر باہر گلی میں چلتے ہوئے اس نے وہ بات نہ کہی ہوتی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری حالت ایسی تھی کہ قابو سے باہر۔ لیکن خدا نے مدد کی۔

جب ہم اس کے گھر جا رہے تھے، گلی کے بیچ میں پہنچ کر میرے کان میں کہنے لگا، ''چاہتا ہوں کہ میری ماں اور بہن کو پتا نہ چلے۔ معلوم ہے کیوں؟'' مجھے بے اختیار خواہش ہوئی کہ اس کا منھ چوم لوں۔ لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ میرے دل میں جتنا بغض اور کینہ جمع تھا سب پانی بن کر بہہ گیا۔ یوں لگا جیسے اس ایک جملے نے میرے دل میں جگہ بنالی۔ خدا اسے غارت کرے! اب مجھے خود سے خجالت ہوتی ہے کہ اس کی باتوں میں آ گئی۔ کس قدر خوش ہوئی تھی اس کی بات سن کر۔ لیکن اسی وقت مجھے کھٹکا سا بھی ہو گیا تھا۔ مگر میں نے اسے دبا دیا۔ جب شوہر خوش ہو تو کیسے کوئی دل میں بری بات لائے؟ میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن اسی رات کی صبح سے سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی رات میں اس کی ماں کی دست بوسی کے لیے گئی۔ اس نے خود کہا تھا کہ ماں سے شادی میں نہ آنے کا گلہ کروں۔ میں نے ہاتھ چومتے ہوئے گلہ کیا۔ لیکن شاباش ہے اس عورت کو، اپنے بیٹے اور اس کی نئی دلہن کے منھ پر یہ بات کہتے ہوئے ذرا حیا نہ آئی کہ ''مجھے ایسی شادی میں شریک ہونے کا کوئی شوق نہیں جو میری مرضی کے بغیر طے کی گئی ہو۔ سمجھ میں آیا؟ اور اس عورت کو آئندہ میرے کمرے میں مت لانا۔'' بالکل اسی طرح۔ خدا کرے اسی طرح کھڑے کھڑے مر جائے! دیکھا تم نے؟

اس پہلی رات ہی سے میرا کام بگڑ گیا۔ بوڑھی کتیا! لیکن وہ اتنا مہربان ہوا اور میرے اتنے

ناز اٹھائے کہ میں نے یہ سب کچھ دل سے نکال پھینکا۔ وہ رات کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ بعد کی راتیں بھی کسی نہ کسی گزرتی رہیں۔ مشکل کام تو دن کا گزارنا تھا جب شوہر گھر میں نہ ہوتا اور مجھے ان دونوں چڑیلوں کے ساتھ اکیلے رہنا پڑتا۔ وہ رجسٹرار کے دفتر میں ملازم تھا۔ ہر روز دوپہر کو اس کے لوٹنے تک اور سہ پہر سے مغرب کے وقت اس کے دوبارہ گھر آنے تک مجھے جہنم کا سامنا رہتا۔ میں ان کے کمرے کی طرف بھول کر بھی نہ جاتی تھی۔ اکیلے سب کام کرتی رہتی اور یہاں تک کہ اپنے کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ اپنے دونوں کمروں کی خود صفائی ستھرائی کرتی۔ پورے صحن میں جھاڑو دیتی۔ برتن دھوتی۔ اس نے پابندی لگا رکھی تھی کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔ اور میں ایسی احمق کہ اس کی بات مان گئی۔ لیکن ایک ہفتہ گزرا تو میرے بہت اصرار کرنے پر دو ہفتے میں ایک بار، جمعے کی رات کو دونوں میرے ابا کے گھر جاتے، رات کا کھانا کھا کر سونے کے لیے گھر لوٹ آتے۔ بعد میں ہر ہفتے جانے لگے۔

لیکن دن کے وقت میں گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ باہر کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا، سوائے ہفتے میں ایک بار حمام جانے کے جو واجب تھا۔ صبح کے وقت وہ جو کچھ چاہیے ہوتا خرید کر دے جاتا۔ ہمارا خرچ سوا تھا۔ ہمارے لیے الگ اور اپنی ماں اور بہن کے لیے الگ گوشت، سبزی اور دوسری چیزیں خریدتا اور گھر میں دے کر جاتا۔ دوپہر تک میں اسی خیال سے خوش رہتی کہ خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹے گا۔ شام کو جب دوبارہ گھر لوٹتا تو سیدھا اپنی ماں اور بہن کے کمرے کا رخ کرتا، ان کا حال پوچھتا، کبھی وہ چائے بنا رہی ہوتیں تو ان کے ساتھ ایک پیالی پی کر پھر میرے پاس آتا۔ بری بات یہ تھی کہ گھر اس کی ماں کا تھا۔ دوسرے ہی ہفتے مجھے مجبور کر دیا گیا کہ ان کے برتن بھی دھویا کروں۔ میں اس پر بھی راضی ہو گئی، اگر دیوار کی آواز نکلتی ہے تو میری بھی نکلتی ہو گی۔ لیکن ان کی زبان کون روک سکتا تھا! جب میرا شوہر موجود نہ ہوتا تو ہزار طعنے تشنے دیتیں۔ آ کر میرے کمرے کے در میں کھڑی ہو جاتیں اور طنز کرنے لگتیں کہ میرے بال مصنوعی ہیں اور شکل پر داغ ہیں اور چالیس سال کی عمر ہے۔ جیسے اس کا بیٹا بڑا پری زاد تھا! آخر اسی مصنوعی بالوں والی بات نے سارا کام بگاڑا۔ یہ بات ان سے چھپی بھی کیسے رہ سکتی تھی؟ اس ڈر سے کہ کہیں انھیں پتا نہ چل جائے میں اپنے محلے کے حمام میں جاتی تھی۔ لیکن ایک دن اس کی ماں نے آ کر حمام کی مالش کرنے والی سے پوچھ لیا۔ اور وہ بھی کس دھوکے سے! خود کو مجھ سے ناآشنا

ظاہر کیا اور میرے شوہر سے ہمدردی کرنے لگیں کہ کیسے ایک داغدار چہرے والی بڑھیا کو بیاہ لایا۔ اور اس مالش کرنے والی پر خدا لعنت کرے! شاید انھوں نے اسے پانچ قران بخشش دی اور اس نے سب کچھ کھول کر رکھ دیا۔ میرے مصنوعی بالوں والی بات بھی بتادی اور میرا مذاق بھی اڑایا۔

خدا انھیں ہرگز معاف نہ کرے! میں نے آخر ان کا کیا بگاڑا تھا؟ میری خاک میں ملی خوش بختی اور میرے نصیب میں آنے والے اس بدشکل شوہر نے ان کی زندگی کو کیا تنگ کیا تھا؟ انھیں آخر مجھ سے کیا جلن تھی؟ خدا جانے کیا کیا باتیں کیں اس مالش والی نے۔ بعد میں حمام کی ایک ملازمہ نے مجھے سارا حال بتایا۔ مالش والی نے یہ تک کہہ سنایا تھا کہ کس طرح میں اپنے مصنوعی بالوں کی وگ اتار کر زانو پر رکھ لیتی ہوں اور کس طرح اسے صابن سے دھوتی اور اس میں کنگھی کرتی ہوں۔ میں نے اس حمام میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن منھ سے کوئی بات نہ نکالی۔ سر اور تن خود دھونے لگی، لیکن پھر اُس جگہ قدم نہ رکھا۔ ایسے لوگوں سے کوئی کیسے آنکھ ملا سکتا ہے؟ لیکن اب کیا بھی کیا جاتا؟ جو انھیں نہیں جاننا چاہیے تھا اسے وہ جان چکی تھیں۔

اس کے بعد میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ دو تین شاموں کو جب شوہر گھر لوٹا تو ان دونوں کے کمرے میں زیادہ دیر تک رکا رہا۔ ایک رات تو کھانا کھا کر وہاں سے نکلا۔ میں نے پھر بھی منھ سے کچھ نہ کہا۔ میں بھی کیسی گدھی تھی! بالکل جیسے مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ جیسے میں نے سر کے بالوں کے معاملے میں اس کے ساتھ دھوکا کیا ہو۔ میں سے اس سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر کے دونوں گھروں کے سودا سلف کا حساب کتاب ایک کر دیا اور دوپہر اور رات کا کھانا ان کے کمرے میں جا کر کھانے لگا۔ میرے گلے سے نوالہ نیچے نہ اترتا۔ خدایا، میں کس قدر احمق تھی! مجھ پر اتنی مصیبتیں لادی گئیں اور میرے منھ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ مجھے کیوں کسی بات کا خیال تک نہ آیا؟ آخر کیوں؟ میں نے اسے مجبور کیوں نہ کیا کہ اپنی ماں اور بہن سے الگ ہو جائے؟ میں تو کسی طویلے میں بھی رہنے کو تیار تھی، لیکن سب سے الگ، تنہا۔

اس نے میرے سر پر خاک ڈال دی۔ میں یونہی سب کچھ سہتی رہی، جو بوجھ ڈالا گیا اٹھاتی رہی۔ سب میرا اپنا قصور تھا۔ چونتیس برس ابا کے گھر میں رہی اور باورچی خانے اور حمام کے سوا کوئی راستہ نہ سیکھا۔ آخر اس چونتیس برس میں میں نے کوئی ہنر کیوں نہ سیکھ لیا؟ لکھنا پڑھنا ہی سیکھ لیتی۔ ہر

Scanned with CamScanner

مہینے کچھ رقم بچا بچا کر قسطوں پر سلائی مشین ہی خرید لیتی اور اپنے کپڑے خود سینے لگتی۔ ہمسایوں کی لڑکیاں موزے بُننے جایا کرتی تھیں۔ سال بھر میں انھوں نے بنائی کی مشین خرید لی اور اپنی روزی خود کمانے لگیں۔ اپنا جہیز خود تیار کر لیا۔ دس قلیوں نے ان کا جہیز اٹھایا۔ بھائی نے کتنا کتنا مجھ سے کہا کہ مجھے لکھنا پڑھنا سکھا دے گا۔ لیکن میں سدا کی نالائق۔ خاک بر سر۔ یہ سب میرا اپنا قصور تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا۔ ان دو دنوں میں میں یہی سوچتی رہی کہ یہ سب برے خیال کیسے اپنے دماغ سے نکالوں۔ چونتیس برس ابا کے گھر کے کونے میں بیٹھی مصنوعی بالوں کا سوگ کرتی رہی۔ اپنی بدصورتی پر کڑھتی رہی۔ شادی نہ ہونے کا غم کرتی رہی۔ باقی سب عورتیں کیا حور پری ہوتی ہیں؟ آخر مصنوعی بالوں والے لوگوں میں کیا عیب ہے؟ کیا میرے ہی چہرے پر داغ ہیں؟ یہ سب میرا اپنا قصور تھا۔ چپ بیٹھی اس کی ماں اور بہن کے طعنے تشنے سنتی رہی۔ میں نے اسے ان دونوں چڑیلوں کے پاس جا کر ان کی بدگوئیاں سننے دیں، اور اس کی نظروں سے گر گئی۔ ایک بار جو نظروں سے گری تو بس گر ہی گئی۔ آخری رات کو جب وہ اپنی ماں کے کمرے سے باہر نکلا تو نہ کپڑے بدلے نہ کچھ اور کیا، کمرے کے در میں کھڑا ہو کر کہنے لگا، ''ابا کے گھر چلنے کو دل نہیں کرتا؟'' میرا دل دھک سے رہ گیا۔

ابھی دو دن پہلے جمعے کی شام ہم دونوں ابا کے گھر گئے تھے اور رات کا کھانا کھا کر لوٹے تھے۔ میں فوراً بھانپ گئی کہ کیا بات ہے۔ بولی، ''جیسی تمھاری خوشی۔'' اس کے سوا کچھ نہ کہا۔ یونہی چپ بیٹھی اس کے موزے رفو کرتی رہی۔ اس نے پھر پوچھا اور میں نے پھر وہی جواب دیا۔ آخر بولا، ''اٹھو، جانم۔ چلتے ہیں۔ چل کر ان لوگوں کا حال پوچھیں۔'' میں گدھی تو ہوں ہی، فوراً امید باندھ لی کہ شاید کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوگی۔ اپنا دستی بقچہ اٹھایا، چادر سر پر اوڑھی اور چل دی۔ راستے میں ہماری کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ میں نے کچھ کہا نہ اس نے۔ رات کا کھانا ابھی نہیں کھایا تھا۔ دیگچی آتشدان میں رکھی تھی۔ کھانے کے وقت اسے اس کی ماں کے کمرے میں لے جایا جاتا اور اکٹھے کھانا کھاتے۔ لیکن دیگچی کو وہیں رکھا چھوڑ کر ہم روانہ ہو گئے۔ میرا دل ایسا بیٹھا جاتا تھا کہ پوچھو مت۔ جیسے جان گئی ہوں کہ وہ مجھ پر کیا مصیبت لانے والا ہے۔ لیکن میں نے اس خیال کو پھر جھٹک دیا۔ ابا کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔

جب وہاں پہنچے، میں دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی اور حالت ویسی ہی ہو رہی تھی جیسی اُس دن مہمان خانے میں تھی اور وہ خود آ کر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا تھا۔ شاید اُس دن سے بھی بدتر حالت تھی۔

سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔ بھائی نے آ کر دروازہ کھولا۔ جیسے ہی میری نظر بھائی پر پڑی، یوں لگا کہ ساری دنیا کے غم بھول گئی۔ یہ بھی بالکل یاد نہ رہا کہ کیا ہو رہا تھا۔ بھائی کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس نے سلام کیا، حال پوچھا اور ہم اندر چلے گئے۔ والان سے بھی گزر گئے۔ بھابی آنگن میں تھی اور اماں اوپر کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں کہ کون آیا ہے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ آنگن کے بیچ میں پہنچ کر اس منحوس نے سب کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہا، ''یہ رہی تمھاری فاطمہ خانم۔ تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔ اب اسے واپس مت بھیجنا۔'' جب تک میری منھ سے چیخ نکلے نکلے کہ ''نہیں، مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں تمھیں نہیں جانے دوں گی!'' وہ اپنی لنگڑی ٹانگ سے لپکتا ہوا والان سے نکل کر باہر گلی میں پہنچ گیا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر گیا۔

میں وہاں کھڑی چیختی رہ گئی، ''یہاں نہیں رہوں گی! تمھیں جانے نہیں دوں گی!'' اور آنسو میرے گالوں پر بہہ رہے تھے اور کسی طرح تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اماں جلدی سے میرے پاس پہنچیں اور مجھے اوپر لے گئیں۔ پوچھتی رہیں کہ آخر ہوا کیا۔ اب میں ان کو کیا بتاتی کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ جھگڑا نہ تکرار نہ کچھ کہنا سننا۔ جب آخر کار میرا رونا تھما تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرا ان لوگوں سے جھگڑا ہوا تھا اور میں نے اسے اور اس کی ماں اور بہن کو گالیاں دی تھیں اور برا بھلا کہا تھا۔ بالکل جھوٹ! بھلا انھیں کیسے بتاتی کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور وہ منحوس پدر سوختہ اتنی آسانی سے ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ ابا کے گھر لایا اور وہاں چھوڑ کر چلتا بنا؟ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ وہ منحوس مرد جا چکا تھا تو بس جا چکا تھا۔ اگلے دن وہ میرے بھائی کے دفتر پہنچا اور اسے بتایا کہ اس نے مجھے طلاق دے دی ہے اور باقی مہر میری عدت کے پورا ہونے پر ادا کر دے گا۔ یہ بھی کہا کہ کسی کو بھیج کر فاطمہ خانم کا سب سامان واپس منگوا لیں۔ دیکھا تم نے؟ اماں بھی جانتی ہیں کہ یہ سب مصیبت اس کی ماں اور بہن کی لائی ہوئی ہے۔

لیکن میں دوبارہ ابا کے گھر کیسے رہنا شروع کر دیتی؟ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ دو دن بھی وہاں اس طرح کاٹے ہیں جیسے قید خانے میں کاٹے ہوں۔ کاش میں قید خانے میں ہوتی! وہاں کم سے کم اماں ابا کو دیکھ دیکھ کر شرمندگی سے زمین میں گڑنا تو نہ ہوتا۔ بھابی کی نظروں سے اس قدر خجالت تو نہ ہوتی۔ اپنے گھر کی دیواریں، جن سے میں اس قدر مانوس تھی، جیسے میرے دل کو بھینچے ڈالتی تھیں۔ چھت کا گنبد جیسے سر پر طوق کی طرح رکھ دیا گیا ہو۔ وہاں میں نے نہ ایک گلاس پانی کا پیا اور نہ ایک نوالہ کھانے کا

Scanned with CamScanner

میرے گلے سے اترا۔ بے چاری اماں! اگر میرے رنج سے مفلوج نہ ہو جائیں تو بھی بڑی بات ہو۔ اور بے چارہ بھائی، نہ جا کر میرا اسامان واپس لانے کا حوصلہ کر سکا، اور نہ کوئی اور چارہ کر پایا۔ وہ نابکار شخص رجسٹرار کے دفتر میں کارندہ ہے اور سب قانونی راستوں سے واقف ہے۔ کچھ بھولا نادان تو ہے نہیں۔ کیا پتا اور کتنوں کے سر پر ایسی بلائیں لایا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ کوئی اور بدبخت مجھ سے زیادہ منحوس اور بدبخت نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی ماں اور بہن کی باتیں سن سن کر دل کٹا جاتا ہے، جو گھر گھر جا کر اس کے لیے رشتہ ڈھونڈھنے میں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن کون پدر سوختہ ان جیسی چڑیلوں کے گھر میں اپنی بیٹی بیاہے گا! سوائے مجھ جیسی خاک بسر کے؟ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپ بیٹھی رہی اور ان منحوسوں نے میری مٹھی بھر کی زندگی بھی مجھ سے چھین لی!

❋❋

(فارسی عنوان: ''زن زیادی'')

Scanned with CamScanner

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

کانچ کا گلدان

بس مسافروں سے بھر گئی اور چل پڑی۔ جو آخری شخص بس میں سوار ہوا وہ اپنے ہاتھ میں کانچ کا ایک قدیم اور قیمتی گلدان تھامے ہوئے تھا اور احتیاط سے اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے، آہستہ آہستہ بس کے پچھلے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چار مسافروں نے اِدھر اُدھر کھسک کر پانچویں کے لیے جگہ بنائی۔

اس کی عمر چالیس سال سے کچھ اوپر رہی ہوگی۔ باعزت کوٹ اور نیا، صاف ستھرا ہیٹ پہنے تھا۔ جس ہاتھ سے اس نے گلدان مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس پر چمڑے کا نیا دستانہ پہن رکھا تھا۔ بس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافروں میں سے دو عورتیں تھیں جو بڑی چادریں اوڑھے آپس میں متواتر کھسر پھسر کیے جا رہی تھیں، ایک بوڑھا، جھکا ہوا اور متفکر آدمی، اور ایک بے پروا، لاابالی سا شخص جس نے نہ کالر والی قمیص پہن رکھی تھی اور نہ ٹائی۔ اس کی قمیص کی آستینیں، جن کے بٹن کب کے غائب ہو چکے تھے، اکڑی ہوئی چمکدار برساتی کی آستینوں میں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے بال اس کی پرانی سی ٹوپی میں سے باہر آ رہے تھے۔ کھچڑی خشخشی داڑھی نے اس کے چہرے کو آنکھوں کے نیچے تک ڈھانپ رکھا تھا۔

جس وقت گلدان والا خوش پوش آدمی سیٹ پر اس کے برابر آ کر بیٹھا، اس شخص کی توجہ مکمل طور پر اس پر مرکوز ہو گئی اور نظریں گلدان پر گویا جم کر رہ گئیں۔

Scanned with CamScanner

گلدان والا آدمی خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے گلدان کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اس کے پائے کو ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اپنے بغیر دستانے والے ہاتھ میں وہ کچھ سکے کھنکھنا رہا تھا۔ اس کا پڑوسی، جو گلدان کا جائزہ لینے میں محو تھا، بے چین دکھائی دیتا تھا۔ اپنا سر کبھی اوپر اٹھاتا کبھی نیچے لاتا، کبھی ترچھا کرتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اس خوشنما اور نازک گلدان کو زیادہ سے زیادہ اچھی طرح دیکھنے کی کوشش میں تھا۔ لگتا تھا اپنی پوری عمر میں پہلی بار حسن سے اس کا سامنا ہوا ہے؛ نہیں، بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ حسن کا احساس اس کو پہلی بار ہوا ہے۔

کانچ کا نہایت نازک گلدان تھا۔ اس کے دونوں پتلے پتلے دستوں پر اس قدر عمدہ نقاشی کی گئی تھی کہ دستے گلدان کے شکم پر بنے نقوش میں گم سے ہو گئے تھے اور مشکل سے دکھائی دیتے تھے۔ کانچ اتنا نازک اور شفاف تھا کہ بس کی کھڑکی سے آتی روشنی سے دمک رہا تھا اور اس پر بنے لرزاں اور متحرک نقوش کا عکس گلدان کے مالک کے دستانہ پہنے ہاتھ پر پڑ رہا تھا۔

برساتی والا شخص اب تک گلدان کے اس حصے کا مکمل جائزہ لے چکا تھا جس کا رخ اس کی طرف تھا، لیکن وہ اتنے پر راضی نہ تھا۔ جب کبھی بس کوئی موڑ کاٹتی اور اس کے جھکولے سے سارے مسافر ایک طرف کو جھول جاتے، وہ اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر گلدان والے آدمی کی طرف تھوڑا اور جھک جاتا، کہ گلدان کے مخالف رخ پر نظر ڈال سکے۔

بہت کوشش کرنے پر بھی وہ مطمئن نہ ہوا۔ آخر دو تین بار خود کو تیار کرنے اور سینہ پھلانے کے بعد، جبکہ گلدان والے آدمی کو اس کی بے چینی کا احساس ہو گیا تھا، بولا:

''جناب، معاف کیجیے گا، کیا میں آپ کے گلدان کو دیکھ سکتا ہوں؟''

''ضرور، شوق سے۔ مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔''

اور گلدان کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کچھ احتیاط سے اپنے پراگندہ حال پڑوسی کی طرف بڑھا کر بولا،

''لیجیے، مگر ذرا...''

لیکن اس نے اسے بات پوری کرنے کی مہلت نہ دی، بولا:

''بسر و چشم، آپ مطمئن رہیے۔ میں پوری احتیاط کروں گا۔''

اس نے گلدان کا قریب سے معائنہ کرنا شروع کیا۔ سامنے سے اور پیچھے سے، اوپر سے اور نیچے

Scanned with CamScanner

سے، یہاں تک کہ اس کے اندر بھی غور سے جھانک کر دیکھا۔ اس تمام وقت گلدان والے آدمی کی نظریں اس کے ہاتھوں پر جمی رہیں۔ اگرچہ وہ خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش میں تھا، لیکن سر کو سامنے کی طرف کیے، ڈرائیور کے سامنے بس کے اوپر کے حصے پر لگی پیتل کی تختی پر لکھی عبارت کو پڑھنے کی کوشش میں بھی کنکھیوں سے گلدان اور اس شخص کے ہاتھوں کی حرکات کو متواتر دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ شخص گلدان کو ہر طرف سے دیکھ لینے کے بعد اب اسے بس کی کھڑکی کے سامنے کر کے اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اس کے سامنے لے آیا اور رنگین نقوش سے چھن کر آتی روشنی کو ہاتھ پر پڑتے اور ہاتھ کے سائے سے مدھم پڑتے نقوش کو دیکھنے لگا۔ گلدان کو کھڑکی کے قریب لانے اور دور لے جانے سے یہ روشنی اور سائے کم زیادہ ہو رہے تھے...

... ایک اور موڑ آیا اور بس نے جھولا لیا۔ مسافر، جو اس جھٹکے کے لیے تیار نہ تھے، جھول کر ایک دوسرے پر گرے۔ اس شخص نے بھی جھٹکا کھایا، اِدھر اُدھر لہرایا اور کوئی دستہ یا سلاخ نہ پا کر جسے تھام کر اپنا توازن برقرار رکھ سکتا، بے اختیار گلدان کے پائے کے نیچے رکھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا... گلدان گرا اور ہلکی آواز کے ساتھ تین ٹکڑے ہو گیا۔

ابھی بس نے پورا موڑ بھی نہ کاٹا تھا کہ گلدان والے آدمی کی چیخ نکلی۔ ''آہ!...'' اس کے سوا وہ کچھ نہ بولا اور سکتے کے سے عالم میں گلدان کے ٹکڑوں کو تکتا رہ گیا۔ اس کے لاابالی پڑوسی نے جھک کر گلدان کے ٹکڑوں کو فرش سے اٹھاتے ہوئے کہا: ''کوئی بات نہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔''

گلدان والا آدمی جس کے حواس اب کچھ بحال ہو چکے تھے، اچانک انار کی طرح پھوٹا اور برافروختہ ہو کر چلانے لگا:

''اور کیا ہونا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں جناب! آخر ہوا کیا؟ گلدان ٹوٹ گیا، بس۔ آپ پر قربان۔ آپ کے سر سے بلا ٹلی۔''

''افوہ! کیسا ڈھیٹ آدمی ہے! کیسا بولے چلا جا رہا ہے!''

''جناب، اپنا احترام برقرار رکھیے۔ بے کار کی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟''

''یہ بے کار کی بات ہے، بدبخت! گلدان دیکھے بغیر کیا تیری بھینگی آنکھیں اندھی ہو جاتیں؟''

Scanned with CamScanner

اب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ اس سیٹ پر بیٹھی عورتوں میں سے ایک اپنے چہرے پر دلسوزی کا تاثر لاتے ہوئے بولی، ''اوہو، کیسا خوبصورت گلدان تھا۔ افسوس! لیکن یہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، سر سے بلا دور ہوئی...''

گلدان والا آدمی عورت کی بات کاٹ کر بولا:

''کیا کہتی ہیں خانم! پورے پچھتر تومان میں خریدا تھا!''

لاابالی شخص پھر بولا، ''اچھا، ٹھیک ہے۔ تو پھر اب کیا کیا جائے؟ کسی کو دے دیجیے، جوڑ دے گا۔''

دوسری عورت اپنی چادر میں سے بولی، ''بہت اچھا، بھائی، مگر تمھارے ہاتھوں کو کیا ہو گیا تھا؟''

لاابالی شخص، جو گلدان والے سے بحث میں مشغول تھا، سر گھمائے بغیر عورت سے بولا، ''بڑی بی، آپ سے کسی نے نہیں کہا کہ اس معاملے میں دخل دیں۔''

''واہ وا! خدا مجھے اس سے دور رکھے! یہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں، بہت ہی ڈھیٹ آدمی ہے! کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے!''

گلدان والے نے جھک کر دستانہ اتارے ہوئے ہاتھ سے گلدان کے ٹکڑوں کو اٹھایا اور چیخ کر بولا، ''میں نے تو انسانیت کا سلوک کیا تھا۔ ہماری قوم کسی قابل ہی نہیں ہے۔ گلدان توڑ کر کہتا ہے، بلا ٹلی۔ سمجھتا ہے اتنا کہہ دینے سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ میں اس سے ایک ایک شاہی نکلوا کر چھوڑوں گا۔ پیسے کو بھوسا سمجھتا ہے کیا! میں گلدان خرید کر لایا، تو نے توڑ ڈالا اور کہتا ہے کسی سے جڑوا لو! ابے گھامڑ، تجھے کیا پتا اینٹیک کسے کہتے ہیں! تجھے تو کسی چیز کو دیکھنا تک نہیں آتا۔ میں ہی احمق تھا کہ تجھ سے انسانوں والا سلوک کیا۔'' اس وقت بس ایک اسٹاپ پر پہنچی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا، ''ذرا بس روکنا۔ قریب ہی تھانہ ہے۔ مجھے اس شخص کے بارے میں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔'' سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولا، ''اسے اترنے مت دینا۔ میں پولیس والے کو بلا کر لاتا ہوں اور بس کے سب مسافروں کو گواہ بناتا ہوں۔'' بس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے وہ مڑا، سب مسافروں سے مخاطب ہو کر اپنی درخواست دہرائی، پھر بس سے اترنے کو دروازے کی طرف بڑھا۔ اترنے سے پہلے ڈرائیور سے ایک بار پھر وعدہ لیا کہ بس نہیں چلائے گا۔ ڈرائیور نے وعدہ کر لیا اور وہ بس سے اتر گیا۔

Scanned with CamScanner

کچھ مسافر اس واقعے کے بارے میں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ دو ایک لوگ صرف تماشا دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ دونوں عورتیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے کھسر پھسر میں مشغول ہو چکی تھیں لیکن کسی کی توجہ ان کی طرف نہ تھی۔ لاابالی شخص خود سے باتیں کر رہا تھا:

''ٹھیک ہے، تو کیا کیا جائے؟ میں نے جان بوجھ کے تو توڑا نہیں۔ بس گرا اور ٹوٹ گیا۔''

ڈرائیور کا شاگرد آوازیں لگا لگا کر مسافروں کو بلا رہا تھا۔ گلدان والا آدمی بس سے بیس قدم دور پہنچ چکا تھا۔ ڈرائیور جو چند لمحے بے حرکت، سوچ میں گم رہا تھا، اچانک چونکا۔ سیٹ پر سنبھل کر بیٹھا، اسٹیئرنگ تھاما، آواز دے کر شاگرد کو بلایا، انجن اسٹارٹ کیا اور بس چلا دی۔

سب مسافروں کے منھ کھلے رہ گئے۔ ڈرائیور کے شاگرد نے اس خاموش احتجاج کے جواب میں، اپنے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا، ''ہم سے کیا واسطہ؟ اگر کسی کا گلدان ٹوٹ گیا تو کیا ہم بے کار کھڑے رہیں؟''

گلدان والا آدمی جو تیزی سے تھانے کی طرف بڑھ رہا تھا، ادھر متوجہ ہوا۔ واپس پلٹا اور دونوں بازو پھیلا کر بس کے سامنے آ گیا لیکن بس ایک طرف گھوم کر تیزی سے آگے نکل گئی۔ وہ چیخ کر بولا:

اوہو، روکو روکو... روکو انھیں... گلدان... بدبخت ڈرائیور... تھانے دار صاحب...''

اس کی حالت دیکھ کر مسافروں کو ہنسی آ گئی۔ تھانے کے سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا۔ لیکن وہ متواتر چلاتا رہا، ''''ارے روکو... پچھتر تومان... وہ گھامڑ آدمی... کانچ کا گلدان... ہائے چلا گیا... گاڑی کا نمبر کیا تھا؟... ارے تھانے دار!''

❊❊

(فارسی عنوان: ''گلدانِ چینی'')

رام کمار

آٹھ کہانیاں

ہندی سے ترجمہ:

عامر انصاری

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

رام کمار، جن کا جنم ۱۹۲۴ء میں شملہ میں ہوا، ہندی کے افسانہ نگار کے مقابلے میں ایک مصور کے طور پر زیادہ جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اقتصادیات میں ایم اے کیا اور پھر پیرس سے مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز مصوروں میں ہوتا ہے، لیکن اس سے فکشن کے میدان میں ان کی کامیابی کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اگرچہ ان کے مقابلے میں ان کے بھائی نرمل ورما کو اس میدان میں زیادہ شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، لیکن رام کمار کے مخصوص اسلوب کی بدولت ان کی تحریروں کو پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ برابر موجود رہا ہے۔

اس سے پیشتر آج کے دو مختلف شماروں میں ان کی دو کہانیاں ''چیری کے پیڑ'' اور ''دیمک'' شائع ہو چکی ہیں۔ اس بار ان کی آٹھ کہانیوں پر مشتمل انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

رام کمار کی تصانیف میں دو ناول گھر بنے گھر ٹوٹے اور دیر سویر، اور کہانیوں کے مجموعے حسنہ بی بی، ایک چہرہ، سمندر، ایک لمبا راستہ، دیمک، اور شملا لیکھ شامل ہیں۔ رام کمار کی ایک اور کتاب یوروپ کے اسکیچ بھی ہے جو ان کے بنائے ہوئے خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان کی اپنی چنی ہوئی دس کہانیوں پر مشتمل انتخاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ موجودہ شمارے میں شامل آٹھ کہانیاں اسی انتخاب میں سے لی گئی ہیں۔ اس انتخاب کے تعارف میں رام کمار لکھتے ہیں:

''چالیس پچاس سال پرانی کہانیوں کے پنے پلٹتے ہوئے وہ دن، وہ حالات، وہ ماحول آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا جب ان کہانیوں کو محسوس کیا تھا اور لکھا تھا۔ لگ بھگ ہر کہانی کسی نہ کسی اصل صورت حال سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی کردار، کوئی نہ کوئی واقعہ میرے اپنے وجود ہی کی اپج ہے۔ تخیل کی بنیاد پر جو حصے جوڑے گئے ہیں وہ بھی اس صورت حال سے ملتے جلتے ہی ہیں۔... کانپور کی گلیوں میں آخری سانسیں لیتی ہوئی سو سال پرانی ایک شکستہ حویلی کی چھت پر بنے چھوٹے سے کمرے میں بتائی ایک لمبی زندگی (''سیلن'')، بنارس کے گھاٹوں پر گھومتی ہوئی ایک کم سن بیوہ عورت کے کانوں میں گونجتا چنڈی داس کا ایک بھجن (''ایک چہرہ'')، شملہ کے بجلی ہاؤس میں بتائے بچپن کی یادوں کی ایک جھلک (''جاڑوں کی پہلی برف'')، ایسی یادوں سے کہانی لکھنے کی تحریک ملتی تھی۔... کہانی کا ڈھانچہ تیار کرنے میں کوئی ایک شہر، ایک بستی، ایک گھر اور لوگ — جن سے میری انفرادی زندگی کی یادیں جڑی ہوئی ہیں — ان کی مدد کے بغیر کہانی لکھی نہیں جا سکتی تھی۔... جن کرداروں، حالات اور ماحول کا میں نے خود تجربہ نہیں کیا ان کا بیان تخیل کے سہارے کرنے کی کوشش کی تو مجھے ایک طرح کا مصنوعی پن، غیر فطری پن دکھائی دیا، جس سے میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی۔ ایک طرح کی سہولت اور فطری بہاؤ جب کہانی لکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے تو مجھے تھوڑی بہت کامیابی دکھائی دینے لگتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

سردیوں کا آسمان

جب بارش ہوتی تھی تو سڑکوں پر جگہ جگہ تالاب سے بن جاتے تھے۔ جہاں کوئی لمبا چوڑا گڑھا ہوتا اور تالاب پھیل جاتا تو آس پاس کے مکانوں میں رہنے والے بچے کاغذ کی کشتیاں بنا کر بہایا کرتے تھے۔ اور جب وہ نہ ہوتے تو کوّوں کی ٹولیاں اپنی گرمی مٹانے کے لیے نہانے چلی آتیں۔ جھک جھک کر اپنے سر بھگو کر وہ پر پھڑپھڑاتے اور کنارے پر آ کر دھما چوکڑی مچاتے۔ کبھی کبھی دیکھا دیکھی منڈیروں پر بیٹھی چڑیوں کا دل بھی للچا اٹھتا اور وہ نیچے اتر آتیں، لیکن کوّوں کی موجودگی میں نڈر ہو کر کلیلیں نہ کر پاتیں۔

راجی اس بارش میں چپکے سے چھت پر آ جاتی اور منھ اوپر اٹھا کر بادلوں کے جھنڈوں کی طرف تکتی ہوئی، بوندوں کی بوچھار میں اپنا چہرہ گیلا کرنے لگتی۔ مٹی پر پانی پڑنے کی سوندھی سی مہک کو وہ اپنی لمبی لمبی سانسوں میں اندر لے جاتی، لیکن پھر بھی اس کی پوری تسکین نہیں ہو پاتی تھی۔ کبھی کبھی اسے ڈر لگنے لگتا کہ اسے بارش میں بھیگتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے، لیکن اگلے ہی لمحے وہ ڈر دور ہو جاتا۔ سردیوں میں ماں کی موت ہو چکی ہے، اور دینا اور جیتو... وہ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔

وہ چھت کی منڈیر پر جھک کر نیچے جھانکنے لگی۔ قریب ہی رہنے والے دھوبیوں کے بچے باہر ننگے کھیل رہے تھے اور سڑک پر گڑھوں میں جمع پانی ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔ تبھی نیچے کی کھڑکی سے دینا کا باہر نکلا ہوا سر دیکھ کر راجی چونک سی گئی۔ وہ چھت پر آ کر کھلے میں بارش میں بھیگتی نہیں، لیکن کھڑکی میں کچھ بوندیں اس کے سر پر ٹپک پڑتیں تو اسے برا نہیں لگتا۔ پچھلے تین برسوں میں وہ دینا کی کتنی

Scanned with CamScanner

ہی عادتوں سے واقف ہو چکی تھی اور اب وہ حیرت اور تجسس نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا۔

بارش رک گئی تو راجی کی چھت پر جانے کی کشش بھی ختم ہو گئی۔ ہوا تیز چلنے لگی تھی جس سے اسے اپنے گیلے کپڑوں میں سردی سی لگنے لگی۔ اوپر بادلوں کی گھنی چادر دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ غسل خانے میں اس نے اپنا سر، منھ ہاتھ پونچھے، کپڑے بدل کر بالوں پر کنگھی کی اور دینا کے پاس سامنے والے کمرے میں آ گئی، جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے، جہاں سردیوں میں جیتو سوتا تھا۔ دینا کھڑکی کے پاس کھڑی کھڑی راجی کی طرف مسکرا کر دیکھتی رہی اور راجی کو لگا جیسے اس کے بارش میں بھیگنے کی بات دینا کو پتا چل گئی ہو اور جان بوجھ کر وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ رہی۔

''کتنے گھنے بادل چھائے ہوئے ہیں، رات کو بھی شاید پانی گرے گا۔'' راجی ایک کونے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر ستانے لگی۔

''ہاں، شاید رات کو بھی پانی گرے گا۔''

''بھیا ابھی تک نہیں لوٹے...''

''کہیں رک گیا ہوگا۔ اسے بارش میں بھیگنے سے ڈر لگتا ہے۔'' دینا کی آواز میں تھوڑی ہنسی بھری ہوئی تھی۔

''مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے۔''

''جیتو آ جائے تو چائے بنوائیں۔ اس سردی میں گرم گرم چائے بہت اچھی لگے گی۔'' ٹیبل لیمپ کی دھندلی روشنی میں کمرے کی ہر چیز ایسی جان پڑ رہی تھی جیسے وہ کسی آؤٹ آف فوکس فوٹو کے حصے ہوں۔

دینا کے چمکتے ہوئے کالے بال گچھے کی شکل میں اس کی پیٹھ پر جھول رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے کھڑکی کا سہارا لیے وہ مورتی کی طرح کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر کبھی کبھی راجی کو لگتا جیسے دینا جیسی حسین عورت دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ اپنے کالج میں بھی وہ کسی سندر لڑکی کو دیکھتی تو دل ہی دل میں دینا کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے لگتی تھی اور ہمیشہ ہی دینا کا پلڑا بھاری رہتا تھا۔

جیتو کے بغیر دینا کو گھر میں سب کچھ ادھورا ادھورا سا لگتا تھا، اسی لیے اس کے واپس لوٹنے کی راہ وہ بہت بے چینی سے دیکھا کرتی تھی۔ ''جیتو ابھی تک نہیں آیا۔''

Scanned with CamScanner

''شاید کوئی دوست مل گیا ہوگا...''

دینا نے ایک غصے بھری نظر راجی پر ڈالی۔ دفتر کے بعد کسی دوست کے ساتھ بیٹھ کر جیتو کا گپیں لڑانا یا چائے پینا یا کبھی سنیما چلے جانا دینا کو قطعی پسند نہیں تھا، حالانکہ جیتو سے ایسا کہنے کا حوصلہ وہ اپنے میں نہیں پاتی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ کچھ مکانوں کے آگے سڑک کے پار جھاڑیاں تھیں، اونچی نیچی، جو شام کے جھٹ پٹے میں واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر دینا کو ایسا گمان ہوتا جیسے مکانوں کے پیچھے دور دور تک پھیلا سمندر ہو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خیال سے اس کا دل غوطے کھانے لگتا اور اسے سانس رک رک کر آنے لگتی۔ کبھی کبھی خواب میں بھی اسے سمندر دکھائی دیتا۔

دینا کے ساتھ اکیلے رہ جانے پر راجی تھوڑی دیر بعد اُوبنے لگتی تھی۔ دینا کے بیاہ سے پہلے ان دونوں میں زیادہ قربت تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنا وقت آسانی سے کاٹ لیتی تھیں۔ دینا کے چلے جانے کے بعد جیتو کے ساتھ اس کا میل جول بڑھ گیا۔ اگرچہ وہ اس سے چار برس بڑا تھا، لیکن راجی کو وہ اپنی عمر کا لگتا۔ ان دونوں میں کبھی کبھی جھگڑا بھی ہو جاتا تھا، لیکن اس میں وہ ایک دوسرے کو اپنے زیادہ قریب پاتے تھے۔ دینا کے لوٹنے پر جیسے سب کچھ بدل گیا۔ دینا کی خاموشی سب پر چھا گئی۔ گو کہ وہ یہ کوشش کرتی تھی کہ گھر کا ماحول ویسا ہی رہے جیسا وہ تین سال پہلے اپنے بیاہ پر چھوڑ کر گئی تھی، لیکن اسے کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ دینا کا بیاہ ایک ایسا واقعہ تھا جو سائے کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا۔

''تیری چھٹیاں کب ہوں گی؟'' دینا نے پوچھا۔

راجی کو چھٹیوں کے ذکر پر اکثر ہنسی آ جاتی تھی۔ چھٹیوں کے پروگرام بنانے میں دینا کو بہت خوشی ہوتی تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ بغیر کسی سبب کے وہ چھٹیوں میں کہیں نہیں جائیں گے — نہ سمندر کے کنارے، نہ کسی پہاڑ پر، نہ راجستھان۔ لیکن چھٹیوں کے منصوبے بنانے کا جیسے اس پر کوئی بھوت چڑھا ہوا ہو۔

''کون سی چھٹیاں؟'' جانتے ہوئے بھی انجان بن کر راجی نے پوچھا۔

''دسہرے کی۔''

''اوہ...'' راجی کو ہنسی آنے لگی۔ ''پہلی اکتوبر سے۔''

Scanned with CamScanner

''اگر جیتو کو بھی دس دن کی چھٹی مل گئی تو کسی پہاڑ پر چلے جائیں گے۔'' راجی نے اپنا اشتیاق دکھایا۔ اس بار سمندر کے بدلے پہاڑوں کی باتیں ہوں گی۔ کس پہاڑ کی کتنی اونچائی ہے، کہیں کوئی ندی یا جھیل ہے یا نہیں، کہاں سے برف سے ڈھکے پہاڑ زیادہ قریب نظر آتے ہیں، کہاں چیڑ کے پیڑ ہیں، کہاں دیودار کے... یہ سب تفصیل سے جاننے کے لیے سارے گھر میں وہ کتابیں تلاش کی جائیں گی جو کسی وقت ایسے ہی موقعے پر خریدی گئی تھیں۔

''نینی تال یا مسوری... پتا نہیں جیتو کو کون سا پہاڑ پسند آئے گا۔''

''پتا نہیں بھیا جائیں گے یا نہیں۔''

''اگر چھٹی مل گئی تو ضرور چلے گا۔''

''نہیں جائیں گے۔''

''راجی...'' دینا نے غصے اور تکلیف سے بھری آواز میں کہا۔

''میں سچ کہتی ہوں۔'' راجی کو بھی غصہ آ گیا۔ ''بھیا کبھی ہمارے ساتھ جانا پسند نہیں کرتے۔''

دینا کا چہرہ دیکھ کر راجی کو زیادہ کچھ اور کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اسے پچھتاوا ہونے لگا کہ کیوں اس نے یہ بات کہی۔ کتنی باتوں کی سچائی جانتے ہوئے بھی دینا اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہتی ہے۔ جو بھی اس کے گمان کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ زور سے اس کی مخالفت کرتی ہے۔

باہر پھر بارش ہونے لگی۔ دھیرے دھیرے، بغیر شور کیے، ہلکی ہلکی بوندیں۔ مکان کے سامنے بجلی کی روشنی میں وہ بوندیں ایسی جان پڑ رہی تھیں جیسے سوت کے پتلے پتلے دھاگے ہوں، جن کی لمبی لمبی ڈوریاں زمین اور آسمان کو آپس میں باندھ رہی ہوں۔ راجی اپنے کورس کی ایک کتاب اٹھا لائی، لیکن پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگا۔ وہ کتاب کھولے سامنے کی طرف تکنے لگی جہاں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کچھ عجیب سی پرچھائیاں بن رہی تھیں۔ تھوڑی اوپر اماں کا فوٹو فریم میں منڈھا ہوا ٹنگا تھا۔ وہ چپ چاپ لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی چارپائی پر پڑی رہتی تھیں۔ جب وہ کالج سے جلدی لوٹ آتی تو کچھ دیر اماں کی چارپائی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اسے بڑی جان کر اماں بہت سی اپنے دل کی باتیں اس کے سامنے کرتی رہتی تھیں۔ دینا سے انھیں ایک طرح کا ڈر سا لگتا تھا۔ دینا اپنے شوہر کو چھوڑ آئی، کیوں؟ یا اس نے دینا کو چھوڑ دیا؟ دینا نے صاف صاف کسی کو نہیں بتلایا۔ سب نے سوچا کہ کچھ

Scanned with CamScanner

دنوں بعد واپس لوٹ جائے گی، لیکن اس نے اسکول میں نوکری کر لی۔ کچھ مہینوں کے بعد سننے میں آیا کہ دینا کے شوہر نے دوسرا بیاہ کرلیا۔ دینا کی باتیں کرتے وقت اماں روتی رہتی تھیں، لیکن دینا کے اسکول سے آتے ہی وہ اپنا چہرہ پرسکون رکھنے کی کوشش کرتیں۔ دینا نرس کی طرح ان کا ٹمپریچر لے کر کاغذ پر لکھتی، دوا کی شیشی میں خوراکیں ناپتی اور اس دن اماں دوا لینے میں کوئی گڑبڑ کر دیتیں تو انھیں دینا سے ایک لمبا لیکچر سننا پڑتا تھا، یا وہ اپنا منھ پھلا کر بغیر ایک بھی لفظ کہے اپنا غصہ ظاہر کیا کرتی تھی جو اماں کو ناقابل برداشت سا جان پڑتا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ دینا کو ان سے سب سے زیادہ پریم ہے، لیکن وہ اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا۔ ان کی موت تک پر اس کی آنکھیں سوکھی ہی رہیں۔

سیڑھیوں پر جوتوں کی آہٹ سن کر دینا نے کن انکھیوں سے راجی کی طرف دیکھا۔ راجی سے نظر ملاتے ہی اس کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ راجی کے اوپر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ دونوں جیتو کے جوتوں کی آواز پہچانتی تھیں۔ کتنے ہی برسوں سے وہ اسے سنتی آ رہی تھیں۔ دینا کو یاد ہے، جب وہ اسکول سے بستہ گلے میں لٹکائے لوٹا کرتا تھا، پھر شام کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیل کر واپس آتا تھا، پھر کالج سے اور پھر دفتر سے۔ بس، تین سال تک جب وہ سسرال رہی تو اس کھٹ پٹ کی آواز سن نہیں پائی۔ شوہر کریپ سول کے جوتے پہنتے تھے جن میں کوئی آواز نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شام کو جب بغیر کوئی لفظ کہے ایکا ایک کمرے میں گھس آتے تو دینا ڈر سی جاتی تھی۔

''بہت دیر لگا دی بھیا...'' راجی نے کہا۔

جیتو کی قمیض کندھوں پر بھیگ گئی تھی اور اس کے چشمے کے شیشوں پر بارش کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ پینٹ بھی گھٹنوں تک گیلی تھی، جس پر کیچڑ کے دھبے پھیل گئے تھے۔

''جلدی سے کپڑے بدل لے،'' دینا بولی، ''بارش ہو رہی تھی تو کہیں رک کیوں نہیں گیا؟''

شام کو گھر واپس لوٹتے ہی جیتو کی کسی سے باتیں کرنے کی طبیعت نہیں کرتی تھی۔ چپ چاپ کچھ دیر تک چارپائی پر لیٹنے کو دل کرتا تھا۔ لیکن ہر شام وہ راجی اور دینا کو اپنے کمرے میں بیٹھا پاتا تھا۔

''میں نوکر سے چائے بنانے کو کہہ دیتی ہوں۔'' دینا کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''میں تو پی آیا ہوں۔''

''ایک پیالہ اور پی لینا؛'' دینا نے کہا۔ جیتو نے ضد نہیں کی۔ چائے پینے کا اس کا دل نہیں تھا،

Scanned with CamScanner

لیکن اس کی مخالفت کرنا اس کے بس کے باہر تھا۔ ایسا ہی تو روز ہوتا تھا۔ ''تو پیے گی راجی؟'' لیکن راجی نے انکار میں اپنی گردن ہلادی۔

جیتو نے الماری کھول کر رات کا پاجامہ اور قمیض نکالے اور انھیں پہننے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ ان دونوں کے سامنے کپڑے بدلنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

''آج رات کو چھت پر نہیں سویا جائے گا، سردی بڑھ گئی ہے،'' راجی نے کہا اور پھر گھٹنوں پر رکھی کتاب پر اپنی نظر جھکالی۔

جیتو دیوار کا سہارا لگا کر آرام سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چائے کے کچھ گھونٹ پی کر اس نے ایک سگریٹ سلگالی۔ اس کمرے میں جب وہ تینوں ہوتے تو تینوں کے بیٹھنے کی جگہیں مقرر تھیں جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ دینا کھڑکی کے پاس رکھی ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی، جیتو چارپائی پر اور راجی چارپائی کے سامنے بینت کی ایک چوڑی سی کرسی پر، جس کی گدی کے نیچے اسپرنگ نہیں تھے۔

''ہم لوگ دسہرے کی چھٹیوں میں کسی پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے...'' راجی نے کتاب پر سے اپنی نظر ہٹا کر کہا۔

''تمھیں کون سا پسند ہے؟ مسوری یا نینی تال؟'' دینا بولی۔

''کبھی کبھی میرا بھی باہر جانے کا بہت دل کرتا ہے،'' جیتو نے فرش پر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوے کہا۔

''تم ابھی سے اپنی چھٹی کی عرضی دے دو جیتو!'' دینا بولی۔

''عرضی دینے سے ہی چھٹی نہیں مل جاتی...''

راجی دینا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ''یہی بات میں بھی دینا سے کہہ رہی تھی کہ تمھیں شاید چھٹی نہ ملے۔''

''تم دونوں اپنی تیاری کر لو۔ مجھے چھٹی مل گئی تو میں بھی چلا چلوں گا نہیں تو تم دونوں ہو آنا۔''

راجی نے کہا، ''گرمیوں میں بھی تمھیں چھٹی نہیں مل سکی تھی اور ہم کہیں نہیں گئے تھے۔''

جیتو کی جھنجھلاہٹ بڑھ گئی۔ کیوں نہیں وہ آزادی سے اپنا پروگرام بناتیں؟ کیوں سدا اس پر انحصار کرتی ہیں؟

Scanned with CamScanner

''تم ایک ہفتے کے لیے دفتر کے کسی کام سے جبلپور چلے گئے تھے۔'' راجی ہنسنے لگی۔ جیتو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور راجی کی ہنسی تیز ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ جیتو نے بہانہ بنایا تھا؛ نہ اسے دفتر کا کوئی کام تھا، نہ وہ جبلپور گیا۔ اس کی جیب میں اس نے شملہ کا ٹکٹ دیکھا تھا۔ وہ ایک ہفتے کے لیے شاید اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ شملہ چلا گیا تھا۔ راجی نے یہ بات دینا کو نہیں بتلائی تھی، نہ ہی جیتو سے کبھی اس کا ذکر کیا تھا۔

دینا کی خاموشی دونوں کو اکھرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی بغیر کسی وجہ کے دینا سنجیدگی کے غلاف میں اپنے آپ کو ڈھک لیتی تھی اور تین چار دنوں تک الگ الگ سی گم سم بنی رہتی تھی۔ جیتو اور راجی، کسی میں بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی وجہ پوچھ سکے۔ کچھ دیر بعد دینا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جیتو مسکراتا ہوا سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر کے قدرتی منظر کو دیکھتا رہا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتا رہا۔

دینا اوپر چھت پر چلی گئی، سیڑھیوں پر آہٹ سن کر راجی نے سوچا۔ جب دونوں اکیلی رہ جاتی تھیں تو کسی چوڑی ندی کے دو کناروں کی طرح ان کی دوری بڑھ جاتی تھی۔ جیتو جیسے بیچ کا پانی تھا— کبھی شانت، کبھی لہروں کا طوفان لیے۔ جب تک وہ تینوں گھر کے باہر اپنی زندگی میں مصروف رہتے تھے تو گھر کا دھیان نہیں آتا تھا۔ لیکن ایک بار اندر آکر ان دیواروں کی حدود میں چاہے اَن چاہے، کم یا زیادہ، ایک دوسرے کا سہارا پانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

کھڑکی سے بارش میں بھیگی ہوا کے جھونکے تیزی سے اندر آرہے تھے۔ جیتو نے راجی پر ایک نظر ڈالی اور اسے کتاب پڑھتے دیکھ کر اس کی موجودگی کو بھول سا گیا۔ کبھی کبھی اسے ایسا لگتا تھا جیسے اب کبھی اس کا بیاہ نہیں ہوگا۔ اس خیال سے اس کے اندر جیسے ایک کھائی سی کھد جاتی ہے اور اس کی گہرائی میں اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ جب تک اماں زندہ تھیں، جیتو کے بیاہ کا ذکر گھر میں کبھی کبھی اٹھا کرتا تھا۔ اپنی برادری میں کچھ گھرانوں سے بات چیت بھی چلی تھی، لیکن کوئی رشتہ پکا نہیں ہو سکا تھا۔ دل ہی دل میں اماں کی خواہش تھی کہ پہلے راجی کا کہیں طے ہو جائے تو پھر بے فکری سے جیتو کے لیے بھی کوشش کی جائے۔ پھر دینا اپنے شوہر کو چھوڑ آئی اور اماں کو ایسا دھکا لگا کہ اس موضوع پر انھوں نے اور کچھ نہیں کہا۔ پھر ان کی بیماری... دینا سے کچھ کہنے کو اس کا جی نہیں کرتا تھا۔

دینا اوپر چھت پر اندھیرے میں بیٹھی تھی۔ راجی کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ جیتو کی طرف دیکھ کر اس کے دل میں پیار کی ایک لہر امڈ آئی۔ گھر لوٹ کر اکثر خالی بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی اخبار اٹھالیا، لیکن پانچ منٹ سے زیادہ دیر تک وہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ پھر جمائی لیتا، کبھی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا، پھر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ راجی دبی دبی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہتی۔

کچھ دنوں بعد رات کے واقعے سے راجی نے محسوس کیا کہ جیسے ان کے گھر کی نیو بہت زور سے ہل اٹھی ہو۔

اس دن سنیچر تھا۔ بارشوں کے ختم ہونے کے بعد شام کو اکثر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اور آسمان صاف نیلے رنگ میں ڈوبا، ساکت اور پرسکون جان پڑتا تھا۔ کسی بادل کے ٹکڑے کی پرچھائیں تک اس کے پھیلاؤ کو نہیں روکتی تھی۔ سات، آٹھ، ساڑھے آٹھ کے گھنٹے بجے اور جیتو کی کوئی آہٹ نہیں ملی تو دینا کی بے صبری بڑھ گئی۔ شام کی چائے پینے کے بعد راجی اوپر چھت پر پڑھنے کے لیے چلی گئی تھی۔ جب سورج ڈوب گیا تب بھی وہ چھت پر بیٹھی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ جیتو ابھی تک نہیں لوٹا ہے، اس لیے نیچے جانے کو اس کا دل نہیں چاہا۔

لیکن جب نیچے آئی تو دینا کے چہرے پر فکر کا تاثر دیکھ کر جھنجھلاہٹ ہی ہوئی۔ دینا نے راجی سے کچھ نہیں کہا، اخبار کھولے اپنی آنکھیں جھکائے رہی، لیکن راجی جانتی تھی کہ اخبار کی ایک بھی سطر سمجھنے کی اس میں طاقت نہیں ہوگی۔ دینا کی کچھ کمزوریوں سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

''کہاں رہ گئے بھیا؟'' راجی کہنے لگی، ''اتنی دیر تو کبھی نہیں لگاتے۔''

دینا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، ایسا ظاہر کیا جیسے اس سوال سے اسے کوئی مطلب نہ ہو۔ اسے چڑانے میں راجی کو مزہ آرہا تھا۔

''ایک چھوٹا سا ریڈیو خرید لو دینا! خالی بیٹھے بیٹھے بھیا کا انتظار کرنا اکھر جاتا ہے۔ ریڈیو سنتے ہوے وقت کا پتا نہیں چلتا۔''

دینا نے سنجیدہ انداز سے راجی کی طرف دیکھا، لیکن اس کی آنکھیں اپنی ہی مشکلوں میں ڈوبی تھیں۔ راجی کا چہرہ اسے واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔

'کہاں رہ گیا جیتو...' وہ سوچ رہی تھی، 'اتنی دیر تو کبھی نہیں کرتا۔ کیا دفتر میں کوئی کام پڑ گیا یا سنیما

Scanned with CamScanner

چلا گیا...'

دس کے گھنٹے بجے تو دونوں ہی چونک گئیں۔ راجی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ میں کھانا کھا لیتی ہوں۔'' اور دینا کا کوئی جواب نہ پا کر وہ رسوئی میں چلی گئی۔

دینا کو لگ رہا تھا جیسے کمرے کے باہر کے اندھیرے نے فتح پالی ہو۔ باہر اندر کہیں کوئی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی مکانوں کی قطار کے پرے پھیلے ہوئے اجاڑ کی طرف خالی پن سے دیکھ رہی تھی۔ وہی سمندر ہے جس کی حد آسمان کو چھوتی ہے، جہاں تارے چمک رہے ہیں۔ سمندر کی یہی تصویر اس کے دل میں ابھری ہوئی تھی۔ اگر حقیقی سمندر کو دکھا کر اس سے کہتا کہ یہ اصلی سمندر ہے تو وہ اس سے انکار کر دیتی۔ کچھ مکان رات میں اپنا وجود کھو بیٹھے تھے، کچھ میں بجلی کی دھندلی روشنیاں کھڑکی کے شیشوں میں سے چمک رہی تھیں۔

کھانا کھا کر راجی لوٹی تو دینا کو اسی طرح کھڑکی کے سامنے کھڑے پایا۔ 'وہ بھیا کی راہ دیکھ رہی ہے جو شاید کبھی نہیں آئے گا،' اس نے سوچا۔ دینا کی چوڑی پیٹھ ساڑھی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ چارپائی پر دھیرے سے بیٹھ گئی، لیکن پرانا بان چرچرا اٹھا۔ دینا نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ راجی کو لگا جیسے جیتو کی غیر موجودگی میں چارپائی پر بیٹھ کر اس نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو۔ وہ اس چارپائی پر سدا جیتو کو بیٹھے دیکھا کرتی تھی۔

''کہیں کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا؟'' دینا دھیرے سے بولی، جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہی ہو۔

راجی سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر کو دیکھنے لگی، جس پر قدرتی منظر بنا ہوا تھا۔ دینا کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کو دیکھ کر اسے ایسا جان پڑتا تھا جیسے ان کا پانی جم کر برف بن گیا ہو جسے توڑ کر گہرائی میں اترنا ممکن نہیں۔

'ضرور ہی کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بغیر کہے جیتو اتنی دیر کبھی نہیں لگاتا۔' دینا کے ہاتھ کانپ رہے تھے، جنھیں راجی سے چھپانے کے لیے اس نے اپنی بغل میں دبا لیا۔ 'کیا کریں۔ بڑے اسپتال میں فون کریں یا تھانے جا کر رپورٹ لکھائیں۔ مجھ سے یہ سب سہا نہیں جاتا...'

لیکن اس کی فکر اپنی انتہا پر پہنچ کر پھر پرسکون ہو گئی۔ وہ اپنی کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے

Scanned with CamScanner

اس طرح پرسکون بیٹھے دیکھ کر راجی کو فکر ہونے لگی۔ دینا کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ جب وہ سسرال سے لوٹی تھی تو اسے فٹ پایا تھا۔ پھر اماں کے زور دینے پر آپریشن ہوا تھا اور پندرہ دن تک اسپتال میں رہی تھی۔ آپریشن کے بعد اتنی دبلی ہوگئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ اب بھی کبھی کبھی بغیر کسی وجہ کے بخار آجاتا تھا— ۱۰۳ یا ۱۰۴ ڈگری۔ لیکن تین دن کے بعد اپنے آپ اتر جاتا تھا۔

آخر کار جب جیتو لوٹا تو راجی یا دینا کسی نے حیرت ظاہر نہیں کی۔ جیسے اس وقت اس کا لوٹنا انتہائی فطری بات ہو۔ وہ اس طرح دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، جیسے اندھیرے میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔ کسی کسی دن وہ بہت تیزی سے زور کی آواز کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھ آتا تھا۔ راجی کو شک ہوا کہ شاید وہ جیتو نہیں ہے، کوئی دوسرا شخص جیتو کا پیغام لے کر آیا ہے۔ لیکن چارپائی سے اٹھ کر برآمدے سے آنے والے کو دیکھ کر اس نے اپنے تجسس کی تسکین نہیں کی۔

کمرے میں گھس کر جیتو ان دونوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ لمحہ بھر کے لیے دیوار کے سہارے بیٹھی ہوئی راجی کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔

''دیر ہوگئی،'' کرسی پر بیٹھ کر جیتو بولا، ''ایک دوست کی شادی کی سالگرہ تھی، وہیں چلا گیا تھا۔''

راجی کو لگا جیسے جیتو کی آنکھیں لال ہوں— اس کے منھ سے لفظ صاف نہیں نکل رہے تھے۔ جوتے اتارتے وقت وہ دو فیتوں کی گرہ آسانی سے کھول نہیں سکا تھا۔ اسے شک ہوا۔ راجی کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر جیتو کو غصہ آگیا۔ 'راجی اندازہ لگا رہی ہے کہ میں شراب پی کر لوٹا ہوں،' اس نے سوچا، اور دل ہی دل میں اسے ہنسی آنے لگی۔

''تم نے کھانا کھالیا نا؟ میں تو کھا آیا ہوں۔''

دینا کا چہرہ اسی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ جیتو کو ایک بار دیکھ کر اس نے گود میں پچھلے اخبار پر اپنی نظریں جھکالی تھیں۔ اخبار تینوں میں سے کوئی نہیں پڑھتا تھا، لیکن اتنے لمبے چوڑے کاغذ پر جھک کر وہ اپنی حقیقی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔

''دینا نے ابھی تک نہیں کھایا۔ وہ تمھارے لوٹنے کی راہ دیکھ رہی تھی،'' راجی بولی۔

جیتو کو غصہ آگیا۔ ''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ میرے کھانے کا کوئی انتظار نہ کیا کرے...'' اس نے دینا کے جھکے چہرے پر ایک نظر ڈالی، لیکن وہ اپنے دل کی بات کہہ ڈالنا چاہتا تھا۔ ''دفتر میں نوکری

Scanned with CamScanner

ہے تو وقت کی پابندی نبھانی پڑتی ہے۔ پھر گھر میں بھی وہی بندھن رہے تو... تو جیل خانہ...''
راجی نے محسوس کیا جیسے اس کا شک صحیح ہو۔ تبھی وہ اپنے جملے کو پورا نہیں کر سکا۔ ایک گہری بیزاری کا سا احساس اس کے دل میں سما گیا۔

اچانک دینا بہت زور سے رو پڑی اور اس نے اپنی ساڑھی کے پلّو سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔ کمرے میں ایک بھیانک سناٹا چھایا رہا۔ جیتو کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے اپنا گناہ قبول کرنے کے لیے تیار ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی اس کمزوری کو دبا لیا۔ راجی اسی طرح بے دلی کا تاثر لیے بیٹھی رہی۔ اسے ان دونوں میں سے کسی کے بھی ساتھ ہمدردی نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید ایک دن جب تینوں گھر سے باہر نکلیں گے تو واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے، اپنی اپنی سمتوں میں آگے بڑھ جائیں گے، وہ گھر خالی کا خالی رہ جائے گا۔

اس کے بعد تین دن تک دینا اپنے اسکول پڑھانے نہیں گئی۔ بیمار ہونے کا بہانہ کر کے چارپائی پر لیٹی رہی۔ اگرچہ بخار اسے نہیں آیا، لیکن منھ اتنا پیلا پڑ گیا تھا کہ جیسے کسی لمبی بیماری کے بعد اٹھی ہو۔ کسی سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کے اس برتاؤ سے جیتو اور راجی دونوں کو ہی فکر ہوئی۔ لیکن اس موضوع پر آپس میں وہ کوئی بات نہیں کر سکے۔ گھر میں مکمل خاموشی چھائی رہتی۔ دفتر سے لوٹ کر جیتو اپنے کمرے میں بیٹھا رہتا، دینا دوسرے کمرے میں رہتی، راجی اوبی اوبی سی چھت پر ٹہلا کرتی۔ کبھی ماں کی یاد آجاتی تو بے اختیار اس کی آنکھیں گیلی ہو جاتی تھیں۔

اس واقعے کے بعد جیتو گھر کے بندھنوں سے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ شام کو وہ اکثر دیر سے گھر لوٹتا۔ کوئی دوست ساتھ نہ ہوتا تو بھی اکیلے سیر کرتا رہتا۔ اس کے کھانے کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا۔ کوئی اس سے دیر سے آنے کا سبب نہیں پوچھتا تھا۔ نوکر اس کا کھانا بند کر کے اس کے کمرے کی میز پر رکھ کر سونے چلا جاتا تھا۔ اکیلے کھاتے وقت کبھی کبھی دل ہی دل میں اسے ہنسی آتی۔

ایک دن سیدھے دفتر سے لوٹ کر جیتو نے دینا کو اپنے کمرے میں بیٹھے پایا۔ وہ اپنی شاگردوں کی کاپیاں ایک گٹھری میں لیے بیٹھی تھی اور لال پنسل سے غلطیوں پر نشان بناتی جا رہی تھی۔ اگر دینا کو جیتو کے جلدی لوٹنے کی بات معلوم ہوتی تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھتی، اب لیکن اٹھ جانا ممکن نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

''راجی کیا ابھی نہیں لوٹی؟'' جیتو نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''چھت پر ہوگی...'' دینا نے جھکے جھکے ہی جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد دینا کو چپ بیٹھے دیکھ کر وہ بولا، ''تم ایک پیالہ چائے پیوگی؟''

''میں نوکر سے بنانے کو کہہ آتی ہوں۔''

جیتو کرسی پر بیٹھا رہا، کپڑے بدلنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ دینا کے لوٹنے پر اس نے کہا، ''شام کو تھوڑی سیر کر لیا کرو دینا!''

''مجھے گھر میں اچھا لگتا ہے۔''

''لیکن تمھاری صحت...''

''میں ٹھیک ہوں۔ آج کل کبھی بخار بھی نہیں آتا۔'' دینا نے لمحہ بھر کے لیے جیتو کی طرف حیرت سے دیکھا۔

باہر شام گھرنے لگی تھی۔ ستمبر کے مہینے میں سورج چھپتے چھپتے ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی تھی۔ جیتو بار بار دینا کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ 'کیا دینا پھر کسی سے بیاہ کرے گی؟' اس نے سوچا، 'کر لینا چاہیے۔ ایسے اکیلے کیسے زندگی گزارے گی؟' ایسے خالی بیٹھے بیٹھے جب کبھی دینا کا خیال اسے آتا تو کافی دیر تک اس کا دل اس میں الجھا رہتا تھا۔

''کل میں بڑی چاچی کے گھر گیا تھا،'' بڑی مشکل سے جیتو اس موضوع کو دینا کے سامنے اٹھا سکا۔ اس کے جلدی گھر لوٹنے کا یہ ایک سب سے بڑا سبب تھا۔

دینا نے چونک کر جیتو پر ایک نظر ڈالی۔ دینا دل ہی دل میں بڑی چاچی سے نفرت کرتی تھی۔ انھوں نے ہی اماں کو سمجھا بجھا کر دینا کے لیے بر ڈھونڈ کر اس کا بیاہ طے کیا تھا۔ جیتو کے بیاہ کا ذکر بھی اکثر کرتی رہتی تھیں، دو چار لڑکیاں انھوں نے ڈھونڈیں بھی، لیکن تب یقینی طور پر کچھ طے نہیں ہو سکا تھا۔ اماں کی موت کے بعد ان کا اس گھر میں آنا جانا بند سا ہو گیا تھا۔

''کل شاید شام کو وہ ہمارے گھر آئیں گی۔''

جیتو کی اس تمہید کے پیچھے اس کا اصلی مطلب سمجھنے میں دینا کو دیر نہیں لگی۔ چائے کے گھونٹ بغیر کسی سواد کے جیسے تیسے اس کے گلے کے نیچے اترتے گئے۔ چہرے پر خالی پن کا تاثر سمٹ آیا تھا۔

Scanned with CamScanner

''وہ کہتی تھیں کہ دو تین گھر ان کی نظر میں ہیں،'' جیتو دھیرے دھیرے کہنے لگا، جیسے وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ پچھلے کچھ دنوں میں بار بار یہ خیال اس کے دل میں آیا تھا، اگر اس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو اس کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ صورت حال ہاتھ سے نکلتی جائے گی۔ اس کے تصور سے ہی وہ خوفزدہ ہو جاتا۔ ''ہم لوگوں کی رائے لے کر وہ بات چیت آگے بڑھانے کو تیار ہیں۔'' پھر جھکتے جھکتے ہی بولا، ''اماں رہتیں تو بات دوسری تھی۔ لیکن اب ہم ہی لوگوں کو یہ ذمے داری اٹھانی پڑے گی۔ ایسے کب تک چلے گا؟'' جیتو جانتا تھا کہ دینا کو ان سب باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن وہ محض اسے مطلع کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے چاہنے نہ چاہنے کی فکر وہ نہیں کرے گا۔

کوشش کرنے پر بھی دینا کچھ کہہ نہیں سکی۔ جیتو کی موجودگی کا دھیان اسے نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس رات کتنی ہی دیر تک اپنی چارپائی میں لیٹے لیٹے دینا خالی چھت کی طرف تکتی رہی، جس کا پلستر کہیں کہیں بارشوں کے وقت جھڑ کر نیچے گر پڑا تھا۔ اسے لگا کہ جن گتھیوں سے اپنے آپ کو الجھا کر وہ جینے کی کوشش کر رہی تھی، وہ اسے باندھنے میں ناکام رہیں۔ اس رات کو اس نے جتنا اکیلا پن محسوس کیا اتنا پہلے کبھی نہیں کیا تھا، اور پاس ہی راجی بے خبر سوتی رہی۔

اگلے دن اسکول جانے سے پہلے دینا نوکر سے کہہ گئی کہ وہ دیر سے لوٹے گی۔

بڑی چاچی کے گھر آنے پر راجی نے جب جیتو کے بیاہ کی بات سنی تو اس کے شوق اور خوشی کی حد نہ رہی۔ گھر کی روزمرہ زندگی میں ایک نیا واقعہ ہوگا، ایک نیا فرد آئے گا، اس کے تصور سے ہی اس کا بدن کپکپا اٹھا۔ جیتو ابھی تک دفتر سے نہیں لوٹا تھا، اس لیے اسی نے بڑی چاچی کو چائے پلائی اور ان سے باتیں کرتی رہی۔ دینا کے دیر سے لوٹنے کی اطلاع اسے نوکر سے ہی ملی تھی اور اسے تعجب ہو رہا تھا کہ دینا کو اسکول کا ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا۔ لیکن بڑی چاچی کے ساتھ باتیں کرنے کا موضوع اتنا دلچسپ تھا کہ دینا کی بات زیادہ دیر تک اس کے دماغ میں نہیں رہ سکی۔ جو دو تین لڑکیاں بڑی چاچی کی نظر میں تھیں، وہ تفصیل کے ساتھ ان بارے میں راجی کو بتلاتی رہیں۔ انھیں دیکھنے کا تجسس راجی کے دل میں اٹھا۔

پھر جیتو کے لوٹنے پر بھی وہی باتیں جاری رہیں۔ بڑی چاچی نے جیتو کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کی۔ وہ اس کے حالات کا اندازہ لگا سکتی ہیں، لیکن اب اماں نہیں رہیں۔ دو تین برس بعد راجی کے لیے بھی گھر ڈھونڈنا پڑے گا۔ دینا جس صورت حال میں ہے، اس میں وہ زیادہ مدد نہیں کر پائیں گی۔ جیتو کی بیوی آ جائے تو وہ گھر کی ساری ذمے داری اپنے اوپر اٹھا لے گی۔ اس کے بیاہ میں بھی جو سامان ملے گا، وہ آسانی سے راجی کو جہیز کے طور پر دیا جا سکتا ہے۔

جیتو کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا، جس کا اندازہ راجی کو بھی ہو گیا۔ پہلے اماں کے زندہ رہتے جب جیتو کے بیاہ کا سوال اٹھتا تھا تو وہ ایک شرمیلے لڑکے کی طرح اپنی آنکھیں نیچے جھکا لیتا تھا، اس کے کان لال ہو جاتے تھے۔ اب وہ اپنے آپ کو خاندان کی ذمے داری کا بوجھ اٹھانے والا سمجھنے لگا تھا۔

دینا جب لوٹی تب تک بڑی چاچی اپنے گھر جا چکی تھیں۔ راجی اور جیتو کو سامنے والے کمرے میں دیکھ کر وہ سیدھی اندر چلی گئی۔ راجی سوچ رہی تھی کہ دینا کے واپس آنے پر وہ اسے شام کی باتیں تفصیل سے بتلائے گی، لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہی رہی۔ اس کے چہرے پر تھکان کے آثار ابھرے تھے، آنکھیں پھولی ہوئی تھیں۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ دینا کی آنکھوں کے نیچے گڑھے کتنے گہرے اور کالے ہو گئے ہیں، جنھیں دیکھ کر اسے ڈر سا لگا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ شاید کسی بھیانک بیماری نے دینا کو گھیر لیا ہے۔

مسکرانے کی جدوجہد کرتے ہوئے جب دینا نے خود ہی بڑی چاچی کے بارے میں پوچھا تو راجی نے مختصر لفظوں میں اسے سب کچھ بتلا دیا، لیکن اس کی آنکھیں دینا پر ہی گڑی رہیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی باتیں دینا کے اندر تک نہ پہنچ رہی ہوں۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا تو وہ راجی کی سب باتیں زبان سے شاید لفظ بہ لفظ بتا دیتی، لیکن اس کا دل ان سے پوری طرح انجان ہی رہا۔

جب وہ تینوں کھانے بیٹھے تو جیتو بہت شوق کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، لیکن جب دینا کی نظروں سے اس کی نظر مل جاتی تو اس کے لفظ منھ میں ہی اٹک جاتے، اسے لگتا جیسے کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا ہو اور وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا۔

''جنوری میں شاید میں اسسٹنٹ بن جاؤں گا،'' جیتو کہنے لگا، ''پھر مجھے سرکاری کوارٹر مل جائے گا۔ یہ مکان ہم چھوڑ دیں گے۔ یہ چھوٹا بھی بہت ہے۔'' ان دونوں کی موجودگی کو بھول کر وہ جیسے اپنے

Scanned with CamScanner

آپ سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ ''سرکاری کوارٹر میں چار کمرے ہوں گے۔ سامنے چھوٹا سا لان اور پیچھے سبزی اگانے کے لیے تھوڑی سی زمین...''

راجی کے چہرے پر ایک لہر سی دوڑ گئی، لیکن جیتو کی باتوں پر اسے یقین کم تھا۔ پچھلے تین چار برسوں سے وہ اپنے اسسٹنٹ بننے اور سرکاری کوارٹر ملنے کی باتیں کر رہا تھا۔ 'آج شوق میں بھیا وہ سب خواب پھر دیکھ رہے ہیں،' اس نے سوچا۔

جیتو نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے بیاہ کا ذکر سن کر دینا ظاہری طور سے اپنا اختلاف نہ جتلائے، پر دل میں بے تعلقی کے ساتھ ساتھ غصہ اور گھٹن ضرور پیدا ہوگی، لیکن اب ایسا جان پڑ رہا تھا جیسے اس سچ کو ٹھوس جان کر اس نے حالات کے سامنے اپنا سر جھکا لیا ہو۔ اس کے لیے یہی کافی تھا؛ اس سے زیادہ کی امید اس نے دینا سے نہیں کی تھی۔

''نئے مکان میں ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنالیں گے،'' جیتو نے اس کمرے میں اپنی نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس گھر میں کسی کو کھانے پر نہیں بلایا جاسکتا۔ اور بغیر کسی کو گھر بلائے اس سے میل جول بڑھانا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے دفتر میں دوسرے کلرک، سپرنٹنڈنٹ اور اکاؤنٹینٹ وغیرہ کو گھر بلا کر کھانا کھلاتے رہتے ہیں اور ترقی ہوتے وقت ان کے نام سب سے آگے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں ابھی تک اسسٹنٹ نہیں بن سکا۔''

''یہی تو کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے گھر کبھی کوئی کیوں نہیں آتا،'' راجی بولی، ''پاس والے مکان میں کسی کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سن کر کبھی کبھی وہم ہونے لگتا ہے کہ شاید کوئی ہمارے ہاں آرہا ہے، لیکن ہر بار مایوس ہی ہونا پڑتا ہے۔''

''ہم کسی کو گھر نہیں بلاتے، اسی لیے ہمیں بھی کوئی دعوت نہیں دیتا،'' جیتو بولا۔

''بھیا، تم کہتے تھے کہ سرکاری کوارٹر میں باغ بھی ہوگا؟'' راجی نے جیتو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ لیکن اس کا چہرہ بجلی کی روشنی میں بھی راجی کو دکھائی نہیں دیا۔ دینا کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ شفاف چاندنی میں مکانوں کے پیچھے کا اجاڑ حصہ ابھر آیا تھا۔ افق کے اوپر جہاں تارے چمکنے لگے تھے، اسی سے آسمان ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

''کھانے کے بعد باغ میں بیٹھ کر کافی پیا کریں گے۔ ایک بار میں اپنی کچھ سہیلیوں کو بھی کھانے

Scanned with CamScanner

کے لیے بلاؤں گی۔‘‘

دینا دونوں کی باتیں سن کر مسکراتی رہی۔ اگرچہ ان کی طرح اس نے بات چیت میں اپنا اشتیاق نہیں دکھلایا، لیکن اس کے چہرے کے تاثر اور مسکراہٹ کو دیکھ کر دونوں کو یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ دلچسپی لے رہی ہے۔ انھیں یہ ذرا غیر فطری سا لگا۔

اس کے بعد روز ہی اس طرح کی باتیں جیتو کے دفتر سے لوٹنے کے بعد شروع ہو جاتیں۔ انھیں بات چیت کرنے کا ایک موضوع مل گیا۔

ایک دن جیتو اپنے کمرے کے لیے دو پردے خرید لایا، جن سے کھڑکی اور دروازے ڈھک گئے۔ دیوار پر لٹکی بتی کے اوپر ایک شیڈ لگا دیا گیا۔ روشنی اب آنکھوں میں چبھتی نہیں تھی۔ اگرچہ جیتو نے کچھ نہیں کہا، لیکن یہ واضح تھا کہ بڑی چاچی کے کہنے کے مطابق کچھ لوگ اسے دیکھنے گھر پر آئیں گے۔ اس لیے کمرے میں تھوڑی سجاوٹ ہونی ضروری تھی۔ ایک دن راجی نے اپنے سامنے نوکر سے کمرے کی اچھی طرح سے صفائی کروادی۔ کونوں میں لگے جالے توڑ دیے گئے۔ دینا نے ایک بکس میں رکھے دو پرانے پھول دانوں کو منجھوا دھلوا کر چھتی پر سجا دیا۔ اور وہ ان اجنبی مہمانوں کا انتظار کرنے لگے جن کے ساتھ مستقبل میں ان کا گہرا تعلق قائم ہونے والا تھا۔ لیکن بڑی چاچی کے گھر سے ان کے پاس ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

جیتو کو اب اتنی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی، پھر بھی سیدھے سیدھے سب باتیں کرنے میں اسے تھوڑی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ راجی اس کی اَن کہی باتوں کو پورا کر دیتی۔ بیاہ کی کتنی تیاری اماں کر گئی ہیں، کتنی ابھی باقی ہیں، کیا کیا سامان اور خریدنا ہے، کس طرح کا دعوت نامہ چھپے گا، سامنے والے باغ میں شامیانہ لگا کر مہمانوں کا سواگت کیا جائے گا—ان سب پر تفصیل سے بات ہوتی۔ راجی اس ڈھنگ سے باتیں کرتی جیسے وہ گھر کی سب سے بڑی عورت ہو، جس پر بیاہ کا سارا بار ہو۔

دینا نے ایک دن دبی آواز میں کہا کہ اسے بیاہ پر جو گہنے ملے تھے ان میں سے آدھے وہ جیتو کے بیاہ میں دے دے گی اور آدھے راجی کے لیے۔ جیتو نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن دینا کا سنجیدہ لہجہ اور خاموشی دیکھ کر وہ زیادہ نہیں بولا۔ بعد میں اس پر زیادہ سوچنے کے بعد اسے اطمینان ہوا کہ اب اور گہنے نہیں بنوانے پڑیں گے۔ اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ لیکن راجی کو لگا جیسے دینا کی اس بات سے وہ دونوں

Scanned with CamScanner

واقف ہو گئے ہوں۔ ’نہیں، دینا کو اپنے گہنے اپنے پاس رکھنے چاہییں۔ مستقبل میں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے،‘ اس نے سوچا۔

سردیوں کی ایک صبح چھٹی والے دن تڑکے ہی وہ جیتو والے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔ کھڑکی پر لگے پردے کی سلائی اوپر سے ادھڑ گئی تھی اور دروازے پر لٹکے پردے پر دھبے لگ گئے تھے۔ پھول دان میں سجے کاغذ کے لال گلاب کے چوڑے پھولوں پر دھول جم گئی تھی۔ سب پھر پہلے کی طرح ہو گیا تھا۔ دھندلی دھوپ سامنے والے مکان کے اوپری حصے کو اجلا کرتی ہوئی دھیرے دھیرے نیچے رینگتی جا رہی تھی۔ جیتو رضائی سے اپنا جسم ڈھکے، دیوار سے پیٹھ ٹیکے بیٹھا تھا، گھٹنے اوپر اٹھ گئے تھے اور چائے کی پیالی وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ دینا کھڑکی کے پاس اور راجی اسپرنگ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ تینوں کو اپنی جگہوں پر بیٹھے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں، لیکن انھیں کسی کا انتظار نہیں تھا۔ اگر کوئی اس وقت آ بھی جاتا تو وہ انھیں دکھائی نہ دیتا۔

راجی کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ سبب وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ ’بغیر سبب بھی تو دنیا میں اتنا سب کچھ ہوتا رہتا ہے،‘ اس نے سوچا۔ لیکن جیتو کو دیکھ کر آج کل اس کا دل زور زور سے ہنسنے لگتا تھا۔ بڑی چاچی کی کوششوں کے باوجود اس کا بیاہ کہیں طے نہیں ہو سکا۔ اب شاید انھوں نے ہمیشہ کے لیے امید چھوڑ دی ہے۔ شادیون کے لگن بھی گزر گئے۔ جیتو کے بیاہ کے بعد ماحول میں جس نئے پن کی وہ امید کر رہی تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ ’گھر پھر پہلے جیسا ہی بن گیا ہے،‘ وہ سوچتی تھی، ’چند دنوں کے لیے شانت جل اِدھر اُدھر اچھلا کودا، لیکن بڑی دھارا اسی طرح سے بہتی رہی...‘

’’سردیوں میں آسمان کتنا نیلا ہو جاتا ہے۔ اتنے بڑے آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا تک نہیں...‘‘ لیکن راجی کی بات سے کوئی متاثر نہیں ہوا... ’’اگر سرکاری کوارٹر مل جاتا تو باہر دالان میں بیٹھتے۔‘‘

’’اس بار سردیاں جلدی شروع ہو گئیں،‘‘ دینا بولی۔

’’بارشیں بھی جلدی ہونے لگی تھیں۔‘‘ راجی کو اچانک یاد آیا۔

’کرسمس کی چھٹیاں،‘ دینا نے سوچا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سمندر کی وسعت پھیل گئی۔ مدراس، تنجور، مدرا، کنیا کماری... کہاں کیا دیکھا جا سکتا ہے، یہ اسے ایک گائیڈ کی طرح رٹا

Scanned with CamScanner

ہوا تھا۔ لیکن یہ جوش اس نے اپنے دل میں ہی دبا رہنے دیا۔ چھٹی والے دن صبح کی چائے ختم کرنے کی جلدی نہیں رہتی تھی۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے اس کی گرمائی میں کتنی باتیں دھویں کی طرح اوپر اٹھتی جاتی تھیں۔ راجی سے اس کی نظر ملی تو اس کے ہونٹ بھی مسکرا دیے۔

''تم کہتے تھے کہ تم سردیوں میں اسسٹنٹ بن جاؤ گے بھیا؟'' راجی نے پوچھا۔

جیتو کو اس طرح کی باتوں سے نہ غصہ آتا تھا نہ جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ ''اس بار بھی شاید کسی دوسرے کو چانس مل جائے گا۔ جب تک لسٹ میں میں اکیلا نہ رہ جاؤں تب تک میں شاید کبھی اسسٹنٹ نہیں بن سکوں گا،'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''تب تک ہم اسی مکان میں رہیں گے؟'' راجی بولی۔

جیتو نے محسوس کیا جیسے اسسٹنٹ بننے کی خواہش اب اتنی شدید نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔

چائے کی کیتلی خالی ہوگئی تو دینا اسے پھر بھر لائی اور اسے ٹی کوزی سے ڈھک دیا۔ اخبار چارپائی پر پڑا ہوا تھا لیکن اس کی سرخیوں سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔

''آج ہوا کتنی ٹھنڈی ہے۔'' دینا نے ساڑھی سے اپنی گردن ڈھک لی۔

''پہاڑوں پر برف پڑی ہوگی،'' راجی بولی۔

دینا کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ ''سمندر کے کنارے ہوا بہت تیزی سے چلتی ہے، کیوں؟''

راجی کو ہنسی آ گئی، لیکن جیتو لاتعلق بنا بیٹھا رہا۔

❋❋

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

ریوا

اس بار دو برس بعد جب بڑے بھیا اپنی چھٹیاں کاٹنے گھر آئے تو خود بخود ہی ہمارے گھر کی روزمرہ زندگی میں ایک خاصا طوفان سا مچ گیا۔ ان کے آنے کی بات ضرور تھی، لیکن اپنے پچھلے خط میں کوئی مقررہ دن انھوں نے نہیں لکھا تھا، اور جب ایک دن تڑکے ہی تانگہ ہمارے مکان کی سیڑھیوں کے سامنے آ کر ایکا ایک رک گیا تو میں، منجھلے بھیا اور کانتی لمحہ بھر کو ایک دوسرے کے چہرے کی طرف تکنے لگے۔ کانتی جھٹ سے کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور چلّانے لگی، ''بڑے بھیا آ گئے... بڑے بھیا کا سامان اتر رہا ہے...'' اور یہ خبر وہ اماں اور دادا کو بھی سنا آئی۔

دادا اخبار ہاتھ میں لیے، دوشالہ اوڑھے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑے ہوے۔ ہم لوگ اپنے کمرے کی کھڑکی پر ہی ٹنگے رہے اور بے چین آنکھیں نیچے جھک گئیں، جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔

''ارے لمپٹ کہاں گیا؟ اس سے کہو، بڑے بھیا کا سامان تو اوپر لے آئے۔'' منجھلے بھیا نے میری طرف دیکھتے ہوے کہا۔

میں کھڑکی سے سٹا ہوا نیچے دیکھ رہا تھا۔ ویسے ہی بولا، ''تمھی لمپٹ سے سامان لانے کو کیوں نہیں کہہ دیتے؟'' کانتی لمپٹ کو آوازیں دینے لگی، لیکن وہ شاید کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔

دادا سے اب نہیں رہا گیا، وہ ہمارے کمرے میں آ کر سخت آواز میں بولے، ''ارے، تو ہی

سامان اوپر کیوں نہیں اٹھالاتا؟ لاٹ صاحب کی طرح حکم کیا چلا رہا ہے!''

میں منجھلے بھیا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''ارے، کسی کو سامان لانے کے لیے نیچے تو بھیجو...'' بڑے بھیا نیچے سے ہی ہماری طرف دیکھ کر بولے۔ اس بار منجھلے بھیا کے پاس نیچے جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چپل پہن کر وہ نیچے اتر گئے۔

میں بڑے بھیا کا کالا اوور کوٹ بڑی للچائی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اگر ویسا ہی اوور کوٹ میرے پاس ہوتا تو اپنے کالج پہن کر جاتا۔ بڑے بھیا ہمارے کمرے میں آ کر اکیلی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئے، اوور کوٹ اتار کر انھوں نے کھڑکی پر ٹانگ دیا تھا، ان کے براؤن جوتے ایسے چمک رہے تھے کہ ان میں اپنا چہرہ تک دیکھا جا سکتا تھا۔ دادا ایک بکس کے اوپر بیٹھ گئے۔ اماں نے بڑے بھیا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر انھیں آشیرواد دیا، حالانکہ انھوں نے اماں کے پاؤں نہیں چھوئے تھے، اور پھر دری پر بیٹھ کر ساڑھی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ منجھلے بھیا نے بھاری بکس اور بستر اٹھا کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا اور اس پر شرم سے ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلکنے لگی تھیں۔

''تو نے اپنے آنے کا تار نہیں ڈالا، نہیں تو کوئی اسٹیشن چلا جاتا۔'' دادا بولے۔

''آنے کا ٹھیک نہیں تھا، اس لیے تار نہیں بھیجا...'' بڑے بھیا کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہنے لگے۔

ماں نے پوچھا، ''چائے تو پیے گا نا؟'' اور پھر بغیر اُن کے جواب کا انتظار کیے کانتی سے بولیں، ''جا، چولھے پر چائے کا پانی چڑھا آ۔''

''ارے... گھر کے کیا حال چال ہیں؟'' بڑے بھیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس ڈر سے کہ کہیں ان کے سوال کا کوئی اور جواب نہ دے دے، دادا جھٹ سے بول اٹھے، ''ٹھیک ہے، جیسے تیسے گاڑی گھسٹی جا رہی ہے...'' پھر ہم سب پر انھوں نے ایک کڑی نظر ڈالی جیسے اس صورت حال کی وجہ ہم سب ہی ہوں۔ اماں کو ان کا جواب اچھا نہیں لگا۔ سب کے سامنے اپنا رونا رونے سے فائدہ؟

پھر میری طرف دیکھ کر بڑے بھیا نے پوچھا، ''تیری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ ابھی بی اے

Scanned with CamScanner

پاس نہیں کیا؟''

''تھرڈ ایئر میں ہوں...''

دادا تھوڑا ہنسے۔ پڑھائی کی بات انھیں کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس موقعے کو بھی انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ''آج کل پڑھائی کو کون پوچھتا ہے۔ بی اے ایم اے کی ڈگریاں لیے لڑکے سوسوا سو کی نوکریوں کے لیے بھٹکتے پھرتے ہیں۔''

بڑے بھیا بھی مسکرانے لگے۔ وہ خود میٹرک فیل تھے۔ دو بار امتحان میں بیٹھے لیکن کامیاب نہیں ہوے۔ پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اُن دنوں لڑائی ہو رہی تھی، سو فوج میں بھرتی ہو جانا بہت آسان تھا۔ خوش قسمتی سے جنگ کے بعد بھی وہ فوج میں ہی رہے۔ اب کپتان تھے اور پچھلے تین برسوں سے آسام میں ہی رہتے تھے۔

کانتی بڑے چاؤ سے چائے کا پیالہ بنا کر لے آئی اور بڑے بھیا کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس کے اشتیاق کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جب سے بڑے بھیا کے آنے کی خبر سنی تھی، تب سے وہ سوغاتیں پانے کی امید لگائے ہوے تھی۔ پچھلے سات آٹھ دنوں سے دن میں کئی بار میری میز کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اندازہ لگایا کرتی تھی کہ بڑے بھیا اس کے لیے کیا کیا سامان لائیں گے۔ اب پھر میرے پاس دری کے ایک کونے پر بیٹھ کر دھیمی آواز میں بولی، ''بڑے بھیا کا سوٹ کیس کتنا نیا ہے۔ پتا نہیں اس کے اندر کیا ہے!''

''کلکتے میں کتنے دن رہا؟'' اماں نے پوچھا۔

''یہی شاید تین چار دن۔ دو دوست بھی ساتھ تھے۔''

''کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہوگا...''

''ارے، تم لوگوں نے ابھی تک کلکتہ نہیں دیکھا... بہت بڑا شہر ہے۔ چورنگی میں شام کو پیر رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ دنیا بھر کا سامان دکانوں میں ملتا ہے۔''

کانتی میرے کان کے پاس آ کر پھر کہنے لگی، ''میرے لیے ضرور بڑے بھیا کلکتے سے چیزیں لائے ہوں گے۔ اب اپنا سوٹ کیس کیوں نہیں کھول لیتے؟''

میں نے غصے میں آ کر کانتی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں بڑے بھیا کو یہ غلط فہمی نہیں ہونے دینا چاہتا

Scanned with CamScanner

تھا کہ میں ابھی تک کانتی کے ساتھ کھیلتا ہوں یا ہم دونوں کی آپس میں بہت پٹتی ہے۔ لیکن سوٹ کیس کے اندر کیا ہے، اسے جاننے کی خواہش میرے دل میں بھی اتنی ہی تھی جتنی کانتی کے دل میں۔ اور اوورکوٹ سے تو میری نظر ہٹتی ہی نہیں تھی۔

دادا نے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ منجھلے بھیا کی ۱۰۵ روپے ماہوار کی نوکری کا مذاق اڑایا اور منجھلے بھیا چپ چاپ آنکھیں جھکائے سب کچھ سنتے رہے۔ میری پڑھائی پر کتنا خرچ ہوتا ہے اور کانتی کے بیاہ میں کتنا خرچ ہوگا، یہ سب بھی بتلایا۔ لیکن بغیر جھجک کے انھوں نے تھوڑے سے جملوں میں اپنی فکروں کو بیان کر دیا۔ پھر دادا اپنے کمرے میں چلے گئے اور ہم نے چین کی سانس لی۔

ان کے جاتے ہی بڑے بھیا نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور میری لکھنے کی میز پر پاؤں پسارے سگریٹ کے کش کھینچنے لگے۔ ہم سب نے تعجب اور غصے سے ان کی بے تکلفی کو دیکھا، لیکن کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ ان کے جوتوں کی دھول سے میز پوش پر نشان بنے جا رہے تھے۔

کانتی نے پھر کہنی مار کر دھیمی آواز میں کہا، ''دادا چلے گئے، اب بڑے بھیا اپنا سوٹ کیس کھولیں گے۔''

بڑے بھیا نے اس کی کھسر پھسر کو سنا اور ہنس کر بولے، ''کیا بات ہے کانتی؟ تو تو ان دو ڈھائی سالوں میں بہت بڑی ہو گئی۔''

''یہ پوچھ رہی ہے کہ اس کے لیے کلکتے سے کیا لائے...'' میں نے کہا۔

بڑے بھیا کا چہرہ فق سا پڑ گیا۔ انھوں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچا اور ناک اور منھ سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے، ''سامان کیا لیا؟ کلکتے میں سیر سپاٹے اور ہوٹل کے کرائے میں ہی کافی خرچ ہو گیا۔''

ان کا جواب سن کر ہم سب چپ ہو گئے۔ کانتی نے سوچا، مذاق کر رہے ہوں گے۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی ابھی تک ناچ رہی تھی۔

اماں نے حالات کا تھوڑا اندازہ لگایا اور بولیں، ''ارے، اتنی دور سے اپنے آپ آ گیا، یہی کیا کم ہے! اس مہنگائی کے زمانے میں سوغاتیں کون خریدتا ہے۔''

پھر بڑے بھیا نے سگریٹ کو فرش پر دبا کر بجھا دیا اور سوٹ کیس کھولنے لگے۔ کانتی آگے سرک

آئی اور ہم سب بڑی بے چینی سے ان کے سوٹ کیس کو دیکھنے لگے، جیسے کوئی جادو کی پٹاری کھل رہی ہو۔ اوپر ان کی قمیصیں تھیں جن کے کالر کلف میں اکڑے ہوئے تھے، ایک نیا سوٹ تھا، ٹائیاں تھیں، ایک اونی چیک ڈیزائن کا مفلر تھا۔ ایک کونے میں سے کاغذ میں لپٹا پلاسٹک کا ایک بیگ نکال کر انھوں نے کانتی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ الٹ پلٹ کر بیگ کو دیکھنے لگی۔ مایوسی سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دو ڈھائی روپے کا ایسا بیگ تو یہاں بھی ملتا تھا، پھر کلکتے سے اسے خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی بھری ہوئی آنکھوں میں غصہ سما نہیں پا رہا تھا، کوشش کرنے پر بھی اس کے منھ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

''پسند آیا نا؟ یہ دس روپے کا بیگ ہے...''

ان کے جھوٹ پر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ کانتی دبکی بیٹھی رہی۔ پھر لفافے میں لپٹی ایک چپل نکال کر انھوں نے مسکراتے ہوئے اماں کے سامنے بھی رکھ دی۔ ''تمھارے لیے یہ چپل خرید لی تھی، بہت مضبوط ہے۔'' چپل بھی معمولی تھی، پرانے فیشن کی۔

بڑے بھیا پھر کرسی پر آ بیٹھے۔ فخر سے ان کے ہونٹوں پر ہنسی ابھر آئی تھی۔ ''تم دونوں کے لیے کچھ نہیں خریدا۔ تم تو اب بچے نہیں رہے۔''

اس طرح بند سوٹ کیس کی کہانی ختم ہو گئی۔ کانتی موقع پاتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ منجھلے بھیا اپنے دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے اور میں بڑے بھیا کے ساتھ اکیلے رہ جانے کے ڈر سے اپنی ایک کتاب اٹھا کر اوپر چھت پر آ گیا۔ کتاب میں دل نہیں لگ سکا۔

گھر میں تین کمرے تھے۔ ایک دادا کے پاس، دوسرے میں اماں اور کانتی کا سامان تھا، اور تیسرے میں میں منجھلے بھیا کے ساتھ رہتا تھا۔ بڑے بھیا بھی ہمارے ہی کمرے میں آ کر بس گئے اور دھیرے دھیرے سارے کمرے پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ میں اور منجھلے بھیا کبھی اپنائیت کے بندھنوں میں نہیں بندھے تھے، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کی موجودگی ہمارے لیے رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔ وہ جب کمرے میں ہوتے تو کھڑکی کے پاس دھرے بکس پر دیوار کا سہارا لگائے بیٹھے رہتے یا کوئی کتاب پڑھا کرتے، یا تھکان زیادہ ہو جانے کے سبب چٹائی پر لیٹ جاتے۔ جب کانتی ہمارے کمرے میں آ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنا وقت کاٹنے کی کوشش کیا کرتی تو ان میں وہ خاموشی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ جب کبھی ان کی موجودگی میں میرا کوئی دوست آ جاتا تو وہ چھت پر ٹہلنے چلے جاتے تھے۔

Scanned with CamScanner

لیکن اب کمرے کا نقشہ ہی بدل گیا۔ بڑے بھیا کے کپڑے کرسی، دروازوں اور کھڑکی کے اوپر بے ترتیب ڈھنگ سے لٹکتے رہتے تھے۔ سگریٹ کی راکھ اور اس کے ٹکڑے کمرے کے فرش پر بکھرے رہتے تھے، ان کے جوتوں کی مٹی جب میرے ننگے پیروں سے چمٹتی تو میری جھنجھلاہٹ کا ٹھکانہ نہیں رہتا تھا، لیکن اس بارے میں بڑے بھیا سے کبھی کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ میں نے اور کانتی نے تو شروع شروع میں بڑے بھیا میں کافی دلچسپی دکھلائی تھی، لیکن منجھلے بھیا کے لیے شاید ایسا کرنا ان کی فطرت کے خلاف ہوتا۔ جب کبھی بڑے بھیا کے ساتھ وہ اکیلے کمرے میں رہ جاتے تو کبھی انھیں آپس میں بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔

میری بڑے دنوں کی چھٹیاں تھیں، اس لیے بڑے بھیا کے ساتھ دن میں کئی بار میری مڈھ بھیڑ ہو جاتی تھی اور میں ان سے بچنے کی پوری کوشش کیا کرتا تھا۔ انھیں اپنی فوجی زندگی کی ڈینگیں مارنے کا بہت شوق تھا۔ عام سے واقعات کو وہ بڑی تفصیل سے بیان کیا کرتے تھے اور ہم ان سے بہت جلدی اُوب جاتے تھے۔ جب کبھی اماں بھی ہمارے کمرے میں بیٹھی ہوتیں تو وہ ایسا ظاہر کرتیں جیسے ان کی باتوں میں بہت دلچسپی لے رہی ہوں، لیکن میں اور کانتی دونوں جانتے تھے کہ ان کا دھیان کہیں اور ہے۔

بڑے بھیا کو پہننے اوڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ٹائی باندھتے وقت کتنی ہی دیر تک میں نے انھیں شیشے کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ دوسرے تیسرے دن اکیلے سینما دیکھنے کا ان کا پروگرام رہتا تھا۔ شہر میں ان کے کوئی دوست نہیں تھے۔ اپنے ساتھ سینما چلنے کا انھوں نے ہمیں کبھی بلاوا نہیں دیا۔

جب کبھی گھر پر میرا کوئی دوست مجھ سے ملنے آ جاتا اور بڑے بھیا گھر میں ہی ہوتے تو میرے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ آ کھڑا ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی میں ہم آزادی سے بات چیت نہیں کر پاتے تھے، لیکن بڑے بھیا کو ان موقعوں پر کمرے سے اٹھ کر چلے جانا شاید اپنی توہین جان پڑتی تھی۔ آخر میں غصہ ہو کر میں اپنے دوست کے ساتھ سیر کرنے کے بہانے باہر آ جاتا تھا۔ اکیلے رہنے پر کبھی کبھی وہ میرے دوستوں کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے۔ شاگردوں اور پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لینے والوں کے لیے ان کے دل میں ایک طرح کی نفرت تھی۔ کہتے کہ ماں باپ کے پیسے پر پڑھنا لکھنا اور ڈینگیں مارنا نامناسب بات ہے۔ ڈگریاں لے کر جب نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھانی پڑیں گی تو پڑھائی لکھائی کا سارا غرور دور ہو جائے گا۔ دادا بھی میری پڑھائی کے حق میں نہیں تھے۔ انھوں نے مجھے انٹر پاس کرنے

کے بعد کہیں نوکری کرنے کی صلاح دی تھی، لیکن ایک تو انٹر میں مجھے وظیفہ ملا اور دوسرے اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لیے میں نے بہت ہاتھ پیر مارے تھے۔ آخر کار منظوری تو انھیں دینی پڑی تھی لیکن جب موقع ملتا تو لیکچر جھاڑ دیتے تھے، اور اب بڑے بھیا کی شہ پا کر وہ اور بھی شدت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔

اماں چاہتی تھیں کہ اس بار بھیا کا بیاہ طے ہو جائے۔ وہ سب سے بڑے لڑکے تھے، اچھا کماتے تھے اور کوئی بھی اپنی لڑکی خوشی سے ان کے ساتھ بیاہنے کو تیار ہو جائے گا۔ اس کا ایک اور سبب بھی تھا۔ ریوا انھیں بہت پسند تھی اور اسے وہ اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتی تھیں۔ اس بات کو ہم سبھی جانتے تھے کہ اسے وہ اپنی بہو بھی بنانا چاہتی ہیں۔ بڑے بھیا پر چاہے انھیں کتنا ہی کم یقین ہو، لیکن وہ جانتی تھیں کہ ریوا ان کے ساتھ اچھے تعلقات بنائے رکھے گی۔

ریوا کا گول گول چہرہ، ذرا ناٹا قد اور دبلا پتلا بدن تھا۔ جب وہ گہرے لال یا نیلے رنگ کی ساڑھی پہنتی، تو دور سے گڑیا جیسی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اسے سدا ہنستے ہوئے ہی دیکھا تھا، جب بھی ہمارے گھر آتی تو گھر کا ماحول ہی بدل جاتا تھا۔ پچھلے برس اس نے میٹرک پاس کیا تھا اور اب گھر پر ہی رہتی تھی۔ میں اپنے کالج سے اس کے لیے کبھی کبھی شرت چندر اور پریم چند کے ناول لے آتا تھا۔ کانتی کے ساتھ اس کی بہت پٹتی تھی۔

اماں نے کسی بہانے ایک دن ریوا کو بلا بھیجا۔ بڑے بھیا کو بھی ریوا اور ریوا کے گھر والوں کے بارے میں انھوں نے تفصیل سے بتلا دیا تھا، اس کی تعریفوں کے پل باندھے تھے۔ ان چھ سات دنوں میں ہی بڑے بھیا کے برتاؤ کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں سوچنے لگا تھا کہ وہ ریوا کے لائق قطعی نہیں ہیں، وہ ریوا کی قدر نہیں کر پائیں گے، اس کے گنوں کو سمجھنے اور سراہنے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ لیکن میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ریوا صبح ہی ہمارے گھر آ گئی۔ آج ہمارے گھر آنے کا ارادہ شاید معلوم ہو گیا تھا، اسی لیے اپنی طبیعت کے برخلاف اس کے چہرے پر اداسی کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی سوتی ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور بالوں پر توجہ سے کنگھی کی تھی۔ اپنی چہل بازی کو جیسے تیسے روکے ہوئے تھی۔

دسمبر کے آخری دنوں کی اجلی دھوپ تھی۔ چھت پر میں اپنے کورس کی کتاب پڑھنے کی کوشش کر

Scanned with CamScanner

رہا تھا۔ منجھلے بھیا چارپائی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ کانتی میز پوش کاڑھ رہی تھی۔ بڑے بھیا باہر گئے ہوئے تھے۔

''بہت دنوں بعد آئیں ریوا دیدی...'' کانتی نے ریوا کو اپنے پاس بٹھلاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ تو کبھی بھول کر بھی ہمارے گھر نہیں آتے، تب میں ہی روز روز کیوں آنے لگی...''

میں نے اپنی کتاب بند کر دی۔ ریوا مسکراتے ہوئے ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم میں سے کوئی اس کے گھر نہیں جاتا، اس کی شکایت ہر بار ریوا سے سننے کو ملتی تھی۔

منجھلے بھیا کے ساتھ ریوا اتنی بے تکلف نہیں تھی جتنی ہم لوگوں کے ساتھ تھی، لیکن منجھلے بھیا کے لیے اس کے دل میں کیا کیا بھرا تھا، تب اتنی گہرائی میں میں نہیں جان سکا تھا۔ آج سچ مچ ایسا لگتا ہے جیسے اس عمر میں اس کے اندر جو بھی پیار تھا، جو بھی پیڑا تھی، اس کا بڑا حصہ منجھلے بھیا کے لیے تھا، اسی کو چھپانے کے لیے کھلم کھلا وہ کبھی منجھلے بھیا کے قریب نہیں آتی تھی۔

''ریوا دیدی، آج تو تم ایک دم نئے کپڑے پہن کر آئی ہو...'' کانتی نے اس کی ساڑھی اور بلاؤز پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔

ریوا کا منھ شرم سے کنپٹیوں تک لال ہو گیا۔ اس نے اپنی ساڑھی سے اپنی ننگی بانہیں ڈھک لیں۔ ''نئے کپڑے کہاں ہیں...اس ساڑھی کو پہلے بھی تو پہن چکی ہوں۔''

''کالج بند ہونے سے پہلے میں تمھارے لیے دو کتابیں لایا تھا ریوا، آج لے جانا۔'' میں نے کہا۔ ریوا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

منجھلے بھیا کن انکھیوں سے ریوا کی طرف دیکھ رہے تھے، کبھی ہم لوگوں کی طرف بھی اپنی نظر پھیر لیتے تاکہ کسی بات کا شک نہ ہو۔

تبھی کانتی ریوا کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگی اور ہم جھینپتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھتے رہے۔ کانتی کی یہ پرانی عادت تھی اور کتنی ہی بار منع کرنے پر بھی وہ اسے چھوڑ نہیں سکی تھی۔ وہ ریوا کے ہاتھ سے اس کا تھیلا چھین رہی تھی اور ریوا بناوٹی غصے میں اور ہنستے ہوئے ہماری طرف دیکھتی ہوئی تھیلے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''نہیں ری، ابھی نہیں۔ جب میں چلی جاؤں گی تب دے دینا...'' ریوا نے کہا۔

''نہیں ریوا دیدی، اپنے سامنے دو۔ اس میں شرم کی کون سی بات ہے...'' تھیلا چھینتے ہوئے اس نے منجھلے بھیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''منجھلے بھیا، ریوا دیدی تمھارے لیے کچھ لائی ہیں...''

میں اور منجھلے بھیا دونوں ہی اس کی بات سن کر چونک گئے۔

کانتی نے تھیلا چھین لیا تھا۔ اس میں سے اس نے ہنستے ہوئے لفافے میں بند ایک پیکٹ نکالا اور پھر کاغذ پھاڑ کر سلیٹی رنگ کا ایک پل اوور دکھاتی ہوئی کہنے لگی، ''یہ ریوا دیدی نے تمھارے لیے بُنا ہے۔ منجھلے بھیا! مجھے پہلے سے ہی پتا تھا، لیکن ریوا دیدی نے کسی سے کہنے کو منع کیا تھا۔'' پھر پل اوور کی تہہ کھول کر اسے ہمیں دکھاتے ہوئے کہنے لگی، ''بہت اچھا بنا ہے ریوا دیدی! بالکل بازار کا سا معلوم دیتا ہے۔''

منجھلے بھیا ہم سب کے سامنے یہ تحفہ پا کر جھینپ سے گئے۔ اس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس گھبراہٹ میں ریوا کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکے۔ وہ کبھی پل اوور کی طرف تکتے، کبھی کانتی کی طرف اور کبھی ریوا کے چہرے کو دیکھنے لگتے۔ وہ سر جھکائے ہنستی ہوئی بیٹھی رہی۔

''پہن کر دیکھو منجھلے بھیا... پتا نہیں، فٹ بھی آئے گا یا نہیں۔ ریوا دیدی تمھارا ناپ تک نہیں لے سکیں،'' کانتی نے پل اوور منجھلے بھیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

منجھلے بھیا پل اوور اپنے ہاتھ میں لے کر، اس کی ملائم اون پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگے۔ ہم دونوں کے سامنے پل اوور پہننے میں انھیں جھجک ہو رہی تھی۔ ''بہت اچھا بنا ہے۔ بیکار میں تم نے اتنی تکلیف کی ریوا...''

''پہن کر دیکھو منجھلے بھیا، ایسے کیسے پتا چلتا ہے؟''

''اری، تو چپ رہ۔ پہن کر کیا ہوگا؟ فٹ تو ہے ہی...''

''نہ نہ... ریوا دیدی کے سامنے پہننا ہی پڑے گا۔ انھوں نے اتنی محنت کی ہے اور تم ان کے سامنے...'' کانتی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ باتوں میں اس سے جیت پانا بہت کٹھن تھا۔

جیسے تیسے منجھلے بھیا نے پل اوور پہنا۔ کسے ہوئے پل اوور میں ان کی چھاتی سپاٹ میدان سی دکھائی دے رہی تھی جس میں اتار چڑھاؤ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ریوا دبی آنکھوں سے منجھلے بھیا کو دیکھ رہی تھی، وہ گھبراہٹ میں کبھی اپنی قمیض ٹھیک کرتے، کبھی اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے۔

تبھی سیڑھیوں پر کسی کی آہٹ سن کر سب سنبھل گئے۔ ہم کو اس رکاوٹ کا ڈالا جانا برا لگا اور

Scanned with CamScanner

نامناسب بھی۔ ریوا نے اپنا سر ڈھک لیا اور منجھلے بھیا نے پل اوور اتار کر چار پائی پر رکھ دیا۔

بڑے بھیا پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوے۔ شاید آج ریوا کے آنے کی بات انھیں پتا چل گئی تھی۔ ہم سب کو چپ دیکھ کر وہ مسکرانے لگے۔ ان کے آنے پر ہمیشہ ہماری بات چیت رک سی جاتی تھی، اور پھر نئے سرے سے کچھ شروع کرنے کا بار ان پر ہی آ جاتا تھا۔

''سب چھت پر بیٹھے ہو... لیکن تم لوگوں کو گھر میں بیٹھنے میں ہی مزہ آتا ہے۔ نیچے کا کمرہ اور اوپر یہ چھت...'' ہم سب کی طرف دیکھ کر انھوں نے کا ایک قہقہہ کا لگایا۔ ''آج تو کہیں پکنک کا پروگرام بنانا چاہیے تھا، گھر پر بیٹھے بیٹھے پتا بھی نہیں چلتا کہ کب نیا سال شروع ہو گیا۔''

بڑے بھیا رک رک کر ریوا کی طرف تاک رہے تھے، لیکن ان کے آنے کے بعد ریوا کا سر جو جھکا تو جھکا ہی رہا۔ گھبراہٹ میں اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلکنے لگیں۔

پکنک کی بات سن کر کانتی ہنس رہی تھی۔ وہ ریوا کو کہنی مار کر اپنی کیفیت اس پر ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

''ریوا دیدی، پکنک پر چلو گی؟''

منجھلے بھیا مکانوں کی قطار کے پیچھے لمبے چوڑے ریتیلے میدان کی طرف ایک ٹک دیکھ رہے تھے، جیسے بڑے بھیا کی باتوں سے انھیں کوئی سروکار نہ ہو۔

''لیکن یہاں پکنک پر جانے کی جگہ ہی کون سی ہے! لے دے کر وہی گنگا کا کنارہ، دیوی کا ٹیلہ... بس۔ چھوٹے شہروں میں رہنے کا یہی تو نقصان ہے۔ کلکتہ میں طبیعت کبھی نہیں اوبتی۔ یہاں آٹھ دس دنوں میں ہی میری طبیعت بھر گئی...''

مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب بڑے بھیا کے ریوا پر رعب گانٹھنے کی تمہید ہو۔

بڑے بھیا نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا لی، پھر ٹائی کی گرہ کو درست کیا اور منڈیر کے سہارے کھڑے ہو کر نیچے سڑک پر جھانکنے لگے۔

میں رہ رہ کر بڑے بھیا کے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ انھیں ریوا کیسی لگی۔ کانتی ریوا کے کان میں پھر دھیرے دھیرے کچھ باتیں کرنے لگی۔

خاموشی کو توڑتے ہوے بڑے بھیا پھر کہنے لگے، ''یہاں فلمیں بھی سارے ہندوستان کا چکر لگا

Scanned with CamScanner

کرآتی ہیں۔ تم نے کلکتہ کا لائٹ ہاؤس نہیں دیکھا... کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ یورپ کے سنیما گھروں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"

"ریوا دیدی کو سنیما پسند نہیں ہے۔ کبھی جاتی ہیں تو..." ریوا نے کہنی مار کر کانتی کو اپنا جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ کانتی ہنستے ہوئے ریوا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑے بھیا نے حیرت سے ریوا کو دیکھا جیسے کانتی کی بات کی سچائی کا اندازہ لگا رہے ہوں۔ پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لیے وہ ہنس دیے۔ "تمھارے شہر میں جو فلمیں آتی ہیں، انھیں دیکھنے کو کس کا دل کرے گا۔ میں تو محض وقت کاٹنے کے لیے وہاں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہاں کوئی کام بھی نہیں ہے۔ نہ کلب، نہ کوئی ملنے جلنے والا..."

موقع پا کر منجھلے بھیا نیچے اتر گئے۔ ریوا نے ایک بار جھجک بھری نظر سے ان کی طرف دیکھا، لیکن کچھ کہا نہیں۔ ان کے لیے بنے پل او ور کو وہ پرسکون انداز میں دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اماں نے کانتی کو بھی نیچے کسی کام سے بلا لیا۔ ریوا بھی اس کے ساتھ نیچے چلی گئی۔ بڑے بھیا کو اس کا چلا جانا اچھا نہیں لگا۔ شاید وہ اکیلے میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے پھر اپنی کتاب اٹھا لی۔ بڑے بھیا ٹہلنے لگے اور میں کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

شام کو پتا چلا کہ بڑے بھیا کو ریوا پسند نہیں آئی۔ وہ انھیں بہت سیدھی سادھی، پچھڑی ہوئی لڑکی جان پڑی تھی جو فوجی زندگی میں اپنے آپ کو بسا نہیں پائے گی۔ وہ ان کے دوستوں کے ساتھ کھل کر بات چیت نہیں کر سکے گی۔ ہم سب ان کا فیصلہ سن کر چونک گئے۔ اماں کو بھی بہت دکھ اور مایوسی ہوئی۔ وہ شاید سوچ رہی تھیں کہ یہ خبر ریوا کی ماں کو کیسے بتا پائیں گی۔ انھوں نے بڑے بھیا سے تھوڑی بحث بھی کی، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ پہلی ہی لڑکی کو دیکھ کر اپنی منظوری دے دینا انھیں اپنی ہتک جان پڑتی تھی۔ کانتی کو بھی دکھ ہوا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بیاہ کے بعد بڑے بھیا آسام چلے جائیں گے اور ریوا گھر میں ہی رہے گی، اسے ایک ساتھی مل جاتا۔ ریوا کو بڑے بھیا نے پسند نہیں کیا، یہ سوچ سوچ کر اس کے غصے کی حد نہیں تھی۔

"بڑے بھیا اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں..." کانتی میز پر جھکے جھکے بولی۔

"لاٹ صاحب، اور کیا..." میں ہنس دیا۔

Scanned with CamScanner

میری ہنسی پر اسے اور بھی غصہ آ گیا۔

''اچھا ہوا جو بڑے بھیا نے انکار کر دیا۔''

کانتی کو میری بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر میرے چہرے پر اپنی نظر گڑائے رہی۔

''بڑے بھیا ریوا کے لائق نہیں ہیں...''

میری بات سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں۔ انھیں تو کسی میم سے شادی کرنی چاہیے۔''

منجھلے بھیا کو بھی یہ خبر مل گئی، لیکن ان کے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا۔ لیکن اس بات کو ہم سب جانتے تھے کہ ریوا کو بہت صدمہ پہنچا ہوگا۔

ہم لوگوں میں اور بڑے بھیا میں فاصلہ پہلے کی نسبت اور بھی بڑھ گیا۔ ہم اسے کبھی بھول نہیں سکے کہ انھوں نے ریوا سے بیاہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ دو تین دن تک ہم ان سے بچنے کی کوشش کرتے رہے۔ بڑے بھیا کے جانے میں کتنے دن باقی ہیں، ہم روز اس کا حساب کتاب لگاتے۔

میرا کالج کھل گیا اور گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے آزادی پانے کے خیال سے مجھے خوشی ہی ہوئی۔

لڑکوں کے بیاہ کے بارے میں دادا نے واضح طور پر سب سے کہہ دیا تھا کہ ان کے پاس صرف کانتی کے بیاہ کے لیے پیسہ ہے، جس لڑکے کو اپنا بیاہ کروانا ہو، اسے پیسہ اکٹھا کرنے کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔ اس بات کو لے کر اماں نے جھگڑا بھی کیا تھا، لیکن دادا اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ اپنی باقی زندگی کے لیے وہ اتنا پیسہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے کہ اپنے کسی لڑکے کے سامنے انھیں ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ انھیں تینوں میں سے کسی پر بھروسا نہیں تھا۔ سنا تھا کہ بڑے بھیا نے تین چار ہزار اپنے بیاہ کے لیے اکٹھا کیا ہوا تھا۔ منجھلے بھیا اپنی تنخواہ دادا کے ہاتھوں میں دھر دیتے تھے، اس لیے ان کے لیے کچھ بھی جمع کرنا ناممکن تھا۔

ایک دن کالج سے گھر لوٹا تو کانتی بڑے اشتیاق سے ہمارے کمرے میں آئی، جیسے میرا انتظار ہی کر رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"آج ایک بڑی عجیب سی بات ہوئی..." وہ میز پر جھک کر میری کتابوں کے ورق الٹنے لگی۔
میں بغیر اس کی طرف دیکھے اپنے جوتے اتارنے لگا۔ اس طرح میرے لوٹنے پر اِدھر اُدھر کی گپیں لڑانا اس کا روز کا پروگرام ہو گیا تھا اور میں اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کیا کرتا تھا۔

"آج دن میں ریوا دیدی کی ماں گھر پر آئی تھیں..." وہ پھر رک گئی۔
اسے اپنی بات پوری نہ کرتے دیکھ کر میں جھلا کر بولا، "تو کیا ہوا؟ وہ تو اکثر ہمارے گھر آتی ہیں۔"

"لیکن ان میں اور اماں میں کیا باتیں ہوئیں... یہی تو سب سے بڑی بات ہے۔"
"کیا باتیں ہوئیں؟"
"تم بتاؤ، تم کبھی سوچ ہی نہیں سکتے..."
"مجھے ان کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں عورتوں کی باتیں نہیں سنتا۔"
"اوہو... بڑے بھیا کی نقل تم بھی کرنے لگے؟ بی اے پاس کر کے بڑے صاحب بنو گے۔ چھی چھی! کتنے شرم کی بات ہے۔"

اس وقت اس سے جھگڑا کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے صلح کی تجویز ہو۔ ریوا کی ماں اور اماں میں کیا باتیں ہوئیں، یہ جاننے کا تجسس مجھ میں بھی کم نہیں تھا۔

"اچھا سنو... ریوا دیدی کی ماں کہہ رہی تھیں کہ جب بڑے بھیا راضی نہیں ہوئے تو منجھلے بھیا کے ساتھ ریوا دیدی کا بیاہ ہو جائے..."

مجھے ایسا لگا جیسا کانتی نے بڑی غیر فطری سی بات کہی ہو۔ "کیسی بے تکی بات کر رہی ہے۔ منجھلے بھیا کا ریوا کے ساتھ بیاہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے..."

کانتی حیرت سے میری طرف گھور رہی تھی۔ "ہو کیوں نہیں سکتا؟ جب ریوا کی ماں خود ہی کہہ رہی تھیں..." پھر لمحہ بھر رک کر بولی، "لیکن اماں نے ٹال مٹول سا کر دیا۔ کہنے لگیں کہ پہلے بڑے بھیا کا بیاہ ہوگا، اس کے بعد ہی منجھلے بھیا کے بیاہ کی بات اٹھائی جا سکتی ہے..." پھر وہ اپنے آپ سے ہی کہنے لگی، "لیکن اگر بڑے بھیا بیاہ نہیں کریں گے تو کیا منجھلے بھیا کا بیاہ ہو ہی نہیں سکتا؟"

Scanned with CamScanner

تبھی مجھے ایسا لگا جیسے اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ مجھے اپنے بھائیوں کے بیاہ کی باتیں نہیں کرنی چاہییں۔

''اگر ریوا دیدی کا منجھلے بھیا کے ساتھ بیاہ ہو جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آ جائیں گی...''

''اب چپ ہو جا کانتی! تجھے دوسروں کی فکر کیوں لگی رہتی ہے؟''

کانتی کو غصہ آ گیا۔ ''ساری بات سن لی اور اب مجھے ہی ڈانٹنے لگے۔''

میں بغیر کچھ کہے سنے منھ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ لیکن منجھلے بھیا کے ساتھ ریوا کے بیاہ کی بات میرے دل میں گھڑ دوڑ لگاتی رہی۔ کیا وہ سچ مچ ریوا سے بیاہ کرنے کو تیار ہو جائیں گے؟ کیا وہ دل ہی دل میں ریوا سے پریم کرتے آئے ہیں؟ وہ کبھی کسی کو اپنے دل کی بات نہیں بتلاتے۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر... اور پھر ایک خاموشی... اسی خاموشی کو کبھی کوئی چیر نہیں سکا۔ لیکن ان کے پاس کچھ بھی تو جمع نہیں ہے، پھر دادا کیسے ان کے بیاہ کی منظوری دے دیں گے۔

اگلے ہی دن جب رات کا کھانا کھا کر ہم تینوں بھائی کمرے میں بیٹھے تھے، کانتی میرا پل اوور بن رہی تھی۔ بڑے بھیا سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ پچھلے پانچ چھ دنوں سے ان کے برتاؤ میں کچھ چڑچڑاپن آ گیا تھا اور اکثر وہ جھنجھلا کر بات کیا کرتے تھے۔ منجھلے بھیا دیوار کا سہارا لگائے بکس پر بیٹھے تھے۔

تبھی اماں رسوئی گھر سے فارغ ہو کر ساڑھی کے پلّو سے اپنے گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں آئیں۔

''پندرہ دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دو تین دن کلکتہ بھی رہوں گا۔ اب دیکھو، چھٹی کب ملتی ہے۔'' بڑے بھیا نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''ارے، میں تو چاہتی تھی کہ اس بار تیرے بیاہ کی بات کہیں پکی ہو جاتی۔ آخر وہاں ہوٹلوں کا کھانا کب تک کھاتا رہے گا...'' اماں بے چینی سے بڑے بھیا کی طرف تک رہی تھیں۔

اپنے بیاہ کی بات سن کر بڑے بھیا کا غصہ اور جھنجھلاہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ ریوا کے علاوہ دو تین جگہ اور بھی اماں نے بات چلائی تھی، بڑے بھیا کو لڑکی دکھانے لے بھی گئی تھیں، لیکن انھیں کوئی پسند نہیں

Scanned with CamScanner

آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اچھی پڑھی لکھی، خوبصورت اور ماڈرن لڑکیوں کے گھر والوں سے ہمارے پاس اب تک کوئی رشتہ نہیں آیا، جس کا سبب ہمارا گھر اور گھر والے ہیں، ورنہ وہ تو اس کے لائق تھے۔

''پرسوں مہاراجن کہہ رہی تھی کہ تین چار گھروں میں اور بھی اس نے بات چیت چلائی تھی، لیکن اتنی دور لڑکی کو بھیجنے میں لوگ گھبراتے ہیں...'' اماں نے اپنی صفائی پیش کی۔ وہ بڑے بھیا کے اس خیال کی تردید کرنا چاہتی تھیں کہ انھوں نے لڑکی ڈھونڈنے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔

''ہوں...'' بڑے بھیا نے ایک اور سگریٹ سلگالی۔ ''دور سب جاتے ہیں، یہ تو بہانہ ہے لوگوں کا...''

''اب کانتی کی ہی بات لو۔ اتنی دور بیاہنے میں میرا تو جی گھبرائے...'' لیکن بڑے بھیا کی اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ ''ہمارے گھر سے بھی لوگ گھبراتے ہیں۔ دادا کو ہم سے کوئی مطلب نہیں ہے، چاہے مریں یا جئیں۔ ایسی باتیں دوسروں سے چھپی تھوڑی ہی رہتی ہیں۔''

کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ اماں نے دادا کے حق میں کچھ نہیں کہا۔

تھوڑی دیر بعد اماں کہنے لگیں، ''تیری بات چیت کہیں پکی ہو جاتی تو منجھلے کی بھی ٹھیک کر دیتی...'' بڑے بھیا کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا، انھوں نے اماں پر ایک کڑی نظر ڈالی۔ پھر غصے بھری آواز میں بولے، ''تو میری بات چھوڑو... میں ایسی ویسی لڑکی کو اپنے گلے نہیں باندھنا چاہتا، ہمارے یہاں ایسی لڑکیوں کا گزارا بھی نہیں ہوسکتا...''

اماں نے پھر اپنی ہی بات کہی، ''ریوا کی ماں آئی تھی۔ وہ لوگ تو منجھلے کے ساتھ ریوا کا بیاہ کرنے کو تیار ہیں، میں نے ہی بات ٹال دی۔ سوچا، پہلے تیری کہیں ہو جائے تو منجھلے کی بات کروں۔ تم لوگوں کی گھر گرہستی بس جائے تو پھر کانتی کے لیے لڑکا تلاش کرنا ہوگا...''

منجھلے بھیا چپ چاپ ایک کتاب پر اپنی نظر جھکائے ہوئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گھر میں کبھی ان کے بیاہ کی بات چلی ہو۔

''ریوا ہے بہت اچھی لڑکی، ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ لیکن شاید اس کے ماں باپ زیادہ رکھنا نہیں چاہتے۔''

بڑے بھیا سیٹی میں کسی گانے کی دھن بجا رہے تھے۔ ریوا کا ذکر سننا شاید انھیں اچھا نہیں لگ رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔ کانتی بے چینی سے سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ ریوا اور منجھلے بھیا کے بیاہ کا فیصلہ جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔

کچھ دیر بعد منجھلے بھیا دادا والے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔

اماں نے پھر دبی آواز میں کہا، ''لیکن یہ نہیں مانیں گے۔ منجھلے کی شادی کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا، پھر سو روپوں میں اپنا اور ریوا کا پیٹ کیسے بھر سکے گا...'' انھوں نے ایک لمبی سانس لی۔ ''منجھلے کو کہیں اچھی جگہ نوکری بھی تو نہیں ملتی...''

بڑے بھیا بولے، ''جب تک آدمی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے، تب تک اس کی شادی کی بات نہیں سوچنی چاہیے۔''

''لیکن ریوا ہے بہت اچھی لڑکی۔ جس کے گھر جائے گی، وہ اپنے بھاگ کو سراہے گا۔''

بڑے بھیا پھر دھیرے دھیرے سیٹی بجانے لگے۔

ہم سب کو یقین تھا کہ دادا منجھلے بھیا کا بیاہ کرنا منظور نہیں کریں گے، پھر ریوا کے بارے میں وہ اتنے مشتاق نہیں تھے جتنی کہ اماں۔ اس کے ماں باپ اتنے دھنی بھی نہیں تھے کہ ریوا سے اپنے کسی لڑکے کا بیاہ کر کے کچھ پانے کا لالچ انھیں اپنی طرف مائل کرتا۔ ہم بڑے بھیا کی تنخواہ اور عہدے پر فخر کر سکتے تھے، لیکن ان کے گھر وہ بھی نہیں تھا۔ ریوا کے دونوں بھائی ابھی تک اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

منجھلے بھیا سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہی۔ ان کے بیاہ کا ذکر گھر میں پھر کبھی نہیں ہوا۔ اماں نے ایک بار گھما پھرا کر دادا کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ ساکت سے ہو کر اماں کی طرف تکنے لگے۔ بولے کہ بڑھاپے کے سبب اماں کا دماغ سٹھیا گیا ہے، گھر میں بہو لانے کے چاؤ میں ان کی بدھی پر پانی پھر گیا ہے۔ اماں نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ دادا سے انھیں بہت ڈر لگتا تھا۔

دھیرے دھیرے ان بیس پچیس دنوں میں ہمارے گھر میں جو واقعات ہو گئے، ان کی اہمیت کو ان دنوں میں نے پوری طرح نہیں جانا تھا۔ لیکن آج جب کبھی منجھلے بھیا کا ان دنوں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے تو محسوس کرتا ہوں جیسے میرے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ جن وجہوں سے ریوا کے ساتھ ان کا بیاہ نہیں ہو سکا، ان کو یاد کر کے ان کے دل میں کتنی اذیت، کتنا احساس جرم ہوا ہوگا، اس کا اندازہ محض میں ہی نہیں لگا سکتا۔ اپنی تنخواہ بڑھانا یا اپنے بیاہ کے لیے روپیہ جمع

Scanned with CamScanner

کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے انھوں نے دوسرا راستہ اپنایا۔ گھر سے برائے نام جوان کے رہے سہے تعلقات تھے، وہ بھی انھوں نے توڑ لیے۔ دفتر سے اب وہ ذرا دیر سے لوٹتے اور پھر کھانا کھا کر فوراً چارپائی سے چپک جاتے تھے۔ ان کی لمبی لمبی بانہیں — جن کی نیلی نسیں بجلی کی روشنی میں چمکا کرتی تھیں — ان کے چہرے سے لپٹ جاتی تھیں، اور ان کے سوکھے الجھے بال ایک جھاڑ جھنکاڑ کا روپ دھارے ہماری طرف دیکھ کر کچھ ان دیکھے اشارے کیا کرتے تھے، جن کی گہرائی میں اس وقت ہم میں سے کوئی نہیں جھانکتا تھا۔ آج ان دنوں کی یاد آتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ریوا کے لیے ان کے دل میں حقیقت میں بہت گہرا لگاؤ رہا ہوگا۔

اِدھر بڑے بھیا کی چھٹیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں، جس سے ان کا دل بھی مایوسی اور جھنجھلاہٹ سے بھرتا جاتا تھا۔ وہ ہم سب سے ناخوش جان پڑتے تھے۔ اپنی نوکری پر انھیں فخر تھا، لیکن اس کے ترازو پر جس لڑکی کو تول کر وہ اپنا لینا چاہتے تھے، وہ انھیں نہیں ملی۔

ایک دن یوں ہی ریوا کا خیال آنے پر میں نے پاس بیٹھی کانتی سے پوچھ لیا، ''آج کل ریوا کسی کتاب کی فرمائش نہیں کرتی؟ پہلے تو ہمیشہ دوسرے تیسرے دن نوکر بھیج دیا کرتی تھی۔''

کانتی نے میری بات پر کوئی شوق نہیں دکھلایا، جس سے مجھے تعجب ہوا۔

اسے چپ بیٹھے دیکھ کر میں نے پھر پوچھا، ''کیا تو ریوا سے ملی تھی؟''

کانتی نے لمحہ بھر تک چپ رہنے کے بعد بغیر میری طرف دیکھے جواب دیا، ''ہاں، تین چار دن پہلے ریوا دیدی کے گھر گئی تھی۔''

''کیسی ہے ریوا؟''

''ٹھیک ہیں۔''

مجھے ایسا لگا جیسے ریوا اور کانتی کے بیچ کوئی سانٹھ گانٹھ ہو گئی ہو، جس کی وجہ سے ریوا کے بارے میں کچھ بھی بتلانے میں وہ ہچکچا رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ ریوا کے بارے میں میری بے چینی دیکھ رہی کانتی اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے چپ بیٹھی ہے، ورنہ ریوا کے بارے میں باتیں کرتے وقت اس کی زبان کبھی نہیں رکتی۔

''میں کل ریوا کے گھر جاؤں گا، کالج سے کچھ کتابیں بھی اسے دے آؤں گا۔''

Scanned with CamScanner

کانتی نے اس بار میری طرف نظر پھیری، مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں بھری ہوئی ہوں، پھر وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی، ''کتابیں مت لے جانا، ریوا دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

میں چونک سا گیا۔ ''کیا ہوا ریوا کو؟''

کانتی نے پھر دھیمی آواز میں کہا، ''مجھے ریوا دیدی نے کچھ نہیں بتلایا...''

میں دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کسی آنے والی بات کے اندیشے سے میں کانپ اٹھا۔ کانتی نے غیر معمولی طور پر اپنا چہرہ اتنا سنجیدہ بنا رکھا تھا کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ پھر اس نے میرے سوالوں کے جواب اتنے مختصر کیوں دیے؟

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ریوا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ اب تک کی تین چار برسوں کی جان پہچان میں میں نے ریوا کو کبھی بہت سنجیدہ یا اداس اور دکھی نہیں دیکھا تھا، اور اس وقت اس کی کیفیت کا تصور کرنا میرے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ اگرچہ ان دنوں میری عمر ایسی نہیں تھی کہ اس طرح کے واقعات کا میرے دل پر کوئی گہرا اثر پڑتا یا ان کی اہمیت جان سکتا، لیکن گھر کے حالات نے مجھے اس قابل کر دیا تھا کہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں کی طرح میں ان سب مسئلوں کو ٹال نہیں سکا۔

تبھی منجھلے بھیا اپنے دفتر سے واپس لوٹے؛ ہم دونوں کو چپ بیٹھے دیکھ کر وہ جھینپ سے گئے۔ شاید ان کا اندازہ تھا کہ ان کے آنے سے پہلے ہم دونوں باتیں کر رہے تھے اور ان کے آنے پر چپ ہو گئے۔ انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی، پھر ہم دونوں کی طرف باری باری سے دیکھتے ہوئے بولے، ''آج باہر بہت سردی ہے، شاید رات کو پانی پڑے گا...''

ان کا کوٹ کہنیوں پر بہت گھس گیا تھا اور بغیر پھٹے وہ یہ سردیاں پار کر لے گا، اس پر مجھے شک تھا۔ قمیض میں اوپر کے دو بٹن نہ ہونے کے سبب ان کی چھاتی کے بال دکھائی دے رہے تھے۔ دن بھر کی دفتر کی مصروف زندگی کے سبب ان کے بال ان کے ماتھے پر بکھر آئے تھے۔ بکس پر بیٹھ کر وہ اپنے جوتے کھولنے لگے۔ میں کن انکھیوں سے لگاتار ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کانتی نے ان کے آنے پر انھیں دھیان سے ایک بار دیکھا تھا اور پھر اپنی پڑھائی میں ڈوب گئی تھی۔ اگر منجھلے بھیا کماتے نہ ہوتے یا بڑے بھیا کی طرح گھر سے باہر رہتے، تو دادا کبھی مجھے آگے پڑھانے کو تیار نہ ہوتے۔ میرے انٹر پاس کرنے کے بعد آگے پڑھنے کے سوال پر انھوں نے بھی دادا سے میری سفارش کی تھی۔ اس لمحے نہ

Scanned with CamScanner

جانے کیوں میرے دل میں منجھلے بھیا کے لیے احساسات کا بہاؤ تیز ہو گیا۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکا، یہ سوچ کر مجھے اپنے آپ ایک احساس جرم سا ہونے لگا۔

وہ وہی پل اوور پہنے ہوئے تھے جو ریوا نے ان کے لیے بنا تھا۔ ریوا کی بیماری کی خبر انھیں معلوم نہیں ہوئی۔ معلوم بھی ہوتا تو وہ کر کیا سکتے تھے؟ کبھی کبھی میری خواہش ہوتی کہ وہ اپنے سکھ دکھ، اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ قدم بڑھائیں۔ وہ کیوں نہیں دادا سے صاف صاف کہتے کہ وہ ریوا سے بیاہ کریں گے۔ اگر زور دے کر وہ اپنی بات کہیں تو دادا آسانی سے مخالفت نہیں کر پائیں گے۔

ان دنوں اکثر خالی بیٹھے بیٹھے منجھلے بھیا کی بات دیر دیر تک میرے دماغ میں گھومتی رہتی تھی۔ کبھی سوچتا کہ ڈیڑھ سال میں میں بی اے پاس کر لوں گا، پھر کہیں نہ کہیں میری نوکری لگ جائے گی۔ میرا خرچ ہی کیا ہوگا، میں بڑی آسانی سے اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ منجھلے بھیا کو دے دیا کروں گا، جس سے ان کا اور ریوا کا گزارا ہو جائے گا، اس صورت میں دادا انکار نہیں کر پائیں گے۔ پھر اماں کی بات یاد آتی کہ ریوا کے ماتا پتا زیادہ رکیں گے نہیں، اور کانتی نے بھی کہا تھا کہ ریوا کے بیاہ کی بات کہیں اور چل رہی ہے۔ اور تب میرا دل کہتا کہ پڑھائی چھوڑ کر مجھے کہیں نوکری کر لینی چاہیے تاکہ منجھلے بھیا کا فوراً بیاہ ہو جائے۔ لیکن اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔

بڑے بھیا کے واپس لوٹنے کے دن بہت قریب آتے جا رہے تھے۔ اپنی دو مہینوں کی چھٹیوں میں انھیں کتنی مایوسی ہوئی، یہ بات گھر میں کسی سے چھپی نہیں تھی۔ ایک دن دادا اور ان کے بیچ کافی جھگڑا ہو گیا اور ہمیں ڈر لگا کہ کہیں وہ اپنا سامان باندھ کر فوراً آسام کے لیے روانہ نہ ہو جائیں۔ بڑے بھیا نے سب گھر والوں، گھر کے منحوس ماحول اور پیسے کی کمی کے سبب ہماری مفلسی پر نکتہ چینی کی تو دادا اس الزام کو آرام سے سہہ نہیں سکے۔ ”تم نے ہی کب گھر کی فکر کی؟ کبھی یہ تو ہوا نہیں کہ وقت وقت پر یہاں کچھ روپے بھیج دیا کرتے۔ جو کماتے ہو سب اپنے ہی لیے تو خرچ کرتے ہو۔“

بڑے بھیا کو بھی غصہ آ گیا۔ آپے سے باہر ہو کر وہ تیز آواز میں بولے، ”میری پروا بھی کسی نے کی؟ وہاں مرتا ہوں یا جیتا ہوں، اس کی کھوج خبر کون لیتا ہے؟ اور اب صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر کسی عیسائی ویسائی سے میں نے شادی کر لی تو آپ کچھ مت کہیے گا...“ اور وہ دادا کے کمرے سے اٹھ آئے۔ دادا کتنی ہی دیر تک اکیلے بڑبڑاتے رہے۔ بڑے بھیا کے سامنے آ کر کچھ کہنے کا حوصلہ ان میں

نہیں تھا۔ اماں رسوئی گھر میں بیٹھی چپ چاپ روتی رہیں اور کانتی نے ایسا ظاہر کیا جیسے ان جھگڑوں سے اسے کوئی مطلب نہ ہو۔

سارے گھر پر نحوست کا سایہ اترا جان پڑتا تھا۔ کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا تھا۔ سب کے چہروں پر ان دنوں ایک طرح کی بے بسی سی تھی، جیسے ان کی خواہش کے خلاف انھیں کسی بات کا پابند کر دیا گیا ہو۔ سب اپنی حدوں کی کڑی زنجیروں میں بندھے جان پڑتے تھے۔ گھر کے ماحول میں پہلے کبھی ایسا تناؤ نہیں آیا تھا۔

ایک دن کالج سے چھٹی ہونے پر فوراً فیصلہ کر لیا کہ گھر پہنچنے سے پہلے آج ریوا کے گھر ضرور جاؤں گا۔ لائبریری سے دو کتابیں بھی اس کے لیے لے لیں۔ ریوا کے گھر جانے کا میرے پاس اچھا بہانہ تھا۔

اس کے گھر کے برآمدے میں ہی سب سے پہلے ریوا کی ماں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے پہچان کر انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''بہت دنوں بعد آیا ہے...''

''کالج میں پڑھائی ذرا زیادہ تھی، اس لیے وقت نہیں ملا...'' میں ان کے پاس ہی رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھر پر شاید کوئی نہیں تھا، کیونکہ کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ برآمدے کی بتی جلانا بھی شاید بھول گئی تھیں۔

''گھر پر تو سب ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں...'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا، ''ریوا کہاں ہے؟''

''اوپر چھت پر ٹہل رہی ہوگی۔ کیا اس کے لیے کتابیں لایا ہے؟ اچھا ہی ہے، کتابوں سے بے چاری کا جی بہلتا رہتا ہے۔ جا، چھت پر ہی چلا جا۔''

میں زینہ چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ ریوا کی ماں سے جلدی چھٹکارا پا لینے سے مجھے خوشی ہوئی۔

میری آہٹ ریوا تک جا پہنچی تھی، اسی لیے چارپائی پر بیٹھی وہ زینے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار چھت کو دیکھا اور پھر چارپائی پر نظر پڑتے ہی اس کی طرف بڑھ گیا۔ ریوا نے اپنی ساڑھی ٹھیک کر لی اور ذرا سکڑ گئی تاکہ میں اس کے سامنے ہی چارپائی پر بیٹھ جاؤں۔

''تمھارے لیے دو ناول لایا ہوں ریوا...'' میں دھیرے سے چارپائی کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور

Scanned with CamScanner

لمحہ بھر کے لیے اس کی چر چراہٹ گونج گئی۔

ریوا کچھ نہیں بولی۔ اس اندھیرے میں ریوا کے چہرے کو واضح طور پر دیکھنا ناممکن تھا۔ اتنے دنوں بعد مجھے دیکھ کر وہ کیا سوچ رہی ہوگی، یہ جاننے کی خواہش میرے دل میں کم نہیں تھی۔ ریوا کے بال بہت کس کر پیچھے بندھے ہوئے تھے جس سے اس کا چہرہ زیادہ چوڑا دکھائی دیتا تھا۔

''تم بہت دنوں سے ہمارے گھر نہیں آئیں ریوا...''

ریوا تھوڑا ہلی، لیکن ہونٹ بند ہی رہے۔ اس نے اپنی بانہیں بھی ساڑھی سے ڈھک لیں اور گٹھری سی بنی وہ چھت کی منڈیر کی طرف دیکھتی رہی۔ اوپر آسمان میں اپنے گھونسلوں کو لوٹتے ہوئے پرندے اپنی ٹولیاں بنا کر اڑے جا رہے تھے۔

شاید ریوا چاہتی ہے کہ میں چلا جاؤں۔ کتابیں اسے دے دی ہیں۔ اب رکنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اس طرح لوٹ جانا مجھے غیر فطری سا لگا۔

''کانتی کیسی ہے؟'' اس کی کانپتی سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ریوا کے لیے باتوں کا سلسلہ آگے بڑھانا کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن اس وقت ایسا جان پڑا جیسے اس چھوٹے سے جملے کو کہنے کے لیے اسے بہت تیاری کرنی پڑی ہو۔

''ٹھیک ہے، لیکن ریوا...'' اچانک میں نے محسوس کیا جیسے میں اپنے دل کی ساری باتیں کھول کر ریوا کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔ اس لمحے کچھ بھی چھپانے کو میرا دل نہیں ہوا۔ اس لمحے پہلی بار میں نے ریوا کی قربت کو محسوس کیا، جیسے ہم دونوں کے بیچ کہیں کوئی پرچھائیں تک نہ ہو۔

''گھر کا ماحول آج کل بہت عجیب سا ہے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا جیسے ہم سب ایک خاندان کے افراد نہ ہوں، ویٹنگ روم میں اکٹھے ہوئے مسافر ہوں۔ بڑے بھیا واپس لوٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ دادا سے ان کی بول چال تک بند ہے۔ ان کی شادی بھی کہیں طے نہیں ہو سکی۔ منجھلے بھیا دفتر سے دیر سے لوٹتے ہیں، نہ جانے کہاں گھومتے پھرتے ہیں۔ اماں جب اکیلی رہ جاتی ہیں تو رونے لگتی ہیں۔''

اس اندھیرے میں بھی مجھے ایسا لگا جیسے ریوا بات سن کر چونک سی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جیسے جو کچھ میں نے نہیں کہا، اسے جاننے کے لیے وہ میری طرف دیکھ رہی ہو۔

Scanned with CamScanner

مجھے ایسا جان پڑا جیسے میں نے ریوا کو کوئی لمبی کہانی سنائی ہو۔ کالج کی تھکان مٹانے کے لیے میں نے اپنے پاؤں پسار لیے۔ اتنی دیر بعد ان حالات میں ریوا کے ساتھ اکیلے میں ملنے کی جو جھینپ، جو ہچکچاہٹ تھی، وہ دھیرے دھیرے دور ہو گئی تھی۔

''کیا سیدھے کالج سے آ رہے ہو؟'' ریوا نے شاید اس موضوع کو بدل دینا ہی مناسب سمجھا۔

''ہاں...''

''چائے پیوگے؟''

''نہیں، پی کر آیا ہوں کالج کے کیفے سے...''

چھت کو چھوتی ہوئی املی کے پیڑ کی ٹہنیوں پر طوطوں کا ایک جھنڈ آ بیٹھا تھا اور ان کی ٹیں ٹیں کے شور میں بات نہ کرنے سے بھی دو آدمیوں کے بیچ کی خاموشی اکھرتی نہیں تھی۔ ریوا کے ساتھ کبھی اکیلے میں اتنی آزادی سے بات چیت نہیں کی تھی۔

اچانک ریوا نے ذرا جذباتی آواز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''اچھا، ایک بات سچ سچ بتاؤگے؟''

''تمھارے آگے جھوٹ بولنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے،'' میں نے ہنس کر کہا، ''تم جھٹ سے دل کی بات پتا لگا لیتی ہو۔ یاد ہے نا ریوا، پچھلی دیوالی پر جب ایک دن ہم سب فلیش کھیلے تھے تو جب بھی میں بلف کھیلنے کی کوشش کرتا تو تم میرے چہرے کو دیکھ کر میرے پتوں کو جان جاتی تھیں۔''

ریوا نے ٹھہری ہوئی آواز میں سر جھکائے ہوئے پوچھا، ''کیا گھر میں کبھی میرا ذکر ہوتا ہے؟''

ریوا کی آنکھوں کو لمحہ بھر کے لیے دیکھ لیتا تو شاید اس شام کو مجھے بہت سی باتیں پتا چل جاتیں اور اتنا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا کہ اس کے چہرے کو پکڑ کر اوپر اٹھا لیتا۔ بعد میں ایسا نہ کرنے پر مجھے بہت پچھتاوا ہوا۔

میں نے ریوا کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بیٹھا بیٹھا سامنے ریت کے میدان کے پار ایک مکان کی دھندلی روشنی کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے ریوا پر نظر ڈالی تو اس کے گالوں پر آنسوؤں کی بوندیں چمکتی دکھائی دیں، جنھیں پونچھنا وہ شاید بھول گئی تھی، یا انھیں مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کچھ دیر تک انھیں دیکھتا رہا، لیکن منھ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ اس لمحے نہ

Scanned with CamScanner

جانے کیسے یکا یک مجھے اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا، جیسے اب تک میں اسے بھولا ہوا تھا۔

''ریوا...''

وہ ہلی ڈلی نہیں۔ نہ جانے میری آواز اس کے کانوں تک پہنچی یا نہیں۔

''ریوا...'' میں نے ریوا کا کندھا پکڑ کر اسے ہلایا۔

تبھی ریوا کی سسکیوں کو سن کر کسی نا معلوم اندیشے سے میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ ریوا نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپالیا۔ اس کے اس طرح کے طرز عمل کا میں نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ چپ چاپ اس کے سر پر جمے کالے بالوں کو سہلاتا رہا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے گھٹنے پر لپٹی اس کی بانہیں ایسی ہی ہوں جیسے منجھلے بھیا جب رات کو لیٹتے تھے تو ان کے لمبے لمبے ہاتھ ان کے سر کو تھامے رہتے تھے۔ دونوں میں کہیں کوئی مشابہت تھی۔

آسمان پر رات کے اندھیرے کی چھاؤں ابھری تھی اور چھت پر میں ریوا کے ساتھ اکیلا چارپائی پر بیٹھا تھا۔ آج بھی جب کبھی اس شام کی یاد آتی ہے تو لگتا ہے جیسے اس شام کو میں نے جو کچھ کھودیا تھا، اس کا خالی پن ابھی تک میرے دل میں موجود ہے۔

اس کی سسکیاں دھیرے دھیرے بند ہو گئیں۔ کب وہ بالکل پر سکون ہو گئی اور کب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھالیا، اس کا پتا مجھے نہیں چل سکا۔ وہ اس طرح شانت، خاموش سی بیٹھی تھی جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں نیچے آگئے، اور ریوا کی ماں کو پرنام کر کے میں گھر لوٹ آیا۔

کتنے ہی دنوں تک ریوا کی پرچھائیں چوبیسوں گھنٹے میری آنکھوں کے سامنے ڈولا کرتی، جس سے چھٹکارا پانا مجھے ناممکن سا جان پڑتا تھا۔ ریوا کے لیے ان دنوں جو میں نے محسوس کیا تھا، اس کی یاد کر کے آج بھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ جو بڑے بھیا نہیں کر سکے، جس میں منجھلے بھیا ناکام رہے، اسی ریوا کو اپنانے کا خیال میرے دل میں گھڑ دوڑ لگاتا تھا، لیکن اس بات کو سوچ کر شرم سے میرا سرا کیلے میں بھی جھک جایا کرتا تھا۔ کہیں کوئی آواز مجھ سے کہتی کہ میں نیچ ہوں، ایسا سوچنا بھی پاپ ہے۔ لیکن وہ بات میرے دل سے کبھی دور نہیں ہوتی تھی، حالانکہ جانتا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

❊❊

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

ایک چہرہ

پیپل کے گھنے پیڑ کے نیچے چبوترے پر ہم تینوں بیٹھے ہیں۔ سب چپ ہیں۔ سردی سے بچنے کے لیے میں دونوں گھٹنوں کو سمیٹے، ان پر اپنی کہنیاں ٹکا کر، جھکا ہوا سامنے دیکھے جا رہا ہوں، جہاں ایک مکان کی مٹیالی سی دیوار اور دیوار کے بیچوں بیچ بند کھڑکی کے کالے شکستہ تختے دکھائی دیتے ہیں، جو شاید ایک عرصے سے کبھی کھولے نہیں گئے۔ کچھ غیر واضح سی آوازیں ہیں، لیکن ان سے اوپر اٹھا ہوا جو کچھ واضح ہے وہ ہے ہم سے کچھ دوری پر بیٹھے ہوئے اس اندھے کی ہارمونیم میں ڈوبی آواز۔ جب اس کی آواز رکتی ہے تو پرانے ہارمونیم پر انگلیوں کے دباؤ سے 'پھٹ پھٹ' کی آوازیں نکلتی ہیں، جو اس کے سنگیت کا ایک لازمی حصہ بن گئی ہیں اور اب اکھرتی نہیں۔

اس سے دو سیڑھیاں اوپر سفید ساڑھی میں لپٹی ایک عورت کھڑی ہے۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبے ہوئے ہیں اور نظر گھاٹ کے پار ریت اور جھاڑیوں سے پرے کہیں اٹکی ہوئی ہے۔ عمر زیادہ نہیں۔ لباس سے پتا نہیں چلتا کہ شوہر زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ہیں جو اکیلے یا اپنی ٹولیوں میں سیڑھیوں پر اوپر جا رہے ہیں، نیچے اتر رہے ہیں۔

ساتھ بیٹھی بہن پر نظر جاتی ہے، پر ان کا چہرہ اندھیرے میں کھو گیا جان پڑتا ہے۔ چپ چاپ آنکھوں کو چھوٹے سے دائرے میں سمیٹے، ہاتھ میلی ساڑھی کے اندر نہ جانے کہاں دبکے ہوئے اور بال اتنے کس کر جوڑے میں بندھے ہیں کہ ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔

Scanned with CamScanner

سورج پیچھے، بہت دور نہ جانے کہاں ڈوبا ہے۔ سامنے دکھائی دیتی ہے اجالے کی ایک جھینی سی چادر، جس کی پرچھائیں پانی پر چمک رہی ہے اور دکھائی دیتے ہیں تیرتے ہوئے کچھ چھوٹے چھوٹے بلبلے اور ناووں کی کالی پرچھائیاں...

''چلیں!''

لیکن، بہن کے کانوں تک میری آواز نہیں جاتی۔

وہ چنڈی داس کا کوئی گیت ہے، جو اندھا اکثر گایا کرتا ہے۔

جب چھٹیوں میں یہاں آتا ہوں تو ہر شام کو ہم اس چبوترے پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب یہاں نہیں رہتا تب بھی کبھی کبھی شام کو مجھے یہ آواز سنائی دیتی ہے اور کتنی ہی جھلکیاں میری آنکھوں کے سامنے گزرنے لگتی ہیں۔ میری غیر موجودگی میں بھی بہن روز یہاں آتی ہیں، کبھی اکیلی، کبھی نیمو کے ساتھ، لیکن تب چبوترے پر بیٹھتی نہیں۔ پورے گیت نہیں سن پاتیں۔ لیکن لگ بھگ سب گیت انھیں یاد ہیں۔

''چلو''، بہن کی دھیمی سی آواز مجھ تک پہنچتی ہے۔

میں نیمو کی انگلی پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جب بازار تک پہنچتے ہیں تو میں اس کی کلائی تھام لیتا ہوں۔ وہ کسی کی بھی مزاحمت نہیں کرتا، وہ اس طرح کے بندھنوں کے سلسلے میں بے پروا ہے۔

گلی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں مکان ہے، دوسرے مکانوں جیسا ہی۔ نہ دروازے پر نمبر ہے، نہ کوئی ایسی علامت جو اسے دوسروں سے الگ رکھ پاتی۔ کوئی بتی نہیں، لیکن برسوں سے یہاں رہنے والے لوگ بے خوفی سے رات کو بغیر بھولے بھٹکے اپنے دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ دروازے سے اندر گھستے ہی سامنے آنگن ہے، جہاں سے بدبو کی ایک لہر رات کو اوپر اٹھتی ہے۔ ہم تیسری منزل میں رہتے ہیں۔ پہلے میں بھی یہیں رہتا تھا، برسوں رہا ہوں۔ پھر نوکری مل جانے پر مجھے دوسرے شہر چلا جانا پڑا۔ اب صرف چھٹیوں میں ہی یہاں آپاتا ہوں۔

دن کے وقت بھی مکان میں زیادہ شور نہیں ہوتا۔ نیچے بوڑھے مکان مالک اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ دوسری منزل میں ایک بنگالی خاندان، جس کے افراد ہمیشہ دبی دبی آوازوں میں بات چیت کرتے ہیں اور سورج چھپنے پر کھانا کھا کر بتی بجھا دیتے ہیں۔ شام کو ہی ایسا اندھیرا اور سناٹا چھا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

جیسے آدھی رات کا وقت ہو۔ کبھی دیر سے واپس گھر لوٹنے پر آنگن کے بیچ میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے پر تاروں کی چھاؤں میں ننگی ننگی کالی دیواریں بہت ہیبت ناک سی جان پڑتی ہیں۔

بہن رسوئی میں جا کر ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ نیمو کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگا کر پھر جنگلے کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کھلی کھڑکی میں سے نیچے گھاٹ پر جلتی روشنی دیکھتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ کھیلنے کی میری بہت خواہش ہوتی ہے، لیکن اس کی خاموشی اتنی گھنی ہے، اس کا چہرہ اپنی پرچھائیں میں ہی اس طرح ڈوبا رہتا ہے کہ اس کی موجودگی میں اکیلے مجھے ڈر سا لگتا ہے۔

کل بہن نے کہا تھا، ''نیمو سہ ماہی امتحان میں فیل ہوا ہے۔ یہی حال رہا تو سالانہ امتحان میں بھی فیل ہو جائے گا۔''

میں چپ چاپ دری پر بیٹھی بہن کی طرف دیکھتا رہا۔

''اس کا پڑھائی میں جی ہی نہیں لگتا،'' لمحہ بھر بعد پھر کہا، ''اس کا کیا ہوگا!'' ان کی آواز رُندھ سی گئی۔

ہاں، اس کا کیا ہوگا؟ لیکن اس کا جواب میرے پاس کہاں ہے! خواہش ہونے پر بھی میں تسلی کے دو لفظ نہیں کہہ پاتا۔ کمرے کے اندر جلتی دھیمی روشنی باہر کے اندھیرے کی نسبت بھیانک لگتی ہے۔ نیمو کے ہٹنے پر میں کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں۔ باہر پھیلا ہوا گہرا سکوت، ریت کا میدان، جھاڑیاں اور آسمان، سب مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ یہ میرا کمرہ تھا۔ اندر اُوب جانے پر اس کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر نہ جانے کتنا وقت میں نے اسی طرح گزارا ہے۔ اب بھی جب گھر آتا ہوں تو لگتا ہے جیسے لمبی سیر کے بعد واپس آ گیا ہوں۔

بہن تھالی پروس کر چٹائی پر رکھ دیتی ہیں۔ میں اور نیمو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کھانا کھاتے ہیں۔ بہن چپ چاپ ہماری طرف دیکھ رہی ہیں۔ ساڑھی کا پلّو ان کے سر سے کھسک کر کندھے پر جھولنے لگا ہے۔ اس کا احساس جب ہوگا تب سر ڈھک لیں گی۔

درگا کے مندر سے آرتی کے وقت بجتے گھنٹے، گھڑیال اور شنکھ کی الجھی سی آواز کمرے تک پہنچ رہی ہے۔ جب بہن کا بیاہ نہیں ہوا تھا تو ہم دونوں ہر شام کو آرتی دیکھنے جاتے تھے اور دو بتاشوں کے پرساد کی کشش ہمیں پوری آرتی دیکھنے کے لیے مجبور کرتی تھی۔ تب میری عمر نیمو کے برابر ہی رہی ہوگی۔

Scanned with CamScanner

سامنے بیٹھا نیمو آنکھیں جھکائے کھانا کھا رہا ہے۔ میری موجودگی میں اسے ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی، نہ کسی طرح کا ڈر۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور ماتھے پر بکھرے بال، جو پلکوں کو چھوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ بہن نے صاف طور سے نہیں کہا، لیکن میں بھی دوسروں کی طرح یہی سوچتا ہوں کہ وہ نیمو کے بارے میں کوئی آس دل میں چھپائے ہیں اور کسی ایک لمحے کا انتظار کر رہی ہیں۔

باہر رات دھیرے دھیرے، بے آواز پگھلتی جا رہی ہے۔ شام کو گھاٹ پر کھڑی ہوئی اس بنگالی عورت کا دھندلا اور اجنبی سا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ دل میں تجسس جاگا ہے کہ اس کا شوہر مر گیا یا زندہ ہے! صورت حال جو بھی ہو، لیکن اس کی آنکھوں میں جھانکتی اداسی زندگی کا تمام اکیلا پن اپنے میں چھپائے ہوئے تھی۔

صبح تڑکے ناشتہ کر کے میں باہر گھومنے نکل جاتا ہوں۔ نیمو کے اسکول چلے جانے کے بعد گھر میں کچھ اکیلا سا لگنے لگا۔ یوں بغیر کسی جلدی کے کھڑکی میں سے آتی دھوپ سینکتے ہوئے ایسے ہی خالی بیٹھے رہنا مجھے اچھا ہی لگا تھا، لیکن پھر اکتانے لگا۔

گھاٹ سے اوب جانے کے بعد پار چلا گیا۔ ریت کا چوڑا اجلا تٹ دھوپ میں چمک رہا ہے، پھر اس کی سرحد جھاڑیوں اور چٹانوں میں کھو گئی ہے۔ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا آگے چلا جا رہا ہوں۔ ریت کے کمزور ڈھیلے میرے پیروں کے نیچے دب کر کچل جاتے ہیں۔ ٹھنڈی خاکی جینز کی پینٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں، ان کا بغیر کسی سہارے کے نیچے جھولتے رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ماں کو میرے دوسرے شہر جا کر نوکری کرنے پر دکھ ہوا۔ یہاں ہم برسوں سے رہ رہے ہیں۔ خواہش ہونے پر بھی مکان چھوڑ کر ماں میرے ساتھ مستقل نہیں رہ سکیں۔ انھیں ڈر ہے کہ ان کی موت کے وقت میں ان کے پاس نہیں رہوں گا۔ یہ ایک دن بہن نے مجھے کہا تھا۔ لیکن چارہ ہی کیا ہے!

تٹ کے قریب ہی کھڑی دو ناؤوں پر کچھ لڑکے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ ان سے تھوڑی دور میں بھی ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ چاروں طرف گھنی خاموشی پھیلی ہے۔ اوپر خالی آسمان کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کیا ایسے ہی چھٹیوں کے دس دن گزریں گے؟

پرسوں رات کو جب اسٹیشن سے گھر آ رہا تھا تو رکشے میں بیٹھے ہوئے سڑک پر اکتائے ہوئے

Scanned with CamScanner

اندھیرے کی پرچھائیوں میں مجھے بہت اکیلا اکیلا سا لگا تھا۔ بجلی کے کھمبے کی روشنی کہرے کی پتلی جلد سی جان پڑ رہی تھی۔ نیمو شاید مجھ سے چھوٹا سا تحفہ پانے کی امید کر رہا تھا۔ میرے ٹین کے بکس پر اس کی اشتیاق بھری نظر کچھ کھوجتی ہوئی جب جب جانکتی تو مجھے لگتا جیسے میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہو۔ بہن کے کہنے پر بھی وہ سویا نہیں، بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ آخر میں بتی بجھا کر جب ہم لیٹے تو اس کی کھلی آنکھیں کتنی ہی دیر تک میرے سامنے گھومتی رہیں۔

کچھ دوری پر سفید پال لگی پانچ چھ ناووں کا جھنڈ چلا آ رہا ہے۔ یہ بچپن کی ایک ایسی یاد ہے جو اتنے برسوں کے بعد بھی دھندلی نہیں پڑتی۔ تب بھی ایک خواہش اٹھا کرتی تھی کہ اس طرح ایک ناؤ میں بیٹھ کر لمبا سفر طے کر کے سمندر کے کنارے پہنچ جاؤں جہاں ندی ڈوبتی ہے۔ آج بھی یہ خواہش جوں کی توں قائم ہے، پر اب یہ کبھی پوری ہو پائے گی اس پر شک ہونے لگا ہے۔

سورج سر کے اوپر آ گیا ہے۔ آنے والی دوپہر دکھائی دینے لگی ہے۔ کھڑے ہو کر پینٹ سے ریت پونچھتے وقت اتنی تھکن محسوس ہو رہی ہے جیسے میلوں کا سفر پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ نیمو ابھی اسکول سے واپس نہیں لوٹا ہوگا، اس خیال سے گھر جانے کی بات سوچ کر شوق نہیں ہوا۔

جب انوپ یہیں تھا تو اکثر بہت سا وقت ایک ساتھ گزارا کرتے تھے۔ اس پار ریت کے ٹیلوں پر کتنی ہی شامیں اور سردیوں کی دوپہریں اکٹھی گزاری تھیں۔ گھنٹوں لیٹے ہوئے آسمان کی سمت تکتے رہتے تھے اور یہ سوچتے تھے کہ شاید اوپر کوئی معجزہ ہوگا، ہمارے تخیل کو پر لگا دے گا۔ لیکن ہر بار ایسا ہی لگا جیسے اوپر کا خلا ہر لمحے ہم سے دور کھسکتا جا رہا ہو۔

جب انوپ شہر چھوڑ کر چلا گیا تو کچھ دن تک ہر وقت اس کی یاد آتی رہی تھی۔ رات کو جب دور سے گاڑی کی آواز سنائی دیتی تو لیٹے لیٹے مجھے وہ دن یاد آتا جب میں پلیٹ فارم پر کھڑا اندر سیٹ پر بیٹھے ہوئے انوپ کو دیکھ رہا تھا۔ کوشش کرنے پر بھی ہم ایک دوسرے سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔

نیمو کو دیکھ کر جیجا کی شکل سے ملتا جلتا چہرہ یاد آتا ہے، اگرچہ اکیلے کبھی واضح طور پر ان کی شکل یاد نہیں آتی۔ ان سے بہت کم بار ہی ملاقات ہو پائی تھی۔ نیمو کے پیدا ہونے پر ماں کے ساتھ میں کچھ دنوں کے لیے ان کے گھر جا کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ رہنے والے دھیمی طبیعت کے تھے۔ ان کے چاروں طرف کہرے کی ایک گھنی چادر سی لپٹی رہتی تھی۔ پتا نہیں بہن ان کے اندر جھانک پائی تھیں۔

ان کی موت کے بعد جب بہن نیمو کے ساتھ ہمارے گھر پر ہی رہنے لگیں تو کچھ دنوں تک نیمو کی موجودگی میں مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ وہی ہچکچاہٹ تھی جو میں جیجا کے سامنے محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی عمر کے لڑکوں سے کتنا مختلف ہے! ویسی ہی خاموشی، وہی بے تعلقی اور چہرے پر چھایا ایک غیر یقینی پن...

''اس کا کیا ہوگا؟'' بہن کے سوال پر مجھے ہنسی سی آتی ہے۔

میں جب گھر پر رہتا تھا تو ہر شام کو نیمو کے ساتھ لمبی سیر کے لیے جاتا تھا۔ بھیڑ میں جب اس کا ہاتھ تھام لیتا تو مجھے لگتا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ اس لمس سے ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ اس کا لمس مجھے بھی اچھا لگتا ہے، لیکن جب اس کے چہرے کو دیکھتا ہوں تو اس کے ہاتھ کی گرمائی برف جیسی ٹھنڈی جان پڑتی ہے۔

چھٹیوں سے پہلے گھر جانے کے تصور سے ایک طرح کی کپکپی سارے جسم میں ہونے لگتی ہے اور ریل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کتنی ہی پرانی تصویریں کھڑکی میں سے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ لیکن اسٹیشن آتے آتے وہ سب تصویریں ایک خالی پن میں کھو جاتی ہیں۔ ماں، بہن، نیمو، تینوں کے الگ الگ چہرے، لیکن تینوں کو ایک ساتھ باندھتا ہوا کوئی کردار اور گلی کا وہ مکان، مکان کے دو کمرے اور کھلی کھڑکی میں سے دکھائی دیتا ہوا ریت کا میدان، جھاڑ جھنکاڑ، سب کچھ اسٹیشن کے قریب آتے آتے واضح ہوتا جاتا اور میرے اندر کہیں بنی کھائی گہری ہونے لگتی۔

بنگالی خاندان کے کسی فرد سے جب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مڈھ بھیڑ ہو جاتی تو لگتا جیسے سامنے سے کسی کی پرچھائیں گزر جاتی ہو۔ نہ کوئی مسکراہٹ، نہ مزاج پرسی کے دو لفظ۔ سنتا ہوں، ایک وقت کلکتہ میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ لاکھوں کی جائیداد تھی۔ گھر پر موٹر گاڑی، نوکر، سب کچھ تھا۔ اب کچھ نہیں رہا۔ کچھ برس پہلے جب جوان لڑکے کی موت ہو گئی، تب بھی نہ کوئی چیخا نہ زور سے رویا، بس ایک سناٹا چھایا رہا۔ کب لاش کو اٹھا کر لے گئے، یہ بھی پتا نہ چلا۔ مکان مالک اور ان کی بیوی بہت بوڑھے ہیں، دکھائی نہیں دیتا، اونچا سنتے ہیں۔ ہر مہینے کرایہ دینے کے سوا ان کے ساتھ تعلق نہیں کے برابر ہی ہے۔

''نیمو ذرا بڑا ہو جائے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔ یہاں نہ ٹھیک سے پڑھائی ہو پاتی ہے، نہ کسی کا ڈر ہے۔ یہاں لڑکوں کی صحبت میں خراب ہوا جا رہا ہے،'' بہن کہتی ہیں۔ وہ اسی طرح کی باتیں

Scanned with CamScanner

کرتی ہیں، جن کا ربط میں کبھی سمجھ نہیں پاتا۔

پچھلے تیس سال سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ یہیں پتا جی کی موت ہوئی تھی، اس کے ساتھ ماں کی زندگی کی کتنی سکھی اور سوگ بھری یادیں بھری پڑی ہیں، وہ کہیں اور نہیں جا سکتیں۔

اس دن چھٹی تھی۔ میں باہر گھومنے نکلا تو نیمو بھی میرے ساتھ ہولیا۔

''گھومنے چلو گے؟''

کوئی جواب نہیں۔ میرے ساتھ چل رہا ہے، اس کا مطلب کیا صاف نہیں کہ وہ میرے ساتھ گھومنا چاہتا ہے، پھر منھ سے ہی کیوں کہا جائے! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس کا میرے ساتھ بہت لگاؤ ہے۔ ہم دونوں کے بیچ عمر کا کتنا بڑا فرق ہے، اس بات کو وہ بھول جاتا ہے۔ مجھے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دیکھ کر وہ بھی نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیتا ہے۔

گلی کے پار بازار، پھر ڈرگا کا مندر اور گھاٹ کی سیڑھیوں سے ٹی ناویں اور پار ریت کا میدان...

''پار چلو گے؟''

وہ جا کر ایک ناؤ میں بیٹھ جاتا ہے۔

ناؤ والا ہمارا جان پہچان کا ہے۔ برسوں سے ہم اسے جانتے ہیں۔ وہ مجھ سے شہر کی خبریں پوچھتا ہے۔ کیا شہر میں نوکری مل سکے گی؟ یہاں تو دو وقت کی روٹی جٹا پانا کٹھن ہوا جا رہا ہے۔ کتنے ہی ناؤ کھینے والوں نے پرکھوں کے اس دھندے کو چھوڑ کر نوکری کر لی ہے۔ میں چپ چاپ باتیں سنتا جا رہا ہوں۔ نیمو کے کانوں تک شاید اس کی کوئی بات نہیں جاتی، وہ پانی میں جھانک رہا ہے۔

انوپ ساتھ میں ہوتا تو ہماری باتوں کا کوئی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ پہلے اس کے خط آتے تھے، پھر دھیرے دھیرے کم ہو گئے اور اب پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ بڑے ہو کر ایک ہی دفتر میں نوکری کریں گے، کرائے کا ایک کمرہ لے کر اکٹھے رہیں گے۔ اب ہنسی آتی ہے، کچھ برس پہلے کیے ہوئے ان وعدوں پر نہیں، بلکہ ان سپنوں پر جو کبھی سچ نہیں ہو پاتے۔

''تم میرے ساتھ چلو گے نیمو؟''

اس کا دھیان اچانک ٹوٹ سا جاتا ہے، لیکن وہ میری طرف دیکھتا نہیں۔

Scanned with CamScanner

''وہاں اسکول میں پڑھنا۔ بہت بڑا شہر ہے۔ ایک بہت پرانا قلعہ ہے۔ وہاں، قلعے کے چاروں طرف بہت گہری کھائی ہے جس میں کوئی گر پڑے تو اس کی ہڈی پسلی کا پتا نہ چلے۔ اندر ہے محل، چور دروازے، توپیں اور توپوں سے نکلے ہوئے گولے...''

ناؤ والا بہت تجسس سے میری باتیں سن رہا ہے۔ میرے رکنے پر اس نے پھر اپنی بات شروع کر دی۔ ایک وقت تھا جب اس کے دادا کے پاس دس ناویں تھیں۔ بہت کام ملتا تھا تب۔ اب تو ریل گاڑی دور دور تک جاتی ہے، گاؤوں تک میں لاریاں دکھائی دینے لگی ہیں۔ تب لوگ ناووں میں ہی بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے۔ لگنوں کے وقت تو براتوں کی ایسی بھیڑ ہو جاتی تھی کہ ڈھونڈنے پر بھی کہیں کوئی ناؤ خالی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اب بھی یاد ہے، بچپن میں کئی بار کتنی ہی براتوں کے ساتھ وہ گیا تھا۔ رات رات بھر شہنائی بجتی رہتی، مجرے ہوتے اور اتنا انعام ملتا کہ ڈھونا مشکل...

وہ پرانی باتیں ہیں، جو میں کتنی ہی بار سن چکا ہوں۔ لیکن نیمو بہت شوق سے ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ آنکھیں کھلی ہیں، جیسے سب کچھ وہ ان میں بسا لے گا۔ بال ماتھے پر بکھرے ہوئے ہیں۔

اوپر پرندوں کا ایک جھنڈ چپ چاپ چلا جا رہا ہے۔ ان کے اڑنے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اوپر سڑکیں تو ہیں نہیں، کیا یہ کبھی اپنا راستہ بھول نہ جاتے ہوں گے؟ پہلے انھیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔ اب تک اس سوال کا حل نہیں ملا ہے۔ بس فرق اتنا ہوا کہ اب کبھی ایسا سوال میرے دماغ میں نہیں اٹھتا۔

نیمو کیا سوچتا ہے، اس کا علم کبھی نہیں ہو سکتا، نہ اس سے باتیں کر کے، نہ کبھی آنکھوں میں جھانک کر، نہ اس کا ہاتھ پکڑنے کے بعد۔ ہم گہرے دوست بن سکتے ہیں، انوپ سے بھی زیادہ اپنائیت نیمو میں پا سکتا ہوں۔ عمر کی کھائی ہم دونوں کے بیچ دیوار نہیں بنے گی۔ پہلے ہم دونوں ایک ہی چارپائی پر سوتے تھے، وہ میرے گلے میں اپنی بانہہ ڈال دیتا تھا۔ میرے چلے جانے کا اسے جو سب سے بڑا دکھ ہوا، وہ کہانی نہ سن پانے کا اور میرے ساتھ سو نہ سکنے کا۔

بہن کہتی تھیں کہ نیمو اسکول میں بہت شرارتیں کرتا ہے، دوسرے لڑکوں سے مار پیٹ بہت عام سی بات ہے۔ ماسٹروں نے کئی بار اس کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے۔ پتا نہیں گھر میں گھستے ہی ایسا سیدھا کیوں بن جاتا ہے! کوئی بات پوچھو تو اس کا جواب نہیں، غصہ کرو تو کھانا پینا چھوڑ دے۔ ایک بار بہن

Scanned with CamScanner

سے جھگڑا ہو جانے پر دو دن تک اناج کا دانہ اس نے منہ میں نہیں ڈالا۔ انھیں دل ہی دل میں نیمو سے ڈر سا لگتا ہے۔

جیجا کا چہرہ... کیا نیمو کو دیکھ کر بہن کو جیجا کی یاد آتی ہوگی؟ دونوں کے چہرے میں ایک عجیب سی مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ ناک، ہونٹ آنکھیں سب مختلف ہیں، لیکن ان سے بھی گہری ایک چھاؤں ہے، جو پہلے جیجا کے ساتھ تھی اور اب نیمو پر چھا گئی ہے۔ یا شاید میرا وہم ہی ہو۔

واپس لوٹنے کے دن قریب آتے جا رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ پھر پابندی سے اپنا معمول شروع کرنے سے اطمینان ہوگا۔ اکیلا میرا کمرہ اور پڑوس کے گھروں سے آتا شور و غل اور دفتر...

''اب دیوالی سے پہلے آ سکنا مشکل ہے۔''

ماں کی بوڑھی آنکھوں میں ایک نمی سی بجھ جاتی ہے۔ بہن کو میرا نہ ہونا اتنا نہیں اکھرتا، ان کے پاس نیمو جو ہے۔ ماں کے چہرے کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے ان کے ہاتھ خالی رہ گئے ہوں — خالی جھریوں بھرے ہاتھ، جن کو گھٹنوں پر رکھے وہ اپنی ٹھوڑی ٹکائے ہیں۔ آس پاس کہیں کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی، صرف کبھی کبھی دور کسی سیار کے رونے کی آواز گونج جاتی ہے۔ بنگالی خاندان کے افراد سو گئے ہوں گے، سوئے نہ بھی ہوں گے تو اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوں گے۔ نیمو سو رہا ہے، تکیے پر اس کا سر ایک کونے میں لڑھکا پڑا ہے۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ آج رات اس کے ساتھ سوؤں اور وہ اپنی بانہہ میرے گلے میں ڈالے رہے۔ اس کا لمس...

ریل گاڑی میں بیٹھا یہ سب سوچے جا رہا ہوں۔ بغیر کسی ربط کی یہ باتیں ہیں، جن کی نہ کوئی شروعات ہوتی ہے، نہ انجام۔ کل... کل سے وہی معمول روز دہرایا کروں گا۔ کبھی کبھی شام کو اکیلے اپنے کمرے میں بیٹھ کر مجھے چنڈی داس کا وہ گیت یاد آئے گا اور یہ بھی کہ اس شام کو جس عورت کا چہرہ دکھائی دیا تھا، اس کا شوہر زندہ ہے یا مر گیا...

❊❊

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

کہانی جو کبھی لکھی نہ گئی

اُن دنوں بھائی پھر بیکار ہو گئے تھے، جس سے گھر کے ماحول میں پھر ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ خالی رہنے پر بھی گھر پر نہ بیٹھنے کی ان کی پرانی عادت تھی۔ اکثر وہ دن دن بھر گھر سے غائب رہتے۔ کیا کرتے تھے، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے ان سے پوچھا تھا۔ جب وہ رات کو لوٹتے تو ہم سب کھانا کھا چکے ہوتے تھے اور ماں کافی دیر تک راہ دیکھنے کے بعد ان کا کھانا کٹوردان میں بند کر کے کمرے میں ایک کونے میں رکھ جاتی تھیں۔

بھائی کے سامنے کبھی ماں ان کی بابت اپنی ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی تھیں۔ میرے بینک سے لوٹتے ہی دری پر آ کر بیٹھ جاتیں اور زور زور سے لمبی سانسیں کھینچا کرتیں اور ان سانسوں کے ساتھ ''ہائے رام''، ''ہے پرماتما'' کے لفظ ان کے منھ سے نکلتے۔ بھائی کا ذکر شروع کرنے کی یہ ان کی تمہید ہوتی تھی۔ کبھی ان کی باتوں میں دلچسپی دکھانے کی تیاری کرتے ہوئے میں ان کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا اور کبھی اخبار کھول کر گھٹنوں کے اوپر رکھ لیتا۔

''تو نے شمبھو کی پتلون دیکھی، پائینچے کس قدر پھٹ گئے ہیں... جوتوں پر اتنی دھول جم گئی ہے کہ...''

بھائی کی پتلونوں کی حالت واقعی بہت خستہ ہو چکی تھی۔ قمیضوں کے کالر بھی پھٹ چکے تھے۔ ان کے کمرے میں گھستے ہی پسینے سے لت پت ان کے کپڑوں سے ایک تیز بدبو چاروں طرف پھیل جایا

Scanned with CamScanner

کرتی تھی۔

''نہ جانے بے چارا کہاں کہاں دھول پھانکتا پھرتا ہے۔ ایک آدھ مہینہ نہیں کمائے گا تو گھر میں کوئی اکال نہیں پڑ جائے گا۔'' پھر میری طرف بڑی سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتیں، ''تو ہی سمجھا رے، میری بات اسے بری لگتی ہے۔''

میں چپ چاپ سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر کے فوٹو کی طرف دیکھتا رہتا۔

''اسے ڈھارس دیتا رہا کر۔ تو برابر کا لڑکا ہے، تیری بات ضرور سنے گا۔''

میں ماں کے جھریوں بھرے چہرے کی طرف غصے سے دیکھتا۔ ان کے بالوں کی لٹیں بہت تیزی سے سفید ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کا پتلا دبلا گھلتا ہوا جسم ایسا جان پڑتا جیسے اپنے سفر کی آخری منزل تک آ پہنچا ہو۔ اوپر سے وہ جتنا ظاہر کرتی تھیں، اندر سے وہ دکھ کتنا بڑا ہوتا تھا، یہ اندازہ لگانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا اور تین چار مہینوں میں ایک آدھ کہانی لکھ دیتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کہانی کسی روزانہ اخبار کے ہفتہ وار میں چھپ جاتی تو میری خوشی کی حد نہیں رہتی تھی۔

کبھی مجھے کچھ لکھتے دیکھ کر ماں میز کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتیں اور بڑے سنجیدہ لہجے میں کہتیں، ''ارے، تو دوسروں کی کہانیاں لکھا کرتا ہے، کبھی میری بھی کہانی لکھ دے نا...''

میں ہنسنے لگتا۔ ان کے اس جملے کو جتنی بار میں سنتا تھا، مجھے ہنسی آ جاتی تھی۔

''ہاں ہاں، لکھ دے رے... جھوٹی کہانیاں گڑھتا ہے، سچی کیوں نہیں لکھتا۔''

ماں کے پاس رامائن کے سوا دیو داس کی کتاب اور تھی جسے وہ اکثر فرصت کے وقت روز ہی پڑھا کرتی تھیں۔ دیو داس کی کہانی انھیں بہت پسند تھی۔ پڑھتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ پاروتی نے بہت دکھ اٹھایا، اس جیسی زندگی بھگوان کسی کو نہ دے۔

میں ہنس کر کہتا، ''ماں، یہ سچی تھوڑے ہی ہے جو تم روتی ہو۔''

لیکن وہ مکمل یقین کے ساتھ زور دے کر کہتیں، ''سچی ہے، ضرور سچی ہے۔ انھیں جانے بغیر اس طرح کی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔''

ان کی بات کی تردید کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہوتا تھا۔

Scanned with CamScanner

وہ پھر آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہتیں، ''میری بھی کہانی لکھ دے۔ پھر جو اسے پڑھے گا، رویا کرے گا۔''

پتا کے ساتھ کبھی ماں کو گھل مل کر باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر چپ رہتے تھے اور جب بولتے تھے تب ہمیشہ اپنا غصہ ہی ظاہر کیا کرتے تھے۔ نہیں جانتا کہ انھیں ہم دونوں لڑکوں سے انس تھا یا نہیں۔ صبح اخبار پڑھتے تھے، دن میں سوتے تھے اور رات کو گیتا پڑھا کرتے تھے۔

میں بینک سے لوٹتا تو جھٹ ماں میرے کمرے میں آ جاتیں جیسے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھ سے لگ بھگ آدھا گھنٹہ روز باتیں کرنے کا ان کا معمول سا بندھ گیا تھا۔ اکثر وہ بھائی کے موضوع پر ہی باتیں کیا کرتی تھیں۔

''بڑھاپے میں ان کی بدھی سٹھیا گئی ہے۔ پہلے تو ایسے نہیں تھے...'' پتا کی برائیاں کرتے وقت انھیں بڑی تسلی سی ملتی تھی۔

''مجھے یاد ہے جب تم دونوں چھوٹے چھوٹے تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک کو وکالت پڑھا کر وکیل بناؤں گا اور دوسرے کو ڈاکٹر۔ شاید انھیں اسی بات کا صدمہ ہے کہ تم دونوں میں سے نہ کوئی وکیل بنا اور نہ ڈاکٹر...''

مجھے ہنسی سی آنے لگی۔ ''اب ایک بینک میں کلرک ہے اور دوسرا بے کار...''

''ارے، زمانہ بھی تو کتنا بدلا ہے! دو وقت کی روٹی جٹ جائے، وہی غنیمت ہے۔''

ایک بار پتا کی بھائی سے کسی بات پر جھڑپ سی ہو گئی۔ کچھ دیر تک تو ماں رسوئی میں سب کچھ سنتی رہیں، جب ان سے سہا نہیں گیا تو پتا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور ذرا تیز آواز میں کہنے لگیں، ''تم کیوں رات دن بچوں کے پیچھے پڑے رہتے ہو؟ لگ جائے گی نوکری، اس کے پیچھے اس بے چارے کی جان تھوڑا ہی لے لو گے۔''

پتا غصے میں آ کر بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ پھر بھائی نے ہلکی آواز میں ماں کے برتاؤ کے بارے میں اپنا غصہ جتلانے کے لیے انھیں ڈانٹا اور بغیر کھائے پیے ہی باہر چل دیے۔

شام کو جب بینک سے لوٹا تو آدھے گھنٹے تک ماں کو اپنے کمرے میں نہ آیا دیکھ کر میں اندر گیا۔ ماں اندھیرے میں ہاتھ کا تکیہ بنائے چارپائی پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ٹھیک ہے،'' انھوں نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''پھر لیٹی ہوئی کیوں ہو؟''

وہ چپ رہیں اور سامنے خالی دیوار کی طرف دیکھتی رہیں۔

اس دن بہت مدت بعد میں نے انھیں اتنے پاس سے اور اتنے دھیان سے دیکھا تھا۔ شاید دن میں انھوں نے اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی، جس کی وجہ سے ان کے بال روکھی لٹیں بن کر ان کے چہرے کے دونوں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں لال جان پڑیں۔ کبھی کبھی ان کے اکیلے پن کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ پڑوسیوں کے گھروں میں دو ایک گھنٹے گزار آتی تھیں، پھر تو سارا دن گھر میں اکیلے ہی کاٹنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور جاڑوں کی راتیں ماں کے لیے مسئلہ بن کر آ کھڑی ہوتی تھیں۔

''تم کیوں ہم لوگوں کو لے کر اپنا دل دکھاتی ہو؟ پتا جانیں، بھائی جانیں، تمھیں کیا لینا دینا ہے!''

میری بات انھوں نے سنی نہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چیز لگاتار ان کے دل کو کریدے جا رہی ہو۔

''اب اٹھو، ہاتھ منھ دھو لو...''

وہ چارپائی پر ہی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور رُندھی آواز میں بولیں، ''میں بھگوان سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ میرے مرنے پر تم دونوں سہارا لگا دو گے تو میں تر جاؤں گی۔ میری مکتی ہو جائے گی۔''

''چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنا دل نہ دکھایا کرو ماں...''

وہ یکا یک سبک سبک کر رو اٹھیں جس پر میں بے اختیار چونک گیا۔ اس گھبراہٹ میں تسلی کا ایک بھی لفظ میرے منھ سے نہیں نکلا۔ انھوں نے ساڑھی کے پلّو سے اپنی دونوں آنکھیں ڈھک لیں۔ میں ان کے ہاتھوں کی ابھری ہوئی نسوں کی طرف دیکھتا رہا جو کمرے کی دھیمی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

''ان کے اور میرے سنسکار کبھی نہیں ملے۔ جانتی ہوں، جب مر جاؤں گی تو بات بات پر مجھے یاد کیا کریں گے، لیکن تب میں دیکھنے تھوڑے ہی آؤں گی...''

اس رات کو ماں کتنی ہی دیر تک رامائن پڑھتی رہیں، لیکن وہ اپنا دکھ رامائن کی چوپائیوں میں بھول سکی ہیں، اس بات کا یقین کم تھا۔

Scanned with CamScanner

بھائی بھی اور دنوں کی نسبت دیر سے لوٹے۔ ان کا کھانا تپائی پر رکھا ہوا تھا۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لیکن انھوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ دھول سے بھرے اپنے جوتے اتارنے لگے۔ کپڑے بدل کر جب وہ چھت پر سونے کے لیے جانے لگے تو میں نے کہا، ''تمھارا کھانا تپائی پر رکھا ہے۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے،'' انھوں نے بغیر میری طرف دیکھے کہا۔

''ماں صبح دیکھیں گی تو انھیں دکھ ہوگا۔''

''تو میں کیا کروں؟ سب کے دکھ سکھ کا ٹھیکہ تو میں نے اپنے اوپر نہیں لے رکھا ہے۔'' اور وہ چھت پر چلے گئے۔

کچھ لمحوں تک میں کٹھ دان میں بھائی کے لیے رکھے ہوئے کھانے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے کھولا۔ پانچ پراٹھے تھے اور آلو کی سبزی، تھوڑا پیاز اور آم کا اچار تھا۔ میں نے پرانے اخبار کے کاغذ میں ان سب کو لپیٹا اور گیند سی بنا کر کمرے کی کھڑکی میں سے نالے میں اچھال دیا۔

گھر میں کسی بات پر جھگڑا ہو جانے کے بعد چار پانچ دن تک کسی سے بات چیت نہ کرنا ماں کی پرانی عادت تھی۔ وہ چپ چاپ رسوئی کا کام کرتیں، اپنے کمرے میں فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹی رہتیں یا رامائن پڑھا کرتیں۔ پڑوسیوں کے گھر تک وہ نہیں جاتی تھیں۔ جب کبھی میں بات چیت کرنے کی کوشش کرتا تو ہاں یا نہ میں ٹال دیا کرتی تھیں۔

ایک بار کسی رسالے میں میری کہانی چھپنے پر دس روپے کا منی آرڈر آیا تو ماں پھولی نہ سمائیں۔ سارے پڑوس میں گھوم گھوم کر انھوں نے سب کو یہ خبر سنائی۔ میری خوشی کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔

شام کو اسی خوشی میں میں نے ایک روپے کی برفی منگائی۔

ماں میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ''اب تو تو بہت بڑا لیکھک بن گیا ہے۔ کچھ دنوں میں تیری بھی دیوداس جیسی کتاب چھپ جائے گی۔''

روپے پا کر مجھے اپنی عظمت کا یقین ہو گیا تھا۔ میں نے اشتیاق کے ساتھ کہا، ''اب میں بھی ایک ناول لکھوں گا، ایک موٹی سی کتاب...''

Scanned with CamScanner

''اس کے کتنے روپے ملیں گے؟''

''اچھا ناول ہو تو ہزاروں مل سکتے ہیں۔'' میرے دماغ میں ایک ناول کا خیال بڑی تیزی سے چکر کاٹنے لگا۔

''کس کی کہانی لکھے گا؟''

''یہ تو اب سوچنا پڑے گا۔''

''میں کہتی ہوں کہ میری کہانی ہی لکھ دے۔ تب کتاب ضرور بکے گی۔''

''نہیں ماں، تم پر لکھا ناول نہیں بک سکتا۔ دیوداس جیسا ہونا چاہیے؛'' میں نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری کہانی لکھے گا تو دیوداس سے بھی اچھی کتاب ہوگی۔ مجھے آج بھی جب اپنا بچپن یاد آتا ہے تو من بھاری ہو جاتا ہے۔ جب میرا بیاہ ہوا تو تیرہ برس کی تھی۔ سسرال میں میری طبیعت نہیں لگتی تھی، چوبیس گھنٹے ماں کی یاد آیا کرتی تھی۔ اور تیرے دادا، کتنا تیز مزاج تھا ان کا، انھوں نے کبھی مجھے دروازے سے باہر قدم نہیں رکھنے دیا...''

''نہیں ماں، یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں، ان سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوگی؛'' میں نے ماں کو بیچ میں ہی روک دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ماں اپنی ساری تاریخ نہ دہرانے لگیں۔

لیکن انھوں نے شاید میری بات نہیں سنی۔ ''اگر مجھے لکھنا آتا تو اپنے من کی ساری کتھا لکھ دیتی۔ میری کوئی بھی سادھ پوری نہیں ہوئی۔ سوچتی تھی کہ بڑھاپے میں اس مایا جال سے چھٹکارا پا کر تیرتھ یاترا کروں گی، لیکن...''

''تمھیں تیرتھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تیرتھ تو ان لوگوں کے لیے ہیں ماں، جو زندگی بھر پاپ کرتے ہیں۔''

خوشی سے ماں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انھیں مجھ سے ایسا جملہ سننے کی امید نہیں تھی۔ ''میرے پچھلے جنم کے پاپ ابھی تک جمع ہیں، میں انھیں دھوڈالنا چاہتی ہوں۔''

میں اس بات کو جانتا تھا کہ ماں کو گھر اور گھر کے لوگوں سے کتنا لگاؤ ہے۔ کسی رشتے دار کی شادی برات میں جاتیں تو چار پانچ دنوں سے زیادہ باہر نہیں رہ پاتی تھیں۔ ان کا دل گھر کے لیے بے چین

Scanned with CamScanner

ہونے لگتا تھا۔

بھائی کے بارے میں ماں کو متواتر فکر لگی رہتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ بھائی کی وجہ سے ان کا جان سدا ایک پتلی سی ڈوری سے لٹکی رہتی ہے جو کب ٹوٹ جائے، اس کا بھروسا نہیں تھا۔ پتا کو جب کبھی موقع ملتا تھا تو وہ چوکتے نہیں تھے، نہ ماں کے سامنے اور نہ ہی میرے سامنے۔ کبھی دوستوں کے لڑکوں کا ذکر کرتے تھے، کبھی شمبھو کی جارحانہ طبیعت کو قصوروار ٹھہراتے اور میں دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے نہ کوئی وکیل بن سکا اور نہ ڈاکٹر۔

ایک دن ماں نے بڑی سہمی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، ''ارے کیا تیرے بینک میں کوئی جگہ خالی نہیں ہے؟''

میں ان کی بات کا مطلب سمجھ گیا، کیونکہ یہ سوال بھی کوئی نیا نہیں تھا۔ ''بینک میں کہاں جگہ ہے! وہاں تو الٹے لوگوں کو نکالا جا رہا ہے۔''

ماں چونک گئی جیسے بجلی چھو گئی ہو۔ ''کیا تجھے بھی...''

میں دل ہی دل میں مسکراتا ہوا ماں کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثر کو دیکھنے لگا۔ اگر اپنی نوکری چھوٹ جانے کی خبر انھیں سناؤں، تب تو شاید ان کا ہارٹ فیل ہی ہو جائے۔ میں دھیرے دھیرے کہنے لگا، 'میں تو پرمانٹ ہوں نا، میرا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

ان کی جان میں جان آئی۔ ''تو نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا'' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں، ''اپنے کسی دوست سے ہی پوچھ۔ ان کے دفتر وغیرہ میں کوئی جگہ خالی ہو تو شمبھو کو لگوا دے۔''

میں ماں کی باتوں سے اُوب رہا تھا۔ ''کہہ تو رکھا ہے،'' میں نے جذبے سے خالی آواز میں انھیں ٹالنے کی کوشش کی۔

''اس طرح بھلا وہ کے دن جیے گا۔ تو نے دیکھا نہیں، اس کی چھاتی کس طرح اندر کو دھنس گئی ہے۔''

مجھے ماں کی اس بات کو سن کر غصہ سا آ گیا۔ صبح سے لے کر اندھیرا ہو جانے تک میں جو لکڑی کی کرسی پر بیٹھا بیٹھا لیجروں پر جھکا رہتا ہوں، کیا اس سے میری چھاتی بہت پھول گئی ہے؟ ان کی نظر کبھی میری طرف کیوں نہیں جاتی؟

Scanned with CamScanner

اس دن اتوار تھا۔ بھائی کمرے کے ایک کونے میں پڑے ٹین کے بکس کے اوپر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا اپنی قمیض کا کالر سی رہا تھا۔ اس دن بینک نہیں جانا تھا، اس خیال سے میرا دل صبح سے ہی خوشی سے پھولا جا رہا تھا۔ سویرے سے ہی کوئی نئی کہانی لکھنے پر سوچ بچار کر رہا تھا، لیکن پلاٹ کا میرے دماغ میں آنا اتنا ہی ناممکن ثابت ہو رہا تھا جتنا کہ بھائی کو نوکری ملنا۔ مجھے یہ سوچ کر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ دوسرے لیکھک کس طرح اتنی ڈھیری کتابیں لکھ لیتے ہوں گے۔

کبھی کبھی بھائی پر سرسری نگاہ ڈال لیتا تھا۔ ان کے ساتھ کبھی آزادی سے بات چیت نہ کر سکا، جیسے ہم دونوں کے بیچ کوئی دیوار بنی ہوئی ہو! اگر ہم پڑوسی ہوتے یا بینک میں ایک ساتھ کام کرتے ہوتے تو شاید اچھے دوست بن سکتے تھے۔ تین دن سے شیو نہ کرنے کے سبب ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور کنپٹیوں کے پاس کی نیلی نسیں مجھے دور سے چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آنے لگا۔

تبھی دروازے پر کسی کی پرچھائیں دیکھ کر میں نے اپنی نظر اٹھائی تو پتا کو کمرے میں آتا دیکھ کر لمحے بھر کے لیے کانپ اٹھا۔ وہ ہمارے کمرے میں بہت کم آتے تھے اور جب آتے تھے تو کسی ٹھوس مقصد کو لے کر۔ اس مقصد کے تصور سے ہی میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اٹھا تھا۔

بھائی نے بھی اپنی جھکی نظر اوپر اٹھا کر پتا کو دیکھا۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ شاید اخبار مانگنے آئے ہوں۔ اخبار اٹھا کر انھوں نے پتا کی طرف بڑھا دیا۔

پتا نے اخبار نہیں لیا اور کھلی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔

کچھ لمحوں تک کمرے میں ایک پر ہیبت سناٹا چھایا رہا۔ میں کن انکھیوں سے کبھی پتا کی طرف اور کبھی بھائی کی طرف دیکھتا، لیکن وہ نہ میری طرف دیکھ رہے تھے اور نہ ایک دوسرے کی ہی طرف۔ میری قمیض کا کالر سل چکا تھا، لیکن میں پھر بھی اس کے آس پاس ٹانکے لگائے جا رہا تھا۔

''آخر تم نے سوچا کیا ہے؟ دن دن بھر آواروں کی طرح باہر گھومتے رہتے ہو۔ اس سے کیا بنے گا؟''

بھائی کے ہاتھوں میں اخبار کانپ رہا تھا۔ میں نے ان کی پتلی پتلی لمبی انگلیاں دیکھیں جن کے ناخنوں میں میل بھرا ہوا تھا۔ بھائی کو دیکھ کر مجھے اپنے بینک کے اکاؤنٹینٹ کی یاد آ جاتی تھی۔ اس کی شکل

Scanned with CamScanner

صورت بھائی سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ اگر بھائی اس کی طرح کوٹ پتلون اور ٹائی پہنیں تو اسی کی طرح خوبصورت اور چست لگیں۔

''میں زندگی بھر تمھیں کھلا نہیں سکتا۔ مجھے بھی آخر اپنے بڑھاپے کے لیے کچھ بچا کر رکھنا ہے،'' پتا سنجیدہ لہجے میں اپنی بات کہے جا رہے تھے جیسے رٹا رٹایا بھاشن دہرا رہے ہوں۔ ''تم اسی دم تک اس گھر میں ٹکے ہوئے ہو، جب تک تمھیں پکا پکایا کھانا مل رہا ہے۔ جس دن ہمیں روٹیاں کھلانے کا دن آئے گا تو بھاگ کھڑے ہوگے۔''

تبھی اخبار کے پھرر پھرر کرنے کی زور سے آواز آئی، جس سے میں نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔ اخبار تہہ کر کے انھوں نے فرش پر پھینک دیا تھا اور جھٹکے کے ساتھ بکسے پر سے کھڑے ہو گئے تھے۔ داڑھی بڑھ جانے کے سبب ان کا چہرہ مجھے کافی ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔

''تو آپ چاہتے کیا ہیں؟'' بھائی نے کڑک کر پوچھا۔

''کتنی بار کہوں گا کہ اب میں تمھیں کھلا نہیں سکتا۔ اپنا کماؤ اور کھاؤ۔''

''آپ ذرا دھیرے دھیرے بولیے، نیچے تک آپ کی آواز جا رہی ہے۔''

پتا کھڑکی سے ایک قدم آگے بڑھ آئے۔ مجھے ایسا جان پڑا جیسے اب وہ بھائی پر ہاتھ اٹھائیں گے جیسا کہ ہمارے بچپن کے وقت کیا کرتے تھے، لیکن دوسرا قدم انھوں نے نہیں بڑھایا۔

''تجھے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ آوارہ...''

تبھی دروازے کے پاس ماں کا سایہ دکھائی دیا، لیکن وہ کمرے کے اندر نہیں آئیں۔

''تو آپ صاف صاف کہیے کہ آپ مجھے گھر سے نکال دینا چاہتے ہیں۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''اچھی بات ہے...'' یہ کہہ کر بھائی نے دیوار میں لگی الماری کھولی اور اپنے کپڑوں کو تلاش کرنے لگے۔ دو پھٹی قمیضوں اور ایک خاکی پینٹ کے سوا اور کچھ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ ان کی ہی پوٹلی باندھنے لگے۔

تبھی ماں بجلی کی تیزی سے کمرے میں گھسیں اور اس دن زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں نے انھیں بغیر کسی ڈر یا ہچکچاہٹ کے پتا کے سامنے اس طرح کھڑے ہوئے دیکھا۔ ''تم میرے بچوں کو اس

Scanned with CamScanner

گھر سے نہیں نکال سکتے۔ اس گھر پر جتنا تمھارا حق ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔'' ماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تو چپ رہ، نکل جائے گا تو پتا چلے گا...''

''تو میں بھی اس گھر میں نہیں رہوں گی۔''

''تم چپ رہو ماں!'' بھائی نے پوٹلی کو بغل میں دباتے ہوئے کہا۔

میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ کھڑا ہو سکوں۔

پتا بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ماں بھائی کے پیروں سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگیں۔ ''میری لاش پر لکڑیاں لگا کر پھر جہاں تیرا جی کرے وہاں چلے جانا؛ پھر میں روکنے نہیں آؤں گی۔ اپنے جیتے جی میں تجھے اس گھر سے نہیں جانے دوں گی۔''

بھائی اس دن جا نہیں سکے۔ اس دن گھر میں ماتم سا چھایا رہا۔ مجھے اپنی چھٹی کے اس طرح تباہ ہو جانے پر دکھ ہو رہا تھا۔ کہانی لکھنا بھی ناممکن سا جان پڑ رہا تھا۔ جب میں اپنا دماغ کسی پلاٹ میں الجھانے کی کوشش کرتا تو سدا صبح کی گھنٹیاں میرے دماغ میں چکر لگانے لگتی تھیں۔

لیکن اگلے دن صبح جو بھائی گھر سے نکلے تو پھر لوٹ کر واپس نہیں آئے۔ ماں نے ہمیں کھانا کھلا کر بھائی کا کھانا کٹوردان میں بند کر کے میرے کمرے میں رکھ دیا۔ اس دن شام کو میرے بینک سے لوٹنے پر وہ مجھ سے کوئی بات چیت بھی نہیں کرنے آئی تھیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی ان کے کانپتے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھیں۔

انھوں نے دھیمی آواز میں مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر پوچھا، ''شمبھو ابھی تک نہیں آیا؟''

مجھے ایسا جان پڑا جیسے اپنے سوال کا جواب سننے میں انھیں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

''ابھی تو دس ہی بجے ہیں ماں، آتے ہی ہوں گے۔''

انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئیں۔ ماں کا سوال سن کر میں کسی ہونے والی بات کے اندیشے سے ایک بار کانپ اٹھا تھا۔ کہانی کی بات سوچنے پر میں نے ایسا محسوس کیا کہ اگر ماں پر کہانی لکھوں تو اسے چھپا ہوا دیکھ کر ماں کو بہت خوشی ہوگی۔ انھی خیالوں میں کھوئے ہوئے کب کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی، اس بات کا پتا مجھے نہیں لگا۔ اپنا سر کسی کو ہلاتے ہوئے دیکھ کر

Scanned with CamScanner

میں نے ہڑ بڑا کر اپنی آنکھیں کھولیں۔

''شمبھو ابھی تک نہیں آیا۔'' ماں میرے پاس ہی کھڑی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔

''کیا بجا ہے؟'' یہ کہہ کر بریکٹ پر رکھی گھڑی پر میں نے نظر ڈالی۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔

''وہ اب نہیں آئے گا۔ میں جانتی تھی کہ ایک دن وہ اسی طرح غائب ہو جائے گا...''

میں چپ چاپ ماں کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں جیسے ریتیلی پہاڑیاں ہوں، ان کی آنکھوں کے نیچے نصف دائرہ بناتے ہوئے گڈھے اور چہرے پر ان گنت سکڑنیں، جن کا آغاز اور انجام نظر نہیں آتا تھا۔ اتنی گہری پیڑا اور اداسی کبھی میں نے ان کے چہرے پر پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ماں سبک سبک کر روئیں گی، اپنے بھاگ کو کوسیں گی، لیکن وہ چپ چاپ کھڑی رہیں۔ کھوجنے پر بھی ان کی آنکھوں میں مجھے آنسو دکھائی نہیں دیے، جیسے آج وہ ریگستان کے دو وسیع میدان بن گئی ہوں۔ وہ چپ چاپ میری کرسی کے پاس کھڑی کھلی کھڑکی کے باہر تکتی رہیں۔

''آجائیں گے ماں، آج نہیں تو کل بھائی ضرور آجائیں گے...''

لیکن انھوں نے جیسے میری بات سنی نہ ہو۔ ''اب وہ نہیں آئے گا، کبھی نہیں آئے گا۔'' وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اگلے دن بھی میں جب بینک سے لوٹا تب بھی شمبھو کا کوئی پتا نہیں تھا۔ مجھے فکر ہوئی۔ اس اندیشے سے کانپ اٹھا کہ کہیں انھوں نے ریل کے نیچے آکر اپنی جان تو نہیں گنوا دی۔ میں پتا کے کمرے میں گیا۔ وہ دیوار کا سہارا لگائے دری پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکے نہیں، جیسے وہ میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ مجھے ان پر غصہ آرہا تھا۔

''بھائی ابھی تک نہیں آئے...''

وہ کچھ نہیں بولے، ٹکٹکی لگائے میری طرف دیکھتے رہے۔ میں ان کے چہرے کے احساسات کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن ناکام رہا۔

لمحہ بھر کے بعد وہ، بہت دھیمی آواز میں بولے، ''ہاں، شمبھو ابھی تک نہیں آیا۔''

مجھے ان کا گلا رُندھا ہوا سا جان پڑا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا جیسے شمبھو کے چلے جانے پر ان کو ایک

Scanned with CamScanner

بڑا ذہنی صدمہ پہنچا ہو۔

اس رات کو کتنی ہی دیر تک میں اسٹیشن پر پلیٹ فارموں کے چکر کاٹتا رہا۔ گاڑیاں آتی رہیں اور جاتی رہیں، انجنوں کی سیٹیوں سے سارا اسٹیشن کانپ اٹھتا تھا۔ بھائی کو یہاں پانے کی امید بہت کم تھی، لیکن کہیں نہ کہیں ان کو تلاش کرنے تو جانا ہی تھا، سڑکوں پر گھومنے کے بدلے اسٹیشن پر آنا مناسب سمجھا۔

اس دن کے بعد ماں نے جو چپ سادھی وہ کبھی نہ ٹوٹی۔ میں انھیں بہلانے کی اپنے بس بھر کوشش کیا کرتا تھا۔ بینک سے لوٹ کر روز ان کے کمرے میں چلا جاتا، اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ان کا جی بہلانے کی کوشش کرتا، کبھی اپنی کہانیوں کا ذکر کرتا، لیکن انھیں جیسے اب کسی بھی بات سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ چپ چاپ میری باتیں سنتی رہتیں، کبھی مسکرانے کی کوشش کرتیں، لیکن ان کی بے پروائی مجھ سے چھپی نہ رہتی۔ کتنا وقت گزر چکا سو نہیں جانتا۔ میری کتنی ہی کہانیاں چھپی ہیں؛ تین مجموعے بھی چھپ چکے ہیں اور جان پہچان کے لوگوں کے کہنے کے مطابق ادب میں میرا ایک 'مقام' بن گیا ہے۔ لیکن جب کبھی نئی کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں تو ماں کا یہ جملہ "میری بھی کہانی لکھ دے رے... جھوٹی لکھتا ہے، سچی کیوں نہیں لکھ دیتا..." بار بار میرے دماغ میں گونجتا ہے، میرا قلم رک جاتا ہے۔ لیکن جانتا ہوں کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ماں کی کہانی نہیں لکھ سکوں گا۔

❊❊

Scanned with CamScanner

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

ریلوے پھاٹک

اسٹیشن جانے سے پہلے اماں کے پاس رخصت لینے کی بات سوچ سوچ کر صبح سے ہی اس کا دل ڈوبتا رہا تھا۔ گاڑی جانے کا وقت اس کے پاس کھسکتا آ رہا تھا۔ آخر میں بہت حوصلہ کر کے وہ ان کے کمرے میں گیا۔ شانتی کی ماں ان کے سرہانے بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ ''میں جا رہا ہوں اماں...'' دروازے میں اندر گھستے ہی اس نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ چارپائی پر چپ چاپ سیدھی لیٹی تھیں۔ کم پاور کے بلب کی روشنی میں ان کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن ان کی کھلی ہوئی آنکھوں کی روشنی میں کچھ بھی چھپا نہیں تھا۔ وہ ان کے سرہانے جا کر بیٹھ گیا اور ان کے ماتھے پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ اس نے اچانک محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ پسینے سے تر تھا جس سے اماں کا ماتھا بھیگ گیا۔

''اپنا دھیان رکھنا اماں! چٹھی بھیجتا رہوں گا۔ دسہرے کی چھٹی میں آؤں گا...''

اسے شک ہوا کہ اماں نے اس کی بات سنی یا نہیں۔ وہ سامنے دیوار کی طرف سونی نظر سے تکتی رہیں۔

''شانتی کی ماں تمھارے پاس رہیں گی اماں! تمھاری خبر بھیجتی رہیں گی۔''

اماں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ان کی آنکھیں جیسے کچھ کھوج رہی تھیں۔ لمحے بھر بعد انھوں نے اپنی نظر ہٹا لی۔

اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اماں کے پاس اور بیٹھنا اسے ناممکن جان پڑ رہا تھا۔ ''اچھا اماں، دیر

ہو رہی ہے، ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔ تم وید جی کی دوا کھاتی رہنا۔ اس سے تمھیں فائدہ ہوا ہے۔''

وہ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اماں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ چونک گیا، جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ کر تو کیسے جا رہا ہے؟...'' ان کی آواز رک گئی۔

''لیکن اماں، تم جو راضی ہو گئی تھیں، نہیں تو میں کبھی ہاں نہیں کرتا...''

انھوں نے کچھ سنا نہیں۔ ''میرا اس دنیا میں اب کون ہے! میں زیادہ نہیں جیوں گی بیٹا، میری چِتا میں آگ لگا کر جہاں چاہے چلے جانا...''

اس طرح کی صورت حال کا اسے اس آخری وقت سامنا کرنا پڑے گا، اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ کھوئی ہوئی نظر سے ماں کی طرف تکتا رہا۔ بغیر دانتوں کا ان کا سکڑا ہوا چہرہ، ابھرتی ہڈیوں کے بیچ جھریوں کی بھول بھلیاں، جیسے کسی ریگستان کا ایک ٹکڑا ہو، گلے کی اوپر اٹھتی ہوئی نسیں — جیسے کھنڈروں کے بیچ وہ کھڑا ہو۔

اس نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''کیا کہہ رہی ہو اماں! کتنی مشکل سے تو یہ نوکری ملی ہے...'' وہ اونچی آواز میں بولا، ''پنڈت جی کے لڑکے سے میں نے بات کر لی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ مجھے تار بھیج دے گا۔''

انھوں نے یہ سنا نہیں۔ ان کے چہرے پر چھائے خالی پن کے اندر پرتوں میں لپٹی ان کی پیڑا، دہشت، اس کے جانے کے بے معنی پن کا احساس اسے تھا، لیکن گھر کی ڈھلتی ہوئی معاشی حالت، اماں کے علاج کے لیے پیسے جٹا نہ پانے کی بے بسی... ان سب کو دیکھتے ہوئے اسے یہ راستہ چننا پڑا۔

باہر رکشے والا دیر ہوتے دیکھ کر گھنٹی بجا رہا تھا۔

''اچھا اماں، اگر تمھیں بہت اکیلا لگا تو میں نوکری چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔'' پچھلے پینتیس برسوں سے وہ اور اماں اس گھر میں اکیلے رہتے آئے ہیں اور اس سلسلے کو اس وقت توڑنا مناسب نہیں تھا۔

اماں نے پھر اس کے چہرے پر کچھ تلاش کیا۔ ''نہیں، تو جا بیٹا! اتنی مشکل سے یہ نوکری ملی ہے۔ میرا کیا ہے...''

وہ بھی ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کا کیا ہے... جہاں زندگی کے پینتیس سال یہیں گزر گئے،

وہاں باقی بھی گزر ہی جاتے۔

وہ تیز قدموں سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر رکا تو وہ کبھی نہیں جائے گا۔ رکشے میں بیٹھتے ہی اندر پھیلا ہوا خالی پن شمشان گھاٹ میں جلتی ایک لاش کی طرح چیخ اٹھا۔

ہمیشہ کی جانی پہچانی سڑکیں، بازار، لوگوں کی بھیڑ — ایک بہاؤ جس سے وہ باہر نکل آیا ہے، یا باہر نکل آنے کا محض وہم ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے، اسی بہاؤ کا ایک حصہ رہے گا۔ شاید اب وہ یہاں کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ پچھلے پینتیس برسوں کا اس کا ماضی انھی سڑکوں اور گلیوں کے اَن گنت چکروں کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا تھا، جس سے آزادی پانے کی کوشش وہ ایک لمبے عرصے سے کر رہا تھا۔ رکشے میں بیٹھے ہوئے کچھ آگے جانے پر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا بوجھ اچانک ہی ہلکا ہو گیا ہو۔

اماں کا چہرہ سڑک کی بتیوں کی دھندلی روشنی میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی دور نکل جاتا، کبھی بالکل اس کے پاس کھسک آتا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی، چپ چاپ اپنی پیڑا کو اپنے تک ہی محدود رکھنے کی کوشش کرتی رہیں گی۔ لیکن وہ تو خود اس پیڑا کا گواہ ہے جو جانتے ہوئے بھی چپ رہے گا۔

اپنی بات اس نے کبھی نہیں سوچی۔ اپنی پڑھائی لکھائی، اپنے لیے کوئی مناسب نوکری، اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کا کوئی راستہ، کسی کے ساتھ لگاؤ، شادی — سب کے لیے ایک بے پروائی شروع سے ہی اس کے ساتھ چپک گئی تھی۔ پتا تھے نہیں جو اس پر کوئی کنٹرول رکھتے اور اسے رائے دیتے۔ بڑے بھائی باہر رہتے تھے اور اماں اسے سدا بچہ ہی سمجھا کرتی تھیں۔ فیل ہو کر اسکول چھوڑ دینے پر کسی کے سامنے اس کی وضاحت کرنا ضروری نہیں تھا۔ اس گھر میں، شہر میں اس کی مستقل موجودگی کے سب عادی ہو گئے تھے — خاص کر ماں۔ جیسے برسوں پرانے گھر کے کمرے، آنگن میں پیپل کا پیڑ اور کنواں اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے، اسی طرح اس کا چلنا پھرنا، باتیں کرنا، سونا اور اس کی مہک بھی گھر کے وجود سے جڑی ہوئی تھی۔

کتنی ہی شامیں اپنی بے چینی، گھٹن اور ادھیڑ بن میں ڈوبے ہوئے اس نے گھاٹوں کے کنارے گھومتے ہوئے، یا کسی گھاٹ کی سیڑھی پر پیڑ کی چھاؤں کی تنہائی میں کاٹی تھیں، جن کا حساب کتاب رکھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ گرمیوں کی ٹھٹھری دھوپ اور شام کے دھندلکے میں سردی کی کپکپا دینے والی

Scanned with CamScanner

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے بیچ اپنے لیے کسی اجاڑ، اکیلی اور گمنام پگڈنڈی کی تلاش کی تھی، جس پر شاید کوئی بھی چلنے کو تیار نہ ہوتا، لیکن وہ اس عام سی چیز کو حاصل کرنے سے بھی محروم رہا۔ اسے لگتا تھا جیسے اس کے نہ رہنے پر اس کے ہونے کا ایک دھندلا سا نشان بھی باقی نہیں رہ جائے گا، ایک بھی گواہ لاکھ ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل سکے گا۔ لمحے بھر میں جادو کی طرح اس کے سارے نشان مٹ جائیں گے۔ اسے ہنسی آتی تھی اپنی ان بے تکی باتوں پر۔

بڑے بھیا کے اچانک لاپتا ہو جانے پر اماں کی ساری ذمے داری اس کے سر پر آ[illegible] انچی میں انجینئر تھے، ہر مہینے اماں کے خرچ کے لیے روپے بھیجتے تھے، سال میں ایک بار ان سے ملنے آتے تھے۔ اس سے بھی ان کو بہت پیار تھا۔ اس بات کے لیے بھی وہ اس کے احسان مند تھے کہ اماں کی دیکھ بھال وہ اچھی طرح سے کر رہا تھا جبکہ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے یہ ذمے داری انھیں اٹھانی چاہیے تھی۔ وہ بھی ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کی بیوی بیاہ کے چار برس بعد بچے کو جنم دینے کے موقعے پر چل بسیں اور بچہ تو جنم سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ اس حادثے کا بڑے بھیا کو اتنا گہرا صدمہ پہنچا جس سے ان میں ایک گہری تبدیلی آ گئی۔ اس کے بعد جب وہ چھٹیوں میں گھر آئے تھے تو پہچانے تک نہ جاتے تھے۔ اپنے آپ میں ہی سارا دن کھوئے رہتے تھے۔ انھیں کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ جب اماں کے پاس بیٹھتے تو بے پلک نظر سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہتے، لیکن اس کو یقین تھا کہ ان کی آنکھیں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہوتی تھیں، اور پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر وہاں سے اٹھ جاتے تھے۔ تب وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ وہ شاید جانتے تھے۔ چھ مہینے بعد وہ اچانک رانچی کا گھر، نوکری، سامان، سب چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے۔ ایک لائن کی اطلاع بھی انھوں نے کسی کو نہیں دی۔ ایک دن ان کے دفتر سے ان کے حساب کے روپے، ان کا سامان گھر پہنچ گیا۔ وہ سادھو سنیاسی ہو گئے یا انھوں نے خودکشی کر لی، اس کا کچھ بھی پتا نہیں چل سکا۔

یہ خبر سن کر اماں کی بچی کھچی ڈگمگاتی صحت کچھ ہی وقت میں ڈولنے لگی، جس پر انھیں چارپائی کی پناہ لینی پڑی۔ اسے لگا جیسے انھیں باندھنے والے تار ان کی ابھرتی نسوں کی طرح اور بھی کمزور پڑ گئے ہوں۔ بڑے بھیا کا ذکر کرنا انھوں نے بالکل بند کر دیا۔ جب کبھی انھیں اپنے گھیرے سے باہر لانے کے مقصد سے وہ ان کا ذکر کرتا تو ہاتھ کے اشاروں سے وہ اسے چپ کرا دیتیں۔

Scanned with CamScanner

اسے پہلی بار اپنی ذمے داری کا احساس اتنی شدت سے ہوا۔ گھر کا خرچ، اماں کی دوا دارو کا بندوبست، شانتی کی ماں کو کھانے کپڑے کے سوا کچھ جیب خرچ۔ اس کی لگی بندھی کوئی آمدنی نہیں۔ بڑے بھیا کی جو تھوڑی بہت جمع پونجی انھیں ملی تھی، وہ بہت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اماں سے یہ سب نہیں کہا۔ اسی دوران ان کے ایک قریب کے رشتے دار اور عزیز جو گورکھپور میں کسی دفتر میں ایک اونچے عہدے پر نوکری کرتے تھے، ان کا خط آیا جس میں اس کے لیے ایک نوکری کی پیشکش تھی، جس کا بندوبست انھوں نے کیا تھا۔ اس نے پیشکش فوراً قبول کر لی، لیکن اماں کسی بھی طرح گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ ''تو جا بیٹا! گورکھپور تو دور نہیں ہے۔ آتے رہنا۔ یہاں شانتی کی ماں میرے پاس ہے، پڑوس میں سب جانتے ہیں۔ بڑی مشکل سے تو یہ نوکری ملی ہے۔ تجھے تو ابھی ساری زندگی کاٹنی ہے۔ میری فکر مت کر۔'' ساری عمر اس گھر میں کاٹنے کے بعد زندگی کے بچے ہوئے چند سال یا مہینے ایک دوسرے شہر اور گھر میں بسر کرنے کے لیے اصرار کرنا اسے انصاف کے خلاف جان پڑا۔

اس کے ساتھ بھی تو کم ناانصافی نہیں ہوئی۔ آج شام کے وقت رکشہ میں بیٹھے ہوئے اسٹیشن تک جانے کا راستہ اسے بے حد لمبا جان پڑا۔ شاید کبھی ختم نہیں ہوگا اور اس کی گاڑی اس کا انتظار کیے بغیر آگے نکل جائے گی۔ پھر اسے واپس اسی گھر میں لوٹ آنا پڑے گا، جس کی سونی دیواروں، کھڑکیوں، آنگن میں لگے پیپل کے پیڑ اور کنویں کو گھنٹوں دیکھتے ہوئے کتنا وقت گزارا ہوگا۔ ان سب کے ساتھ اس کے سمبندھ اتنی اپنائیت کے تھے کہ وہ اپنے مسئلوں، اپنے دکھ سکھ، اپنے دل میں اٹھتے طوفان کے بارے میں سب کچھ بتا کر بہت ہلکا سا محسوس کرتا تھا۔ اور اب وہ اکیلا اور بے سہارا پڑ گیا تھا۔

رکشہ پر بیٹھے ہوئے گھر سے اسٹیشن تک کے سفر کی گہرائی کو وہ سمجھنا چاہتا تھا، لیکن وہ قوت اس وقت اس کے پاس نہیں تھی۔ مندروں میں بجتے آرتیوں کے گھنٹے، شنکھ کی آواز، آسمان میں ٹمٹماتے دو تین تارے، سانجھ کے دھندلکے میں ڈوبے گھنے پیڑوں کی شاخوں میں بسیرا لیتے ہوئے پنچھیوں کا شور... ان سب کے ساتھ اس کا ماضی جڑا ہوا تھا، جن سے اپنے آپ کو ایک ہی ہلے میں اس نے کاٹ لیا تھا۔ اماں کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گھوم گیا۔ آخری بار جس طرح انھوں نے دیکھا اس میں ان کے اندر کا سب کچھ واضح طور پر درج تھا۔ ایک بار چپکے سے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ دیکھنے کی خواہش بہت طاقتور ہو اٹھی کہ اس وقت وہ کیا کر رہی ہیں؛ اس کے چلے جانے کا صدمہ کتنا گہرا ہے؟

Scanned with CamScanner

بڑے بھیا ہوتے تو اسے کبھی نہ جانے دیتے۔

جس مکڑی کے جالے میں وہ پیدا ہوا، بڑا ہوا، اس سے باہر نکلنے کی بات اس کے دل میں کبھی اٹھی ہی نہیں۔ اس کا سبب تک جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اسٹیشن سے کچھ دور پہلے ریلوے لائن پر ایک پھاٹک تھا جسے پار کرنے کے بعد ہی اسٹیشن تک پہنچا جا سکتا تھا۔ بدقسمتی سے اس وقت وہ بند تھا، لیکن اس وقت کوئی گاڑی وہاں سے نہیں گزرتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ رکشے والے نے بھی تعجب سے کہا، ''آج پھاٹک کیسے بند ہوا؟ اس وقت تو کبھی بند ہوتا نہیں۔ شاید کوئی گاڑی لیٹ ہو گئی ہے۔''

اسے وہ کوئی بدشگونی سا جان پڑا۔ پہلے ہی اماں سے رخصت لیتے ہوئے دیر ہو گئی تھی اور اب بند پھاٹک سامنے تھا۔ اس کی گاڑی شاید چھوٹ جائے گی، اسے پکا یقین ہو گیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ رکشہ سے اتر گیا اور پاس ہی جمع ہوئی کچھ لوگوں کی بھیڑ میں ایک شخص سے پتا چلا کہ کوئی بڑھیا گاڑی کے نیچے دب کر مر گئی ہے، جس سے پھاٹک بند ہے، اور وہ کب کھلے گا، کوئی نہیں جانتا۔ اس کی لاش کو لائن سے ہٹانے کا کوئی جھنجھٹ ہے، پولیس جانچ پڑتال کر رہی ہے۔

لمحہ بھر کے تذبذب کے بعد وہ تیز قدموں سے پھاٹک کے پاس پیدل لوگوں کے پار کرنے کی کھلی جگہ سے اندر چلا گیا اور کچھ فاصلے پر لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر اسی طرف بڑھ گیا۔ ایک لیمپ پوسٹ کی روشنی میں کچھ چہرے واضح سے دکھائی دیے جو جھکے ہوئے ریلوے لائن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے، بغیر کسی تجسس کے، وہ بھیڑ کے اندر گھس گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ خون سے لت پت لاش اسے دکھائی نہیں دی۔ لمحہ بھر تک کھڑے رہ کر اندھیرے کے اس چھوٹے سے دائرے کے اندر جا کر وہ فوراً لوٹ آیا۔ اس کی چال بہت دھیمی ہو گئی اور نظر ریل کی پٹریوں پر پھسلتی ہوئی ریل کی لائنوں کے بچھے جال میں کھو گئی تھی۔ دور اسٹیشن کی چمکتی روشنیاں ایک پڑاؤ کا اشارہ دے رہی تھیں، جہاں لوگوں کے آنے کا سلسلہ متواتر بنا رہتا تھا۔

اسے دیکھ کر رکشے والا چلایا، ''بابو جی، کہاں چلے گئے تھے؟ پھاٹک کھل گیا ہے۔''

اس کے کانوں تک رکشے والے کی آواز نہیں پہنچی۔ وہ بھیڑ کے شور و غل کو بہت دور چھوڑ آیا تھا

Scanned with CamScanner

اور اندھیرے کے چھوٹے سے دائرے میں بندھ گیا تھا۔ اس دائرے کے ساتھ اس کا بہت پرانا تعارف تھا اور کئی بار وہ اپنے آپ کو اس کے اندر جکڑا ہوا پاتا تھا، جس کا احساس ہونے پر وہ فوراً اس سے باہر آ جاتا تھا۔ اس وقت اس کو احساس تک نہیں ہوا۔ وہ رکشے والے کی موجودگی کو بھول گیا، اپنی گاڑی پکڑنے کی بات بھی اس کے دماغ سے نکل گئی۔ اسے پیچھے کی طرف جاتا دیکھ کر رکشے والا زور سے چلایا۔ اسے چونک کر دیکھا۔ پھر اچانک اپنا سفر، نوکری، گورکھپور کی گاڑی پکڑنے کی جلدی، اپنا گھر اور اماں کا چہرہ، لمحہ بھر میں ساری صورت حال صاف ہو کر اس کے سامنے ابھر آئی۔ وہ دھیمی چال سے رکشے میں آ کر بیٹھ گیا اور بولا، ''واپس چلو۔ گاڑی نکل چکی ہے۔''

''نہیں بابو جی، ابھی گاڑی نہیں نکلی ہے۔ میں تیز رکشہ چلا کر ابھی آپ کو اسٹیشن پہنچا دیتا ہوں۔''

''نہیں، واپس چلو! میں جانتا ہوں، گاڑی اب نہیں ملے گی۔''

رکشے والے نے آخری بار کوشش کی، لیکن اس نے بہت دھیمی آواز میں اسے واپس چلنے کو کہا۔

❋❋

Scanned with CamScanner

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

جاڑوں کی پہلی برف

ننھا کرسی پر بیٹھا جغرافیہ کی کتاب ہاتھ میں لیے افریقہ کے دریاؤں کے نام دل ہی دل میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دیکھو، بھیا پڑھتے پڑھتے سو گئے...'' چھوٹے نے مسکراتے ہوئے بہن کی طرف دیکھا۔ ننھا آنکھیں کھول کر ہنسنے لگا اور کرسی کو پیچھے کھسکا کر اس کا رخ بہن اور چھوٹے کی طرف کر لیا۔ ''تو اتنی زور سے بولتا ہے کہ کوئی کیسے پڑھائی کر سکتا ہے!''

بہن سویٹر پر آنکھیں گڑائے مسکراتی رہی۔

''افریقہ کتنا بڑا ہے دیدی... کتنی طرح کے جانور ہیں جو اور کسی دیس میں نہیں پائے جاتے!''

جانوروں کی بات سن کر چھوٹے کی آنکھوں میں بے چینی سمٹ آئی۔ ''کیا افریقہ میں سفید شیر ہوتے ہیں جیسے ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں؟''

ننھا پھر ہنسنے لگا۔ ''شیروں کے علاوہ وہاں زیبرا، ہپو، جنگلی بھینسیں ...اور اتنے بڑے بڑے چیونٹے جو آدمی کو آدھے منٹ میں کھا جاتے ہیں...''

بہن بولی، ''پہلے تو امتحان کی تیاری کر، جانوروں کے بارے میں بعد میں پتا لگا لینا۔''

''یہ تو میں چھوٹے کو بتا رہا ہوں۔ امتحان میں تو ابھی چھ مہینے پڑے ہیں...'' اور اس نے زور سے جغرافیہ کی کتاب بند کر کے میز کے ایک کونے میں رکھ دی۔ ''اگلے سال دسویں کے بعد یہ سب ختم ہو

جائے گا۔ پھر کالج..." وہ بہت بے چینی سے بولا۔

"یہاں تو کالج ہے نہیں..." چھوٹے نے کہا۔

"دلّی یا لاہور...دونوں میں سے ایک جگہ جانا پڑے گا،" ننھے نے کہا۔ "پھر سردیوں میں شملہ کی اُوب نہیں سہنی پڑے گی۔"

چھوٹے نے بہن کا ہاتھ پکڑ کر روہانسی آواز میں کہا، "اس سال بھی کیا ہم دلّی نہیں جائیں گے دیدی؟"

بہن نے سویٹر ایک کونے میں رکھ دیا۔ "لڑائی چل رہی ہے نا چھوٹے! بابو جی کا دفتر کیسے جا سکتا ہے؟ پورا آرمی ہیڈکوارٹر یہیں تو ہے..."

"سب کے دفتر دلّی چلے جاتے ہیں، ایک بابو جی کا ہی نہیں جاتا۔ وہ اپنا دفتر بدل کیوں نہیں لیتے؟" چھوٹے نے سوال کیا۔

"کیسے بدل سکتے ہیں؟" ننھے نے کہا۔ "کتنے سال ہو گئے انھیں یہیں کام کرتے ہوئے۔ سلور جوبلی میں انھیں تمغہ بھی ملا تھا۔"

چھوٹے اور ننھے کے بیچ پانچ سال کا فرق تھا، جس کا پورا فائدہ ننھا اٹھایا کرتا تھا۔ لیکن چھوٹے نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ چھوٹا بولا، "اس بار تم یہیں رہ جاؤ دیدی! تمھیں برف دیکھے کتنے سال گزر گئے!"

بہن نے چھوٹے کے چہرے کی طرف بہت بے تاثر نظر سے دیکھا اور پیار سے اس کا سر تھپتھپا دیا۔ "یہاں کیسے رہ سکتی ہوں چھوٹے؟ اتنا رہ لی، یہی بہت ہے۔"

ننھے نے بہن کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک خالی پن سا گھِر آیا تھا، جس کے پار دیکھنا کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ "دیدی کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ یہاں کیسے رہ سکتی ہیں!"

چھوٹے نے اپنے دل کی بات کہہ دینے کا یہ مناسب موقع سمجھا۔ "اس بار سردیوں میں میں تمھارے گھر کیوں نہ آ جاؤں دیدی؟ بٹو بھی اپنی بہن کے گھر پچھلے سال گیا تھا، اس نے وہاں بہت مزے کیے..."

Scanned with CamScanner

بہن کا چہرہ اچانک بہت سنجیدہ ہو گیا۔ ’’ہمارے گھر میں بہت سے لوگ ہیں، تجھے اچھا نہیں لگے گا۔ اور کانپور شہر میں کچھ بھی دیکھنے لائق نہیں۔ ملوں کی چمنیوں میں سے دھواں نکلتا رہتا ہے۔‘‘

ننھا حقیقت کو چھوٹے کی نسبت زیادہ جانتا تھا۔ وہ بولا، ’’کیا بیکار کی باتیں کر رہا ہے چھوٹے! تجھ سے پہلے بھی کہا ہے کہ دیدی کے سسرال جانے کی بات مت کیا کر، لیکن تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔‘‘

چھوٹے نے دیکھا کہ بہن کی آنکھوں میں جیسے دھواں سا بھر گیا ہو، ویسا ہی جیسا کانپور میں چمنیوں میں سے نکلتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ پہلے بھی اس طرح کے موقعوں پر ماحول تناؤ سے بھر جاتا تھا اور سب چپ ہو جاتے تھے۔ جب بہن سسرال میں ہوتی تھیں تب ان کا ذکر آتے ہی اماں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ ان کا خط آتا تو اماں کئی بار ان دونوں سے پڑھوا کر سنتی تھیں، جس پر ننھا کبھی کبھی چڑ بھی جاتا تھا اور اماں کا غصہ بڑھ جاتا تھا۔

’’جاڑوں میں بہت کم لوگ رہ جاتے ہیں دیدی! کیتھو بہت خالی ہو جاتا ہے اور تب دتی کی بہت یاد آتی ہے،‘‘ چھوٹا بولا۔

’’تو جم کر پڑھنا چھوٹے! اس بار فرسٹ آ کر دکھانا،‘‘ بہن نے پیار بھری آواز میں کہا۔ لیکن چھوٹے کی اس سے کوئی خاص تسلی نہیں ہوئی۔ ’’تمھیں یاد ہے نا دیدی! جب تمھاری شادی نہیں ہوئی تھی، اس سال جاڑوں میں ہم روز شام کو کالی باڑی جایا کرتے تھے۔ وہاں بیچ میں اسٹوو رکھا رہتا تھا، جس کے اندر لکڑیاں جلتی رہتی تھیں۔‘‘

ننھے نے ہنس کر بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ ’’وہی پرانی باتیں پھر شروع ہو گئیں۔‘‘

چھوٹے نے اس کی بات نہیں سنی۔ ’’آرتی کے بعد لوٹتے ہوئے کتنا ڈر لگتا تھا دیدی! اور تارا ہال کے باغ میں ورجن میری کی سفید مورتی دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ کوئی سفید بھوت کھڑا ہے اور اس اترائی میں بھاگنا شروع کر دیتے تھے... مورتی اب بھی وہیں ہے، لیکن اب ڈر نہیں لگتا۔‘‘

بہن نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ’’وہ دن تو جیسے ایک سپنا تھے۔‘‘ پھر دونوں بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ’’تم لوگوں کو تو آگے دیکھنا چاہیے۔ جو گزر گیا اس کے ذکر سے بھی کیا فائدہ؟‘‘ بچپن کی یادوں کو بہن دیر تک ان دونوں کے سامنے گھسنے نہیں دیتی تھیں۔ چھوٹے کے لیے یہ موضوع بہت پیارا اور اپنائیت سے بھرا تھا اور یہ سوچ کر اسے بہت دکھ ہوتا تھا جب بہن جان بوجھ کر اچانک ہی اسے ختم کر

Scanned with CamScanner

دیتی تھیں۔ چھوٹے کو لگتا جیسے ڈھیر ساری دھندلی تصویریں کہرے میں پہاڑوں کے پیچھے گھومتی رہتی ہیں جنھیں صاف طور سے دیکھنے اور سمجھنے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو پاتی۔ وہ کسی سے بھی کچھ پوچھ نہیں سکتا اور پوچھنے پر کوئی اطمینان بخش جواب بھی اسے کبھی نہیں مل پاتا۔

ماں رسوئی میں کھانے کی تیاری کر کے کمرے کے اندر آ گئیں۔ ''آج پھر دیر لگا دی تمھارے بابو جی نے!'' وہ جھنجھلاہٹ بھری کرخت آواز میں بولیں، جواب ان کی عادت ہی بن گئی تھی۔ ''سب بابو اپنے دفتروں سے چھ بجے تک لوٹ آتے ہیں، لیکن ان کا حساب کتاب ہی دوسرا ہے۔''

بہن انھیں تسلی دیتے ہوئے بولیں، ''آتے ہی ہوں گے اماں! ابھی تو سات ہی بجے ہیں۔''

اماں بڑبڑاتی ہوئی، سروتے سے سپاری کاٹنے لگیں، جس کی کٹر کٹر آواز کمرے کے سناٹے میں گونج اٹھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی جس میں سے ہوا کے جھونکے پردے کو ہلاتے ہوئے اندر چلے آ رہے تھے۔

''اماں، اس بار شاید بابو جی کا دفتر دلّی چلا جائے؛'' چھوٹے نے بہن کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔

''ہماری قسمت میں دلّی نہیں ہے،'' اماں جھنجھلاہٹ بھری آواز میں بولیں، ''یہیں برف میں ٹھٹھریں گے۔ کتنی چیسیں مارتی ہیں پیروں میں...''

''تم موزے پہنا کرو اماں!'' بہن دبی آواز میں بولی۔

''کیا موزے پہن کر رسوئی میں کھانا پکاؤں گی؟'' ان کا غصہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

چھوٹے کو ہنسی آنے لگی، جسے وہ بہت مشکل سے دبا سکا۔ اماں موزے پہن کر کیسی لگیں گی، اس کے تصور سے ہی اسے ہنسی آنے لگی۔ اماں کو پتا چل گیا۔ ''تو کیوں دانت نکال رہا ہے؟ چھٹیوں میں دونوں آوارہ بن جاتے ہیں۔ ننھا تو پچھلے سال بھنگیوں کے لڑکوں کے ساتھ سارا دن فٹ بال کھیلتا رہتا تھا۔ جب انھیں کوئی فکر نہیں تو میں ہی کیوں اپنا سر کھپاتی پھروں...اور پھر میری سنتا ہی کون ہے؟''

کمرے میں سناٹا چھا گیا، صرف اماں کا سروتا اپنا شور مچاتا رہا۔ اکتوبر میں ہی سردی کا زور بڑھ گیا تھا، جس سے جاڑوں کے جلدی آنے کا اندیشہ بھی بڑھ گیا تھا! بہن چھوٹے کا سویٹر بن رہی تھیں، جسے وہ اپنے سسرال جانے سے پہلے ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ چھوٹا ان کے گھٹنے پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔

Scanned with CamScanner

''اماں کو بہت غصہ آ رہا ہے دیدی!'' چھوٹے نے بہن کے کان میں دھیمی آواز میں کہا۔ بہن نے مسکرا کر اس سے چپ ہو جانے کو کہا۔

باہر اندھیرا ہو جانے کے بعد جھینگر چیڑ اور دیودار کی شاخوں سے چمٹ کر اپنا متواتر سنگیت شروع کر دیتے تھے، جس کی آواز کمرے کے اندر بھی گونجتی رہتی تھی اور باہر پھیلی خاموشی کے وجود کا احساس بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہونے لگتا تھا۔

''اس سال برف جلدی گرے گی دیدی،'' چھوٹے نے بند کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''اس بار میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی سلیج بنوالوں گا، جس سے اَنڈیل تک پھسلتا جاؤں۔''

نتھا ہنسنے لگا۔ ''یہ تو انڈیل کے بدلے بیچ میں ہی کسی کھڈ میں پڑا دکھائی دے گا...''

بہن نے ڈانٹ بھری آواز میں کہا، ''تم اسے سکھا دینا نتھے! مشق کرے گا تو سیکھ ہی جائے گا۔''

تبھی پتا کے جوتوں اور چھڑی کے کھٹ پٹ کرنے کی آواز کمرے کے اندر پہنچ گئی، جس پر چھوٹا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور نتھے نے میز پر پڑی کتاب کھول لی۔ اماں نے اپنے چہرے کو اور بھی سخت بنا لیا اور سپاری کاٹنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ صرف بہن کے چہرے پر بے چینی کی ایک چمک پھیل گئی۔ انھیں پتا سے بے حد لگاؤ تھا۔

''شام کو کہیں گھومنے چلی جایا کرو،'' بہن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ بولے۔

''آج سردی بڑھ گئی ہے۔ دور پہاڑوں پر شاید برف گری ہے۔ کہیں جانے کو جی نہیں چاہا۔'' بہن نے پل اوور ایک کونے میں رکھ دیا۔ اماں تیز چال سے گھر کے اندر کے حصے میں چلی گئیں۔ اپنا غصہ ظاہر کرنے کی یہ ان کی پرانی عادت تھی، جس کے سب عادی ہو چکے تھے۔

بہن کے گھر میں رہنے کے سبب پتا جلدی ہی گھر واپس لوٹ آتے تھے، نہیں تو آفس کے بعد کلب، ٹینس، ڈرنکس اور دوست... یہ ان کا بندھا ٹکا پروگرام تھا۔

''آپ چائے لیں گے؟'' بہن نے پوچھا۔

''نہیں، آج آفس میں کئی بار چائے پینی پڑی۔ مسٹر وڈ واپس جا رہے ہیں، آج ان کی فیئر ویل پارٹی تھی۔'' پتا کی ایک اپنی ہی دنیا تھی، جس میں گھر اور خاندان اور ان کے مسائل صرف رسمیں تھیں

جنھیں وہ جیسے تیسے پورا کر دیتے تھے۔ بہن کا بیاہ کر کے وہ اور بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ وہ جب شملہ میں ان کے گھر میں ہوتیں تو گھر میں ان کا سامنا ہونے پر ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے، لیکن ان کے کانپور چلے جانے کے بعد ان کا دھیان اس طرف کم ہو جاتا تھا۔

''اس سال بھی آپ کا دفتر دلّی نہیں گیا۔ یہ دونوں بہت دکھی ہو رہے ہیں۔''

پتا نے دونوں لڑکوں پر ایک کڑی نظر ڈالی۔ ''لڑائی چل رہی ہے۔ پورا جنرل ہیڈ کوارٹر یہیں ہے۔''

ننھے کی نسبت چھوٹا پتا سے زیادہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بولا ''یہاں تو لڑائی نہیں ہو رہی۔ کتنے ہی دفتر دلّی چلے گئے۔''

وہ غصے بھری آواز میں کہنے لگے، ''تم سمجھتے تو ہو نہیں، دلّی جانے کی رٹ لگائے رہتے ہو۔ پڑھائی لکھائی کرو۔ جاڑوں میں تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔''

''یہی بات تو میں بھی انھیں سمجھا رہی تھی۔''

دسمبر میں اسکول بند ہو گئے۔ سردیوں کی سردی اور اُوب سے بچنے کے لیے جن بچوں کے کوئی رشتے دار نیچے شہروں میں کہیں رہتے تھے، وہ کچھ دنوں کے لیے وہاں چلے گئے تھے۔ چھوٹا اور ننھا کہیں نہیں جا سکے۔ صبح سے لے کر شام تک کا لمبا دن جا کو کی چڑھائی جیسا جان پڑتا تھا۔ بند کوٹھیوں کے اجڑے سے باغ، خالی میدان اور سوکھی پتیوں کے جھنڈ ایک خالی پن کا تاثر دیتے تھے۔ شام کے چار بجے سے ہی اندھیرا چھانے لگتا اور ہوا سیدھے ہڈیوں کے اندر پہنچ کر کپکپا دیتی۔

ننھے کے کچھ دوست انڈیل کے اوپر رہتے تھے، جن کے ساتھ وہ دن کا ایک بڑا حصہ گزارتا تھا۔ چھوٹے کو گھر میں بابو جی اور ننھے کے بغیر اکیلے رہنا اچھا لگتا تھا اور وہ کسی نہ کسی کام میں الجھا رہتا تھا۔ ننھے اور اس کے بیچ عمر کا ایک ایسا فاصلہ تھا جو اس عمر میں کبھی پھلانگا نہیں جا سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے سبھاؤ اور دلچسپیاں بھی اتنی مختلف تھیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجنبی سا محسوس کرتے تھے۔ ننھے کے دوست بھی کبھی چھوٹے کو اچھے نہیں لگے۔

بارشوں کی دھند کی طرح سردی کی ایک اوجھل سی چھاؤں چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ بادلوں کی گھومتی ٹکڑیوں کے بیچ پہاڑوں پر سورج کی پھسلتی ہوئی شکلوں کی بھول بھلیوں کے کھیل رچتی رہتی

Scanned with CamScanner

تھی۔ سنجولی کی پہاڑی کے ایک سرے پر گہرے کالے رنگ کے دیودار اور فر کے پیڑوں کا جھنڈ دور سے ہی 'سمیٹری' کے ہونے کی اطلاع دیتے تھے۔ ان کے پیچھے اونچے پہاڑوں کے کتنے ہی سلسلے تبت تک چلے گئے تھے، جہاں سے 'کم' ایک بار سفر پر آیا تھا۔ چھوٹا جانتا تھا کہ اسی سمت میں دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ 'ماؤنٹ ایورسٹ' بھی کہیں چھپا ہوا ہے۔

لیکن بار بار اسے اپنے گھیرے میں جو غیبی طاقت جکڑ لیتی تھی، وہ تھی دلّی کی اَن گنت یادوں کا جال، جو پھیلتا گیا تھا۔ اس موقعے پر اسے اپنی بہن کی غیر موجودگی اکھرنے لگتی تھی، جن کے ساتھ وہ ان یادوں کو پھر سے تازہ کر سکتا تھا۔ دلّی کا تانگہ، چاندنی چوک کی دکانیں، منگل کو ہنومان کا میلہ، ریوالی کے سامنے اوبیرائے کی اکیلی آئس کریم کی دکان اور سائیکل کی سیر... شملہ میں ان میں سے ایک بھی چیز دستیاب نہیں تھی۔

دو برس پہلے جب وہ اچانک ہی دلّی چلے گئے تھے تو ان کی خوشی اور اشتیاق کی حد ہی نہیں تھی۔ وہ دونوں اپنے سارے دوستوں اور پڑوسیوں سے کہہ آئے تھے کہ اگلے ہفتے دلّی جا رہے ہیں۔ روز تاریخ دیکھتے، گھڑی دیکھتے اور وقت ان کے لیے رک سا گیا تھا۔ پتا کو آفس سے ہی اسٹیشن آنا تھا۔ ان دونوں نے ماں سے جلدی اسٹیشن جانے کی ضد کی، جس کی وجہ سے وہ گاڑی چلنے سے تین گھنٹے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئے، جو انھیں گھر کی چہاردیواری سے بہتر ہی جان پڑا۔ پھر کالکا کی جھلمل کرتی ہوئی روشنیاں دور سے ہی دکھائی دینے لگی تھیں اور انھیں یہ سوچ کر بہت خوشی ہوئی کہ اب پہاڑ بہت دور چھوٹ گئے ہیں۔

لیکن ان جاڑوں میں ان سب کی یاد سے چھوٹے کا بہت سا وقت آسانی سے گزر جاتا تھا اور رات کو ٹھنڈے بستر میں گھس کر لحاف کو سر کے نیچے دبا کر یہ سلسلہ نیند آنے تک جاری رہتا تھا۔

چھوٹا فٹ بال، بیڈمنٹن بھی نہیں کھیلتا تھا، جہاں پوری شام اس کے دوسرے دوست ہنستے ہوئے گزار دیتے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں ہی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے اس سے اتنا الجھ جاتا تھا کہ اس سے اسے کبھی اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں، ان دنوں چھوٹے کو دیدی کی بہت یاد آتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا جیسے وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہیں اور اس کی مدد کی امید لگائے ہوئے ہیں۔ ایک بار ننھے سے یہ بات کہی تو وہ اس کی بے وقوفی پر زور سے ہنسنے لگا۔ دیدی کے ساتھ عمر کا یہ لمبا فاصلہ

Scanned with CamScanner

ان دونوں کے بیچ کوئی دیوار نہیں بن گیا تھا، اور ان کی باتیں مختلف سمتوں کو چھوتی ہوئی ایک روانی کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی تھیں — گھر اور گھر کے باہر کے وہ چھوٹے بڑے واقعات، جو ان کی غیر موجودگی میں ہوئے تھے۔ لیکن جب بھی دیدی سے وہ ان کے سسرال کی بات پوچھتا تو وہ بہت مختصر جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کرتی تھیں، جس سے اس کے ذہن کی گتھی زیادہ الجھ جاتی تھی۔

جاڑوں میں سردی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ماں کی ٹانگوں میں گٹھیا کا درد بھی بڑھ جاتا تھا، جس سے ان کا غصہ اور چڑچڑاپن بار بار ابھر آتے تھے۔ چھوٹے کو ان پر ترس بھی آتا تھا، لیکن وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر میں گھر کے پچھلے برآمدے میں دھوپ سینکنے کے لیے وہ دری پر لیٹی یا اپنی سپاری کاٹتی رہتی تھیں۔ پڑوس کی کوئی عورت آ جاتی تو وہ بے حد خوشی سے باتیں کرنے لگتیں۔ وہ دلّی کے کٹڑا نیل کی تین منزلہ حویلی کے پچاس لوگوں کے مشترک خاندان میں سے آئی تھیں۔ ان کا دل ابھی تک یہ چھوٹا سا خاندان، یہ پہاڑ اور یہ سناٹا قبول نہیں کر سکا تھا۔

اپنے گھر کے پاس ہی سڑک پر لگے نل کے پاس سے ایک پگڈنڈی سیدھی گورکھا اسکول کی طرف چلی جاتی تھی، جس میں دیدی بھی دو سال کے لیے پڑھی تھیں۔ چھوٹا کبھی کبھی اوب کر اس پگڈنڈی پر اسکول کے نیچے بنی باؤلی کا ٹھنڈا پانی پینے کے لیے چلا جاتا تھا۔ بیچ میں 'ہبرٹ وِلا' پڑتا تھا، جہاں دو بھائی، جو اس کے ہم سبق تھے، رہتے تھے، لیکن ان کے دلّی چلے جانے پر دروازے اور پھاٹک پر تالے لگے تھے۔ برآمدے میں چوکیدار کی کھاٹ پر کمبلوں اور پھٹی رضائیوں کا ایک ڈھیر دکھائی دیتا تھا۔ سورج جلدی ہی چھپ جاتا تھا اور سردی سے بچنے کے لیے لوگ جلدی ہی اپنے گھروں میں بند ہو جاتے تھے، جس سے باہر اندھیرے میں پھیلا سناٹا اور بھی بھیانک جان پڑتا تھا۔ چھوٹے کو گرمیوں کے دن یاد آتے تھے جب سڑکوں، گھروں میں کتنی چہل پہل رہتی تھی۔ وہی چہل پہل ان دنوں دلّی میں ہوگی۔ گول ڈاک خانے کے پاس ایلنبی روڈ پر انھیں ایک بڑی سی کوٹھی ملی تھی، جس کا باغ ہی اتنا بڑا تھا جہاں فٹ بال کھیلی جا سکتی تھی۔ سب سے بڑی کشش ہنومان کے مندر میں میلے کی تھی جو ہر منگل کو لگتا تھا، جہاں چاٹ، گول گپے، قلفی، گر گر وغیرہ سے ان کا جی کبھی نہیں بھرتا تھا۔ بیاہ سے پہلے دیدی بھی بڑے شوق سے ان دونوں کا ساتھ دیتی تھیں۔ کبھی کبھی اماں بھی جاتی تھیں۔ تانگے میں لوٹتے وقت

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور تانگے کے ہچکولوں کے درمیان وہ چورن کھاتے ہوئے اگلے منگل کے انتظار میں کھو جاتے تھے۔

لیکن اس برس وہ سب سپنے ادھورے ہی رہ گئے۔

اس برس جاڑوں میں جتنا سونا پن، سناٹا، اکیلا پن چھوٹے نے محسوس کیا، اتنا پچھلے برس نہیں کیا تھا۔ کبھی مال روڈ جانے پر اسٹیشن کی لال چھت نیچے دکھائی دیتی تو سفر کی خواہش اور بھی شدید ہو جاتی تھی اور پھر اس کا بھٹکتا دل اپنی پرانی بھول بھلیوں میں کھو جاتا تھا۔ دور وائسریگل لاج کے پیچھے پہاڑوں پر بارش دکھائی دینے لگی تھی۔ دن میں کئی بار دیدی کی یاد آتی تھی۔ انھیں کتنے ہی خط لکھ کر اس نے پھاڑ دیے تھے۔ بلاوجہ ان تک اپنے احساسات پہنچانے کا کیا مطلب؟

اچانک ہی ان جاڑوں میں چھوٹا اپنے آپ کو بڑا محسوس کرنے لگا جو اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنا بوجھ خود ہی ڈھو سکتا ہو، جیسے اچانک ہی کسی راز کا پتا چل گیا ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسا بھی لگتا جیسے کہیں متواتر کچھ کھوتا بھی جا رہا ہو، جس کا صحیح طرح سے اسے کبھی احساس نہیں ہوتا تھا۔

دیودار کے گھنے پیڑوں کی سوکھی شاخیں تیز ہوا کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر ڈولنے لگتیں اور بے اختیار چھوٹے کی آنکھوں کے سامنے دیدی کا چہرہ گھوم جاتا تو اس کی فکر بڑھ جاتی۔ شاید وہ بیمار پڑی ہوں، جس کی وجہ سے ایک خط بھی نہیں لکھ سکیں۔ تین برس پہلے بھی اسی صورت حال سے ملتا جلتا ایک دور آیا تھا اور بعد میں انھیں پتا چلا تھا کہ ان کا بچہ ڈپتھیریا کا شکار ہو کر چل بسا۔ اس کی یاد میں ہی چھوٹا کپکپا سا اٹھتا۔ وہ بے کل ہو کر پوچھتا، ''دیدی ٹھیک تو ہیں نا؟ کئی دنوں سے ان کی کوئی چٹھی نہیں آئی۔'' ماں فکر سے جھنجھلا اٹھتیں۔ ''چٹھی سے ہی کیا تسلی ہو جاتی...'' وہ کہنے لگتیں، ''اس کے خط بھی جھوٹی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کیا میں جانتی نہیں؟'' چھوٹے کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا، لیکن اماں سے زیادہ پوچھنے پر ان کا غصہ ہی بڑھ جاتا۔

صبح کی دھوپ کے ساتھ ساتھ چھوٹے کے دل میں ابلتا ہوا شوق پہاڑی سلسلوں کے پار جا کر بھٹکنے لگتا جہاں اسے کوئی راہ ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کئی بار وہ تصور کرتا کہ ان اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے ہموار گھاٹی سے وہ سیدھے سر کے اوپر ہی دکھائی دیتے ہوں گے۔ ہری گھاس کے

Scanned with CamScanner

میدان، کوئی جھیل یا پیڑوں کے جھنڈ کے نیچے کوئی چشمہ... شملہ میں یہ سب نہیں تھا۔ ایک بار اپنی کلاس کے لڑکوں کے ساتھ گرمیوں میں وہ وائلڈ فلاور ہال گیا تھا، جس کے احاطے کے باہر کچھ دوستوں کے ساتھ اندر بنی بہت خوبصورت دو منزلہ عمارت اور گھاس کے میدان اور پیڑوں کی چھاؤں میں چھتریوں کے نیچے انگریز مرد عورتوں اور بچوں کو دیکھ کر وہ تعجب میں پڑ گیا تھا۔ پھر ماسٹر کی ڈانٹ سن کر وہ نیچے مشوبھرے کے بازار کی طرف بڑھ گئے تھے۔

''کب ختم ہوں گی یہ سردیاں؟'' ننھے نے اُونگھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو جاڑوں کی پہلی برف بھی نہیں گری...''

''تو نے ہوم ورک کر لیا؟''

چھوٹے کو ہنسی آ گئی۔ ''تمھیں ہوم ورک کی یاد آج کیسے آ گئی؟ تم تو اسکول کھلنے سے پندرہ دن پہلے ہی یہ سب سوچنا شروع کرتے ہو۔''

ننھے کو غصہ آ گیا۔ ''میں کل سے ہی شروع کر دیتا ہوں۔ ابھی تو دو مہینے پڑے ہیں اسکول کھلنے میں...''

ڈاکیہ پابندی سے بارہ بجے کے قریب کیتھومیں دکھائی دیتا تھا۔ ایک فرلانگ کی دوری پر، اونچائی پر بنی سرکاری ڈسپنسری کے نکڑ پر اس کی خاکی پگڑی چھوٹے کو برآمدے میں سے دکھائی دے جاتی۔ اس کی سانس اور بھی تیزی سے چلنے لگتی۔ ڈاکیے کی دھیمی رفتار اور راستے میں ملتے لوگوں سے دو چار باتیں کرتے دیکھ کر چھوٹے کی جھنجھلاہٹ اور بھی بڑھ جاتی۔ ڈاکیہ چھوٹے کو پہچانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی دور سے ہی وہ اپنی خالی ہتھیلی دونوں طرف گھما کر خط نہ ہونے کی اطلاع اسے دے دیتا تھا اور چھوٹا اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لیے ڈاکیے سے بالکل بے نیاز ہو جاتا۔

''آج بھی دیدی کی کوئی چٹھی نہیں آئی اماں...'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

''آ گئی ڈاک؟''

''ہاں، ڈاکیہ تو ابھی ابھی چنگی خانے کی طرف بڑھ گیا۔''

اماں کا غصہ بہت بڑھ گیا۔ وہ جیسے بہت ہی پرسکون آواز میں اپنے آپ سے بولیں، ''اب اس

Scanned with CamScanner

کی چٹھی کبھی نہیں آئے گی..." اور وہ رسوئی گھر میں چلی گئیں۔

اس دن وہ بھی پچھواڑے کے برآمدے میں چھجے پر جھکا ہوا دیر تک روتا رہا۔ سامنے کے پہاڑ پر براڈی کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے، جن کی سلیٹ کے پتھروں کی چھتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پھر اس رات جاڑوں کی پہلی برف گری۔ پہلے بھی کئی بار ایسا امکان ہوا تھا، لیکن بادل چھٹ جاتے اور دھوپ چمکنے لگتی اور برف کی امید بھی دور کھو جاتی۔ لیکن اس رات ایسا نہیں ہوا۔ ننھا ان دنوں انڈیل میں اپنے دوستوں کے ساتھ پابندی سے فٹ بال کھیلنے جاتا تھا — کم سے کم کہتا تو وہ یہی تھا۔ پتا دفتر سے نہیں لوٹے تھے۔ چھوٹا اکیلے ہی گھر میں کبھی برآمدے میں جا کر برف گرتے دیکھتا، کبھی کمرے میں جلتی آگ سے اپنی سردی دور کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ دسمبر کے آخری دن تھے جب پیڑوں کی شاخوں پر ایک بھی پتی دکھائی نہیں دیتی تھی اور ہوا میں اتنی سردی بھر گئی تھی کہ سورج چھپتے ہی کمرے کے اندر آگ کے سامنے بیٹھنے کی خواہش ہونے لگتی تھی۔

برف کے گالے تیز اور بھاری ہو گئے تھے، جس سے لال ٹین کی چھتیں دھیرے دھیرے سفید ہوئی جا رہی تھیں۔ چھوٹا جانتا تھا کہ صبح چارپائی سے اٹھ کر وہ کھڑکی سے جھانکے گا تو سب کچھ سفید ہی دکھائی دے گا۔

تبھی ماں کی غصیلی آواز سنائی، "کیا ننھا ابھی تک کھیل کر نہیں لوٹا؟" اس نے گردن ہلا کر انکار کی اطلاع دے دی۔

"اس برف میں کیا کھیلے گا! آوارہ بن گیا ہے، کسی کا ڈر نہیں،" اماں کی تیز آواز شام کے اندھیرے میں گونج گئی۔ "باپ کو تو فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے بابو بھی تو ہیں جو سیدھے دفتر سے گھر واپس لوٹ آتے ہیں، لیکن انھیں تو ٹینس اور کلب..." اس شام کی سردی کی شدت کی وجہ سے ماں کا گٹھیا کا درد بڑھ گیا تھا جسے وہ دوسروں کے قصور نکالنے میں بھول جانا چاہتی تھیں۔ ماں اور پتا کے جھگڑے کی بات سوچ کر وہ خوفزدہ ہو اٹھتا تھا: کبھی کبھی تو جیسے ایک دھماکا سا ہو جاتا تھا۔

اوپر مال روڈ سے انڈیل جانے والی اترائی پر اکا دکا لوگ ہی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز چال

Scanned with CamScanner

سے گھر کی طرف جاتے دکھائی دیتے تھے۔ لیمپ پوسٹ کی دھندلی روشنیوں میں برف کے گالے بارش کی بوندوں سے جان پڑ رہے تھے۔ گرمیوں میں اس وقت اسی سڑک پر کتنی رونق رہتی تھی، کتنا شور گونجتا تھا، کسی گھر سے ہارمونیم پر گانے کی آواز، کہیں آرتی کے گھنٹے اور شنکھ ...اور دیودار کے پیڑوں کی شاخوں میں چھپکے جھینگر، جن کی ایک لے میں بہتی آواز پانی کے بہاؤ سی جان پڑتی تھی۔

برآمدے میں سے انڈیل کا لمبا چوڑا میدان کالا سمندر سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہیں دور سنیچر کو گھوڑوں کی ریس ہوتی تھی، پھر ڈیورینڈ کے فٹ بال میچ، لنکا شائر اور موہن باگان کے بیچ فائنل... گوروں کی ٹیمیں میچ کے بعد اسی سڑک کے اوپر مال روڈ کی سمت میں لوٹتی تھیں اور کیتھو میں رہنے والی لڑکیاں خوف سے اپنے گھروں میں چھپ جاتی تھیں۔ لیکن وہ تو گرمیوں کے دن تھے۔ اب تو انڈیل میں ہری گھاس ڈھونڈنے پر بھی دکھائی نہیں دیتی۔

چھوٹے کا کوئی خاص دوست ویسے بھی نہیں تھا اور ان جاڑوں میں تو ایک بھی نہیں بچا تھا۔ اگر انوپ دلّی نہ چلا گیا ہوتا تو کبھی کبھار وہ اس سے مل سکتا تھا۔ دلّی پہنچ کر اس نے ایک خط چھوٹے کو لکھا تھا، لیکن کئی کوششوں کے باوجود بھی چھوٹا جو کچھ خط میں ظاہر کرنا چاہتا تھا، وہ نہیں ہو سکا۔

ننھے کو چنگی خانے کے موڑ پر شام کو جھٹ پٹے میں ایک دن جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ سگریٹ پیتے دیکھا تھا تو اچانک اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو سکا۔ وہ دبے پاؤں واپس لوٹ گیا، جس کی وجہ سے ننھے نے اسے نہیں دیکھا۔ اس حادثے سے اسے اتنا گہرا دھکا لگا کہ کچھ دنوں تک وہ ننھے کے چہرے کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکا۔ دیدی کو جب پتا چلے گا تو انھیں بھی بہت دکھ ہوگا اور وہ اسے سمجھا بجھا کر اس عادت کا شکار بننے سے روکیں گی۔ لیکن ان کا تو اتنے دنوں سے کوئی خط نہیں آیا۔ چھوٹے کی آنکھیں بھر آئیں۔

اسے یہ سوچ کر بھی کم تعجب نہیں ہوتا تھا کہ کیسے ننھا اپنے دوستوں کے ساتھ صرف گپیں لڑانے میں اتنے گھنٹے بغیر اُوبے گزار سکتا تھا۔ یہ بھی اس نے محسوس کیا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنے کپڑوں، اپنی شکل صورت اور اپنے بالوں پر بہت دھیان دینے لگا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ننھے کے اوپری ہونٹ پر مونچھوں کے ملائم سے بال زیادہ صاف طرح سے دکھائی دینے لگے تھے۔ ان دنوں چھٹیوں میں ان چھوٹی موٹی باتوں پر اس کا دھیان خود بخود ہی چلا جاتا تھا اور کافی دیر تک وہیں ٹکا رہتا تھا۔

Scanned with CamScanner

پہلی برف کے گرنے پر گھر میں صرف ماں اور وہ... ماں اپنے کمرے میں پوجا کر رہی تھیں اور ان کے بھجن — ’’میا، میں نا ہیں ماکھن کھایئو‘‘ — کا بے سرا سنگیت گھر کے سناٹے میں گونج رہا تھا، جس کا ذکر کئی بار دیدی کے سامنے ہوتا تھا اور وہ ہنسنے لگتے تھے، لیکن ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ ان کی ہنسی کہیں اماں کے کانوں تک نہ جا پہنچے۔ اس وقت اچانک چھوٹے نے بہت بے چینی سی محسوس کی۔ خواہش ہوئی کہ جوتے پہن کر باہر نکل جائے اور گرتی ہوئی برف کی چھاؤں میں بغیر کسی مقصد کے انڈیل تک کا چکر لگا آئے اور پتا کرے کہ ننھا کیا کر رہا ہے، کس دوست کے گھر میں بیٹھا ہے۔

کیتھو میں اصل انگریز نہیں کے برابر ہی تھے، اگر تارا ہال کی ننوں کو شامل نہ کیا جائے۔ صرف کچھ عیسائی اور اینگلو انڈین خاندان ہی بکھرے ہوئے تھے، جن کے لڑکے شام کو بھارتی بابوؤں کے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال، بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے، لیکن ان کے بیچ یہاں ایک دیوار سی بنی رہتی تھی۔ چھوٹے کی جماعت میں بھی کینی نام کا ایک اینگلو انڈین لڑکا تھا، جس کا رنگ بہت سفید تھا اور بال بھورے تھے۔ کئی بار اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس کا دوست بن سکے، لیکن وہ اپنے دوستوں کے درمیان اتنا پھنسا رہتا تھا کہ اسے چھوٹے جیسے لڑکے کے لیے کبھی وقت نہیں ملا۔

ننھے کو دیکھتے ہی اماں کا غصہ اور جھنجھلاہٹ اپنا بند توڑ کر تیز دھارے میں بہنے لگے۔ شوہر کے لیے جمع ہوا غصہ، اپنی بیماری اور اپنا اکیلا پن — کل ملا کر ایک بگولہ سا بن گیا۔ جب صورت حال زیادہ سنگین ہو جاتی تو بولتے وقت پان کی ہلکی سی رال ہونٹ کے ایک سرے سے نیچے ٹھوڑی تک بہنے لگتی تھی۔

’’سارا دن لفنگوں کی طرح باہر گھومتا رہتا ہے رے! گھر میں تو بیٹھ ہی نہیں سکتا...‘‘ ننھے کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس کے سر پر برف کے کچھ ٹکڑے ابھی تک پھنسے ہوئے تھے۔

’’باپ کے قدموں پر چل رہا ہے...‘‘ ان کی آواز اور بھی تیز ہو گئی۔ ’’ابھی سے یہ حال ہے تو آگے جا کر نہ جانے کیا بنے گا...‘‘ اسی سوچ کو لے کر ان کے دل میں بھرا غبار بہت آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگا۔

چھوٹا آگ کے پاس بیٹھا شرت چندر چٹر جی کی بڑی دیدی پڑھ رہا تھا۔ کہانی اتنی دلچسپ ہوتی جا رہی تھی کہ اسے بیچ میں ہی روک دینا اسے ناممکن سا جان پڑ رہا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ کچھ لمحوں

Scanned with CamScanner

میں ماں شانت ہوکر رسوئی میں چلی جائیں گی اور وہ ناول پڑھنا شروع کردے گا۔

اسی لمحے پتا بھی دفتر سے لوٹ آئے۔ کمرے میں گھستے ہی ان تینوں کو اس غیر فطری سی صورت حال میں دیکھ کر ان کے بیچ جھگڑا ہونے کا احساس انھیں لمحہ بھر میں ہوگیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ تیز آواز میں بولے۔

اماں کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ ''ہونا کیا تھا؟ کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ ننھا کتنا آوارہ ہوا جا رہا ہے۔ سارا دن دوستوں کے ساتھ باہر گھومتا رہتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس نہ وقت ہے، نہ بچوں میں کوئی دلچسپی...''

پتا نے لال لال آنکھوں سے ایک بار ننھے کو گھورا، پھر تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچ کر زور سے دو طمانچے اس کے دونوں گالوں پر جڑ دیے جن کی آواز کمرے میں گونج گئی۔ ''کیا کرتا ہے بدمعاش! پڑھائی میں سب سے پیچھے۔ خبردار جو گھر سے باہر قدم رکھا، نہیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا...'' کسی نے پتا سے اس طرح کے سلوک کی امید نہیں کی تھی۔ ''گھر میں گھسے نہیں کہ ہائے ہائے شروع ہو جاتی ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور دروازہ زور سے بند کرلیا۔

گھر کے اندر ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ ننھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اماں کچھ دیر تک کھڑی بڑبڑاتی رہیں، پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر رسوئی میں چلی گئیں۔ چھوٹا اکیلا اس بڑے کمرے میں رہ گیا۔ باہر برف کے گالے اور بھی تیزی سے گرنے لگے تھے۔ اس نے بڑی دیدی بند کر کے میز پر رکھ دی اور لکڑیوں کو ہلا ڈلا کر آگ کی لپٹوں کو تیز کرنے لگا۔ کھانا کھا کر بستر میں گھس کر اپنے آپ کو گرم کرنے کی خواہش تیز ہو اٹھی۔ چارپائی پر لیٹ کر ہی لحاف میں دبک کر بڑی دیدی پڑھے گا، اگر ننھے نے اس سے بتی بجھانے کو نہ کہا۔ اسے ننھے پر بھی ترس آتا۔ پتا کو اس طرح نہیں مارنا چاہیے تھا۔ لیکن اس رات بغیر کچھ کھائے پیے ننھا رضائی سے سر منھ ڈھک کر سیدھا لیٹ گیا اور بتی بجھانے کو نہیں کہا۔ چھوٹے نے ناول کھول کر گھٹنوں پر پھیلا لیا اور رضائی کو گردن تک گھسیٹ لیا۔ کتنا ہی وقت اس طرح گزر گیا، لیکن ناول میں اس کا دھیان پھر نہیں جم سکا۔ پہلی بار چھوٹے کو اس کی اور اپنی بیگانگی کا بھی احساس ہوا۔ اماں، بابوجی اور ننھا... وہ سب بھی کسی کہانی کے کردار جان پڑے جن کے ساتھ اس کے سمبندھ کہانی پڑھنے کے دوران تک ہی بنے رہے۔ کہیں کچھ غلط تھا، اس کا احساس اسے برابر ہو رہا تھا، لیکن اس کی جڑ

تک پہنچ پانا اسے ناممکن جان پڑ رہا تھا۔

وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سردی فوراً محسوس ہوئی، لیکن اس کی فکر نہ کر کے وہ کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پردہ ہٹا کر اس نے باہر جھانکا، لیکن اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا، صرف سڑک پر لگے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں سڑک کے ایک حصے پر سفید چاندنی کی سی چادر بچھی دکھائی دی۔ برف گرنے کا پتا نہیں چلتا، نہ بادلوں کی گرج، نہ بجلی کی چمک... چپ چاپ سب کچھ ہوتا رہتا تھا۔ چھوٹے کو لگا کہ کچھ ایسا ہی دیدی کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اوپر سے سب پرسکون، فطری اور خاموش، لیکن اس کے پیچھے دکھائی دیتا ایک ان دیکھا جوار بھاٹا... چھوٹے کو یہ احساس بھی ان دنوں شدت سے ہونے لگا تھا۔

یہ اُن جاڑوں کی پہلی برف تھی — کرسمس اور نیو ایئر کے بعد کی۔

❊❊

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

چنتو

اُترائی پر چیڑ کی سوکھی پتیوں کے اوپر پیر اپنے آپ جیسے پھسلتے جا رہے تھے۔ اس وقت چھٹکی ہوئی دھوپ تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو نہ تو 'او کلے' کی لال چھت اور چھت سے اوپر اٹھتی ہوئی چمنیاں دکھائی دے رہی تھیں، نہ 'آرڈی' کے میدان کے سامنے اونچے اونچے، گھنے یوکلپٹس کا جھنڈ دکھائی دیا۔

چھوٹی سی ندی دو پہاڑیوں کے بیچ پھیل کر شانت ہو گئی تھی، پل سے پار کرتے وقت نیچے پانی میں اپنی پرچھائیں دیکھنے کی کوشش کی۔ سامنے سیدھا پہاڑ تھا، جس پر بنی اَن گنت پگڈنڈیوں میں سے ہم نے ایک پکڑ لی۔ چڑھائی پر چال دھیمی ہو گئی، لیکن ہم دونوں کا جوش قائم رہا۔

چنتو کچھ فاصلے پر دھیرے دھیرے زمین کی طرف دیکھتا ہوا، جھکا ہوا چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ تھک کر کبھی ستانے کے لیے چند لمحوں کو رکتا تو میں پیچھے مڑ کر اس پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ کندھے سے لٹکتا ہوا اس کا بیگ اور ماتھے پر آگے کی طرف جھکا ہوا ہیٹ، یہ دونوں چیزیں ہی مجھے پراسرار جان پڑیں جن کے پیچھے چنتو اپنے آپ کو پوری طرح ڈھکے رکھنا چاہتا تھا۔ آج صبح اچانک ہی جب اس نے میرے ساتھ سیر کے لیے چلنے کی خواہش ظاہر کی تو مجھے تعجب ہی ہوا، اسے بھی اکیلے ہی سیر کرنا پسند تھا اور مجھے بھی۔

بغیر کوئی اطلاع دیے قلی کے سر پر ایک بستر اور ایک سوٹ کیس اٹھائے ایک شام کو جب وہ اچانک گھر پہنچا تو کچھ دیر تک اسے پہچاننا بھی ممکن نہیں ہوا۔ بڑے بھیا سے اس کا چہرہ ذرا سا بھی ملتا جلتا

Scanned with CamScanner

نہیں تھا۔ دو سال سے بھی زیادہ ہی وقت گزر چکا ہوگا جب میں پچھلی بار اس سے ملا تھا۔ کبھی کبھار کسی عزیز رشتے دار سے اس کی خبر ملتی بھی تو مجھ پر اس کا کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا تھا۔

برآمدے میں ہی سامان رکھوا کر قلی کو رخصت کر کے وہ بینت کی آرام کرسی پر پسر گیا۔ مجھے لگا جیسے سفر کی تھکان سے اس کا جسم نڈھال ہو گیا ہو۔ اس کی گری ہوئی صحت دیکھ کر بھی مجھے تھوڑی فکر ہوئی۔ میرے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اتنا دور تھا کہ میں نہ تو اس کے بارے میں بے پرواہ رہ سکتا تھا اور نہ ہی اس کے بوجھ کو کم کر سکتا تھا۔

''پدما دیدی نے آپ کا پتا دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہاں آپ کے پاس ایک 'ایٹک' بھی ہے، جہاں میں رہ سکتا ہوں،'' دھیرے دھیرے ستاتے ہوئے وہ بولا۔

میں نے نوکر سے چائے لانے کے لیے کہا۔

اس شام گھومنے بھی نہیں جا سکا۔ برآمدے میں شام کی پیلی دھوپ کے سائے میں میں دیر تک چھٹو کو ہی دیکھتا رہا۔ پیچھے طے کیا ہوا اس کا سفر دھندلا سا مجھے دکھائی دے رہا تھا، لیکن اس کا سفر کہاں سے شروع ہوا اور کہاں آ پہنچا، اس کا حساب کتاب لگانا آسان نہیں جان پڑا۔

اچانک بارش کی کچھ چھوٹی چھوٹی بوندیں سر پر ٹپک پڑیں تو حیرت سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک بڑا سا کالے رنگ کا بادل کا ٹکڑا سر کے ٹھیک اوپر نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا اور دوسری ٹکڑیاں بھی جمع ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں ایک گھنے دیودار کے پیڑ کے نیچے ستانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چھٹو بھی رک گیا۔ جیب سے رومال نکال کر اس نے چہرے کا پسینہ پونچھا، دھوپ کے چشمے کے شیشوں پر گری بارش کی بوندوں کو صاف کیا۔

''شاید زور کا پانی برسے گا...'

تبھی بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز دور دور تک گونج گئی۔ ڈوبتی شام جیسا اندھیرا لمحہ بھر میں پھیل گیا۔ میں ڈر سا گیا۔

کتنی ہی بار اس راستے سے چوبٹیا جاتے تھے۔ لیکن اس واقعے کو تو برسوں گزر گئے۔ برس گزرتے چلے گئے۔ اب لگتا تھا، جیسے خالی ہاتھ رہ گئے ہوں۔ یادوں تک کو بچا رکھنا ایک بے معنی سی کوشش جان پڑتی تھی۔ کائفل کے پیڑ، ڈھلانوں پر پھیلی چیڑ کی سوکھی پتیاں، دور سے دکھائی دیتا چوبٹیا

Scanned with CamScanner

کے گرجے کا کراس... مجھے اپنے اوپر ہی جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ برسوں بعد میں رانی کھیت اس لیے تو نہیں آیا۔ ایسا مضبوط فیصلہ میں نے یہاں آنے سے پہلے کئی بار کیا تھا...

''مون سون تو ختم ہو گیا، پھر یہ بارش کیوں؟''

چنو کسی نامعلوم سمت میں دھوپ کے چشمے سے جھانکنے کی کوشش کرتا جان پڑا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو پہلی بار رانی کھیت آیا تھا اور میں شاید آخری بار۔ یہ میرا پکا یقین تھا کہ زندگی میں پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ اس دن بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور موسلا دھار پانی میں چنو کے چہرے سے دھوپ کا چشمہ اتار کر میں اس کی آنکھوں کے پیچھے جھانکنا چاہتا تھا۔

''اسی پہاڑ سے پینتھر آتا ہوگا۔ یہاں آس پاس کوئی گاؤں بھی نہیں...'' چنو دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ''روزی بھی اسی طرف تاکتی رہتی ہے۔ اسے شاید اب بھی امید ہے کہ اس کا بچہ ایک دن واپس لوٹ آئے گا۔'' وہ تھوڑا ہنسا، لیکن اس کی نظر چاروں طرف گھومتی رہی۔

مجھے بھی روزی پر ترس آتا تھا۔ ڈاکٹر نیگی روزی کو بہت پیار کرتے تھے، لیکن مکان چھوڑتے وقت وہ روزی کو چوکیدار کو سونپ گئے۔ پچھلے سال ایک لکڑ بگھا روزی کے بچے کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ روزی اس کے پیچھے بھاگی تھی، لیکن اپنے بچے کو بچا نہیں سکی۔ پوری رات کھڈ میں اس کے رونے کی آواز گونجتی رہی۔ بڑی مشکل سے صبح چوکیدار اسے واپس گھر لے آیا تھا۔ چوکیدار سے یہ قصہ سن کر مجھے روزی سے آنکھیں ملانے میں گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

''یا شاید اس کا بچہ زندہ ہی ہو، کون جانتا ہے...'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا، ''روزی نے اسے مرتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔''

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہیں کسی جگہ سے برف کی چوٹیاں بہت صاف دکھائی دیتی تھیں — یہ بات اچانک ہی مجھے یاد آئی اور میں نے اس سمت میں دیکھا بھی، لیکن بادلوں کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ترشول، نندا دیوی، نیل کنٹھ ... پوری کی پوری میلوں لمبی قطار...

''آج تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا،'' چنو بولا۔

مجھے جیسے برف سے ڈھکی وہ سب چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کتنی ہی بار انھیں دیکھا

Scanned with CamScanner

تھا۔ کئی بار دل میں خیال کیا تھا کہ کسی چوٹی کے نیچے ایک چھوٹی سی جگہ میں ہمیشہ کے لیے بس جاؤں، تا کہ دور سے دیکھنے کا موہ ختم ہو جائے۔

''سینڈوچ نکالیے، مجھے تو بھوک لگنے لگی ہے،'' چٹو بولا۔ بارش رکنے ہی والی جان پڑ رہی تھی۔

میں نے بیگ میں سے ایک ڈبا نکالا اور ایک سینڈوچ اپنے لیے نکال کر باقی چٹو کو دے دیے۔ بارش کی بوندیں اس کے ہیٹ پر چمک رہی تھیں۔ بالوں کا ایک گچھا ماتھے پر جھولتا دکھائی دے رہا تھا۔ چٹو پر نظر پڑتے ہی میں اچانک چونک اٹھا۔ اس دن پہلی بار اسے دیکھ کر بڑے بھیا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس بات کو برسوں سے ہم بھی جانتے تھے کہ ان دونوں کے بیچ ڈھونڈنے پر بھی کبھی کسی طرح کی مشابہت دکھائی نہیں دیتی، پھر مجھے یہ خیال کیسے آیا؟ وہ سینڈوچ کھا رہا تھا اور دوسری طرف کے کھڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب کبھی بڑے بھیا کی بات دماغ میں آتی تو ایک طرح کا خالی پن سا ابھرنے لگتا تھا... ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہا کہ ان کی موت کو سات یا آٹھ یا دس سال گزر گئے۔ زیادہ دیر تک میں ان کے ساتھ بندھا نہیں رہتا تھا لیکن جس احساس کو بہت کوشش کے بعد بھی دور نہیں کر پاتا تھا وہ تھی آخری دنوں میں ان کی آنکھوں میں چھپی فکر مندی اور ایک گہرا دکھ کہ ان کی موت کے بعد سترہ سال کے چٹو کا کیا ہوگا۔ ہم لوگوں کے دلاسوں پر ان کو یقین نہیں تھا۔ آج وہ چٹو کو اس کی موجودہ حالت میں دیکھتے تو کیا آسانی سے سہہ سکتے تھے؟ دھیرے دھیرے چٹو کے ایٹک میں رہنے کی مجھے عادت پڑ گئی۔ ایٹک میں لکڑی کا فرش ہونے کے سبب اس کے چلنے پھرنے، کرسی کھسکانے یا ٹیپ ریکارڈر پر کوئی سنگیت بجنے کی سب آوازیں نیچے میرے کمرے اور برآمدے تک سنائی دیتی تھیں، جنھیں شروع شروع میں تو سن کر میں چونک سا جاتا۔ وہ رانی کھیت کیوں آیا؟ کتنے دن رہے گا؟ یہ سوال سوال ہی بنے رہے۔

وہ ستمبر کے آخری دن تھے۔ بارش پوری طرح سے بند نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھی سردی اچانک بڑھ جاتی۔ مال روڈ سے تھوڑا نیچے او کلے اور آرڈی کے بیچ یوکلپٹس کے جھنڈ کے پیچھے چھپی ہوئی چھوٹی سی کاٹیج ایک دم ویران سی لگتی۔ کاٹیج کا ایک حصہ بند تھا۔ پچھلے سال بیوی کی موت کے بعد ڈاکٹر نیگی اس مکان میں اکیلے نہیں رہ سکے۔ باغ، پھولوں کی کیاریاں، پھلوں کے پیڑ، سب اجڑے ہوئے اور لاوارث سے جان پڑتے تھے۔ میں ان دنوں کا تصور کیا کرتا تھا جب برسوں پہلے ڈاکٹر نیگی، ان کی بیوی

اور بچے اس گھر میں رہتے ہوں گے۔ ابھی تک اس گھر میں ان لوگوں کی خوشبو موجود تھی۔ چنتو گھومنے پھرنے بہت کم ہی جاتا تھا۔ ایٹک کے اندر ہی وہ اپنے آپ میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ نیچے تک آنے کی جیسے اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک دو بار شروع کے دنوں میں میں اس سے باتیں کرنے کے ارادے سے ایٹک کے اندر گیا تھا، اس کے پلنگ، میز پر بکھرے کاغذ، کتابیں، اس کے کپڑوں پر ایک اڑتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ لیکن میرا ایٹک کے اندر آنا اسے اچھا نہیں لگا تھا، یہ بات اس نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی تو کھانا تک وہ ایٹک میں ہی منگا لیتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس سے باتیں کرنے سے میں ٹھگا سا رہ جاتا تھا، جس سے مجھے اس پر غصہ آتا تھا۔ اس سے میں کچھ نہ کہتا۔ ایٹک کے دروازے سے سٹا ایک بہت چھوٹا سا برآمدہ تھا، جہاں ایک آرام کرسی پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھتا یا آنکھیں موندے چپ چاپ پڑا رہتا۔

رانی کھیت آنے سے پہلے دو مہینوں کے میں نے جو جو منصوبے بنائے تھے وہ پورے ہوتے نہیں جان پڑتے تھے۔ سوچا تھا کہ بالکل بے فکر ہو کر ستمبر اور اکتوبر کے اجلے، صاف دنوں میں ان بہت سے واقعات کو ہمیشہ کے لیے بھلانے کی کوشش کروں گا جن کی کالی پرچھائیں کبھی کبھی میرے راستے میں آ کھڑی ہوتی تھی۔ لیکن چنتو کے آنے کے بعد میرا پروگرام گڑبڑ ہو گیا تھا اور میں دوسری ہی الجھنوں میں پھنس گیا تھا۔ اس کے پیلے چہرے اور اندر کی طرف دھنسی آنکھوں اور ابھری ہوئی ہڈیوں کی طرف جب کبھی میری نظر چلی جاتی تو میں اس طرف چنتو کا دھیان دلانے کی کوشش کرتا۔ پابندی سے لمبی سیر کرنے کی میں نے رائے دی۔ اس کی بے پروائی سے مجھے تکلیف پہنچتی۔ بڑے بھیا اس کی اس حالت کو آسانی سے قبول نہ کرتے۔ صحت کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ اپنی صحت کے بارے میں اتنا چوکنا رہنے پر بھی آخر میں وہ نہ جانے کہاں دھوکا کھا گئے! اس راز کا پتا بھی نہیں لگ سکا۔

بادل تیزی سے گھٹنے لگے، جس سے کہیں کہیں آسمان میں نیلے ٹکڑے دکھائی دینے لگے تھے جو نیلے دیپ سے جان پڑ رہے تھے۔ دور کالکا کے گولف گراؤنڈ کا ایک حصہ دھوپ میں چمکنے لگا تھا۔ الموڑا کی طرف بارش نہیں ہو رہی تھی۔ سب کچھ بہت دور دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ پہاڑ، دھوپ کے ٹکڑے، بکھرے گاؤں اور جنگل ـــــ جب یہاں نہیں رہوں گا، یہ دوری اور بھی بڑھ جائے گی، میں نے سوچا۔

Scanned with CamScanner

چوبٹیا کے گرجے کا کراس جب ایک موڑ پر پہاڑی کے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دیا تو میرے پاؤں کچھ دیر کے لیے وہیں ٹھٹک گئے۔ اس ویران گرجے کے لیے میرے دل میں برسوں سے گہرا موہ تھا۔ پہاڑی کے اوپر بنے اس گرجے کے اندر کھڑکیوں کے ٹوٹے شیشوں میں سے اندر جھانک کر جب بھی دیکھا ہر بار ایسا لگا جیسے دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے ہوں۔

''دیکھو چٹو، یہی ہے وہ گرجا۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کے بنتے ہی انگریز بھارت چھوڑ کر چلے گئے اور یہ یتیم سا یہیں کھڑا رہ گیا۔''

سلیٹ کے پتھروں کی گرجے کی چھت بادلوں کے رنگ کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ ایک بہت بڑا گھنا دیودار گرجے کے پاس ہی کھڑا تھا۔

''سنیے، اسی گرجے کے بارے میں بابو جی نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ ایک دن میں آپ کو دکھاؤں گا۔''

چٹو کی آواز سن کر میں سہم سا گیا۔ ''ڈائری... بڑے بھیا ڈائری لکھتے تھے؟''

''مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ بابو جی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ زیادہ نہیں لکھا، کبھی کبھی تو مہینوں تک ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ خالی صفحے اور تاریخیں... جن پر وہ کچھ لکھنا چاہتے تھے، لیکن لکھ نہیں سکے...''

چٹو انتہائی غیر جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا، ''کچھ تاریخیں شاید ایسی تھیں جن کی ان کے لیے بہت اہمیت تھی، لیکن میں کچھ بھی پتا نہیں لگا سکا۔ آپ کو دکھاؤں گا، شاید آپ کچھ جانتے ہوں۔''

ان تاریخوں کی بات جان کر مجھے دل ہی دل میں تھوڑا ڈر بھی لگا۔ میں ماضی کی گتھیوں کو سلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ چٹو کو ان سب باتوں میں دلچسپی اچانک ہی کیسے ہوگئی، یا وہ صرف ایک تماشائی کے طور پر جاننا چاہتا تھا؟ لیکن میں اس کا گائیڈ نہیں بنوں گا۔

''لیکن ڈائری...'' بے اختیار ہی میرے منھ سے نکل پڑا۔

''بابو جی کے کاغذوں کو ایک دن ایسے ہی دیکھ رہا تھا کہ ان کی ڈائری میرے ہاتھ لگ گئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ مجھے نہیں پڑھنا چاہیے، نہ جانے کچھ ایسی باتیں لکھی ہوں جو وہ مجھے بتلانا نہ چاہتے ہوں۔ لیکن میرا دل نہیں مانا۔ آپ کا بھی کئی بار ذکر کیا ہے۔ وہ ایک بار رانی کھیت آنا چاہتے تھے، لیکن اس سے پہلے ہی... میرے رانی کھیت آنے کی ایک یہ بھی وجہ ہے۔''

ہوا کا ایک جھونکا بہت تیزی سے ہمیں جھنجھوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ بادلوں کا ایک نیا جھنڈ آسمان پر منڈلانے لگا تھا، جس سے گرجے کی چھت اور کراس بادلوں کے پیچھے چھپ گئے۔ ہم نے چال تیز کر دی۔

وہ سب کتابیں کھڑکی کے پاس بنے بریکٹ پر اسی طرح رکھی ہوئی تھیں جیسی پہلے دن بکس میں سے نکال کر پڑھنے کے ارادے سے میں نے بڑے چاؤ سے سجائی تھیں۔ کوئی کتاب پڑھنے کے لیے بیٹھتا تو کچھ سطریں یا صفحے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے کچھ بھی سمجھ نہ آ رہا ہو۔ کتاب بند کر کے آنکھیں موندے پڑا رہتا۔ اس کے بدلے لمبی لمبی سیر کرنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ کبھی پگڈنڈی سے دولی کھیت اور کالا کا، کبھی چلیا نولا، کبھی دیوی سے نیچے موٹر کی سڑک پر... نئے راستوں کی کھوج میں لطف آتا تھا۔ چنّو کے آنے کے بعد تو معمول بہت بدل گیا۔ جب کبھی اس بارے میں سوچتا تو غصہ بھی آتا، لیکن مخالفت کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ صبح باغ کے دوسرے سرے پر کرسی پر بیٹھا چائے کا انتظار کر رہا تھا، تبھی چنّو کو اٹیک کی سیڑھیاں اترتے دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ نو بجے سے پہلے وہ کبھی اٹھتا نہیں تھا، نوکر کو آواز دے کر چائے اٹیک میں ہی منگوا لیتا تھا۔ خاص سردی نہیں تھی لیکن اس نے پوری آستینوں کا پل اوور اور مفلر پہن رکھا تھا۔ مجھے بیٹھے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا رہا، پھر برآمدے میں سے بینت کی کرسی نکال کر میرے پاس ہی چلا آیا۔

''چائے آ رہی ہے،'' میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں لال تھیں۔ رات کو وہ جاگتا رہا — سبب میں نے نہیں پوچھا۔ میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر اپنی صبح خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''آج صبح ترشول اور نندا دیوی بہت صاف دکھائی دے رہے تھے! شاید رات کو برف گری تھی...'' میں نے جوش بھری آواز میں بتلایا، لیکن اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ چائے آ گئی اور ایک پیالہ بنا کر اس کی طرف کھسکا دیا۔ اگر میں اسے یاد نہ دلاتا تو شاید وہ کبھی پیالے کو ہاتھ ہی نہ لگاتا۔

ایک گھونٹ پی کر وہ بولا، ''کل رات بھر روزی میرے دروازے کے باہر پائیدان پر بیٹھی رہی۔ میں نے اسے کئی بار اندر بلایا لیکن وہ آئی نہیں۔ اس کے منھ سے کچھ عجیب سی آوازیں نکلتی رہیں جو پہلے

Scanned with CamScanner

کبھی نہیں سنی تھیں۔ مجھے تو ڈر سا لگنے لگا۔"

روزی کا نام سنتے ہی میں ہنسنے لگا، لیکن چنٹو کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کو دیکھ کر چپ ہی رہا۔ مجھے وہ واضح سی پرچھائیاں دکھائی دیں جنھیں وہ سدا چھپائے رہتا تھا۔ وہ ذرا گھبرایا سا جان پڑا۔

"کبھی کبھی روزی اچانک جس طرح ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتی ہے تو دل کانپ سا اٹھتا ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن کہہ نہیں سکتی۔" چنٹو نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ "چوکیدار بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔"

اس صبح آسمان کا ایک حصہ گہرے نیلے رنگ میں ڈوب گیا تھا، جیسا کہ پرانی امریکن فلموں میں اکثر دکھائی دیتا ہے۔ ہوا بھی دوسرے دنوں کی نسبت زیادہ ٹھنڈی تھی۔ چنٹو کے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ نوکر سے کچھ سینڈوچ بنوا کر پورے دن کے لیے کالکا چلا جاؤں اور گولف گراؤنڈ کے ایک کونے میں چیڑ کے نیچے کچھ وقت کاٹوں۔ مندر کے پاس فارسٹ ریسٹ ہاؤس کے باغ سے بھی چاروں طرف کا منظر بہت سندر دکھائی دیتا ہے۔ وہاں چائے بھی پی سکتا ہوں۔ میرا دل اشتیاق سے بھرا ہوا تھا، لیکن چنٹو کے آنے کے بعد میں اس پروگرام کو بالکل ہی بھول گیا۔

"دیکھیے، میری طبیعت ان دنوں کچھ ٹھیک سی نہیں رہتی،" اپنی آواز کو قدرتی بناتے ہوئے چنٹو کہنے لگا، "آپ کسی ڈاکٹر کو..."

میں نے فوراً کوئی تشویش ظاہر نہیں کی کیونکہ اب تک میں چنٹو کی اس طرح کی بے تکی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ کوئی بات کہہ کر اگلے لمحے وہ اسے بھول بھی جاتا تھا۔

"یہاں تو کوئی اچھا ڈاکٹر شاید ہے نہیں۔ ہاں، ملٹری اسپتال میں چیک کروا سکتے ہیں،" میں نے ٹالنے کے خیال سے کہا۔

"تو آپ جلدی ہی اپائنٹمنٹ لے لیجیے۔ ویسے فکر کی تو کوئی بات نہیں ہے، لیکن بے کار میں تکلیف کیوں سہی جائے..."

میں چپ چاپ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے اس کی اور روزی کی نظر میں بہت کچھ مشابہت دکھلائی دی — انتظار کے ساتھ سمجھوتا...

Scanned with CamScanner

پھر مجھے چنتو پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ میں تو چیڑ کے پیڑ کے نیچے آرام کرسی پر ادھ لیٹے آسمان کی طرف تاکتے ہوئے اس سناٹے میں اس سارے بے معنی پن کے بوجھ سے آزاد ہو جانا چاہتا تھا جو زندگی کے اتنے لمبے سفر میں بٹورا تھا، تا کہ سفر کا آخری حصہ بغیر کسی تھکان کے پورا کر سکوں۔ کبھی تو خواہش ہوتی کہ چنتو سے صاف صاف چلے جانے کے لیے کہہ دوں، لیکن دل ہی دل میں اس کی موجودگی میرے چبھنے والے اکیلے پن کو بھی دور کرتی جان پڑتی تھی، جسے قبول کرنے میں اپنی اس کمزوری کو بھی قبول کرنا پڑتا۔ رانی کھیت میں اس طرح کی کسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

پانچ چھ سال پہلے اور اب کے چنتو میں کتنا فرق ہو گیا تھا، اس کے راز کو سمجھ پانا بھی مجھے ناممکن ہی جان پڑتا۔ یہ کیسے ہوا؟ خاندان کے کچھ لوگ اچانک ملنے پر جب اس موضوع پر بات کرتے تو کسی کے پاس بھی اس کا صحیح صحیح جواب نہ ملتا۔ روپے پیسے کی فکر اسے نہیں تھی، بڑے بھیا سب اسی کے لیے چھوڑ گئے تھے، لیکن چنتو کے بارے میں وہ کچھ سپنے بھی دیکھتے تھے، جن کے پورا ہونے کی امید تو انھوں نے اپنی زندگی میں ہی چھوڑ دی تھی، مگر ان کے بجائے اور کیا دیکھتے، یہ دیکھنے کے لیے وہ بچے نہیں رہے۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا۔ نہ چنتو نے ان میں سے کسی بھی بات میں ہماری رائے لی، نہ کسی نے اس کی زندگی میں کوئی دخل دیا۔

''کیا آج ہی آپ ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے سکتے ہیں؟'' وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے تو میں اس کی بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکا۔ کون ڈاکٹر...؟ کس کا اپائنٹمنٹ...؟ اسے شاید میری حالت کا تھوڑا سا اندازہ ہوا۔ وہ ناراض ہو کر بولا، ''ابھی آپ سے کہا تھا نا، ملٹری اسپتال کے لیے...''

''ہاں ہاں...'' میں گھبرا کر بولا، ''آج ہی دوپہر میں وہاں جاؤں گا، پتا کروں گا۔'' سامنے لگے ایک چھوٹے سے دیودار کی شاخ پر لال اور ہرے رنگ کی ایک چڑیا دکھائی دی جسے میں دھیان سے دیکھنے لگا۔ مجھے جان پڑا جیسے یہی چڑیا میں نے سالم علی کی کتاب میں دیکھی ہے۔ ''وہ دیکھو چنتو،'' میں نے دھیمی آواز میں دیودار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''کتنی سندر چڑیا ہے، اس چھوٹی سی ڈال پر بیٹھی ہے۔ دکھی؟''

Scanned with CamScanner

نہ وہ چنٹو کو دکھائی دی، نہ ہی اس نے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی بے پروائی سے مجھے دکھ ہوا۔ نندا دیوی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اتھوں میں سے دکھائی دیا، لیکن میں نے چنٹو سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ بادلوں کی اس صبح وہ اپنے آپ میں ہی بالکل کھویا ہوا جان پڑ رہا تھا۔ اپنے دل کی بات کبھی کسی سے اس نے نہیں کہی۔

ڈاکٹر نیگی اس مکان کو بیچنے کی سوچ رہے ہیں— یہ انھوں نے مجھ سے بھی کہا تھا۔ اکیلے یہاں نہیں رہنا چاہتے۔ پھر نہ جانے کون لوگ یہاں رہنے لگیں گے۔ اچانک چنٹو کو دیکھ کر ایک خیال میرے دل میں آیا۔ ''سنو چنٹو، تم کیوں نہیں اس مکان کو خرید لیتے؟ پھر جب جی چاہا، یہاں آ گئے۔ جب تک من لگا رہا، رہے۔ سستے میں ہی بیچ دیں گے ڈاکٹر نیگی،'' میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

اس کے چہرے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ نہ وہ کچھ بولا، نہ ہی میری طرف دیکھا۔ اپنے اس اشتیاق میں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔ میں لال ٹین کی چھت اور کھڑکیوں کے شیشوں اور برآمدے کی طرف دیکھے جا رہا تھا، جیسے اگلے ہی لمحے یہ مکان مجھے ملنے والا ہو۔ بند کمرے، کھڑکیوں کے پیچھے پردے، برسوں پہلے کا انگریزوں کے وقت میں بنا فرنیچر — سب جیسے ایک بار پھر جی اٹھنے کو بے چین ہوا ٹھے ہوں۔ پیچھے اوبڑ کھابڑ زمین پر صرف جھاڑیاں اور بڑی بڑی گھاس ہی اگ رہی تھی، جن کی صفائی کروا کر سیبوں کے بیس تیس پیڑ آسانی سے بوئے جا سکتے تھے۔ سیبوں کا یہ آرچرڈ بہت خوبصورت دکھائی دے گا۔

شام ہونے کے کچھ ہی دیر پہلے ملٹری اسپتال کی ایمبولینس برآمدے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سفید چمکتا ہوا رنگ اور لال کراس دیکھ کر میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ میرے منع کرنے پر بھی چنٹو نے ایمبولینس منگوائی تھی۔ اگرچہ وہ دھیرے دھیرے پیدل اسپتال تک جا سکتا تھا، لیکن وہ اسے ناٹک کا ایک منظر بنا رہا تھا۔ اسے دھیرے دھیرے ایٹک کی سیڑھیاں اترتے دیکھ کر مجھے لگا جیسے وہ ایک چھوٹے سے سفر پر جانے والا مسافر ہو۔ اس کے سر پر ہیٹ، کندھے پر تھیلا اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی اٹیچی تھی۔ کارڈرائے کی پینٹ اور چمڑے کا کوٹ پہنے تھا۔ لگا جیسے بیماری کا اس نے بہانہ ہی بنایا ہو۔ سیڑھیوں کے پاس ہی برآمدے میں روزی بیٹھی ایمبولینس کی طرف اداس نظر سے تک رہی تھی۔ چنٹو نے روزی کا

Scanned with CamScanner

سر تھپتھپایا، میری طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

ایمبولینس کے اندر ہم دونوں ایک بنچ پر بیٹھے چپ چاپ سامنے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکتے رہے۔ بیچ میں خالی اسٹریچر رکھا ہوا تھا، جسے پہلی بار دیکھنے پر میں چونک اٹھا تھا، جیسے وہ ہم دونوں کو دعوت دے رہا ہو۔ شام کے وقت دھوپ کا رنگ بہت پیلا پڑ گیا تھا۔ ایک موڑ پر اوپر چوبٹیا کا گرجا دکھائی دیا اور فوراً اوجھل ہو گیا۔ پچھم میں وہ اونچی پہاڑی چمک رہی تھی جس کے پیچھے نینی تال بسا ہوا تھا۔ کئی بار سوچا تھا کہ ایک دن صبح کی پہلی بس سے نینی تال جا کر شام کو لوٹ آؤں گا، لیکن کاہلی کے باعث ابھی تک اسے پورا نہیں کر سکا۔

اسپتال میں داخل ہونے کی رسمی کارروائی پوری ہوتے ہوتے شام لگ بھگ آدھی گزر گئی، اور جو بھاگ دوڑ مجھے کرنی پڑی سو الگ۔ سڑکوں پر لگی بتیاں جل اٹھیں۔ آخر میں پرائیویٹ وارڈ کے کمرے میں جب چنتو اپنی چارپائی پر کمبل ڈھک کر لیٹ گیا، تو اچانک تھکان سے میرے پیر بوجھل ہو اٹھے اور میں آرام کرسی پر گر ہی پڑا۔ کمرے میں دوسری چارپائی ہوتی تو میں ضرور اس پر لیٹ جاتا۔ کھڑکی میں سے پیڑوں کی گھنی شاخیں دکھائی دے رہی تھیں، جہاں اکا دکا جھینگروں کی دھیمی سی آواز سنائی پڑ رہی تھی۔ اچانک چنتو پر نظر گئی تو اسے اپنی ہی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔

''اسپتال کا یہ پرائیویٹ وارڈ ڈاک بنگلے سے بہت ملتا جلتا ہے،'' وہ شوق بھری آواز میں بولا، ''یہاں کچھ دن رہنا اچھا ہی لگے گا۔''

مجھے یہ سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ اینگ میں اس کے نہ ہونے کا احساس مجھے اپنے اکیلے پن کی یاد دلاتا رہے گا، جس کی وجہ سے میں کچھ اور نہ کر سکوں گا۔ گھر جانے کی بھی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔

''اور سنیے، کسی کو میرے اسپتال میں آنے کی اطلاع نہ دیجیے گا۔ بے کار میں ہی پریشانی ہوگی...''

''کس کو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ بھی میری بات سن کر چونک گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بہت دھیمی آواز میں بولا، ''آپ نے ٹھیک ہی پوچھا۔ آدمی غلط فہمی کا شکار بہت آسانی سے بن جاتا ہے۔''

وارڈ کے دوسرے کمرے شاید خالی ہی پڑے تھے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، نہ ہی کسی کمرے میں روشنی تھی۔ جب کچھ دیر تک اسپتال کا کوئی ڈاکٹر، نرس یا اٹینڈنٹ کمرے میں نہیں آیا تو دل میں شک اٹھا کہ کہیں وہ ہمارے بارے میں بھول تو نہیں گئے۔ میں پوچھ تاچھ کرنے کے خیال سے باہر آ گیا۔ وارڈ کے دوسرے سرے تک پہنچ کر بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ دور دولی کھیت میں کچھ روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ تھوڑی اترائی کے بعد لمبے چوڑے ہموار میدان سے سٹا ہوا جنرل وارڈ تھا، جہاں اسپتال کی نیلی دھاریوں کے قمیض پاجامے پہنے مریض ٹہلتے ہوئے دکھائی دیے۔ کچھ سڑک کے اوپر بنی منڈیر پر بیٹھے نیچے آنے جانے والوں کو دیکھ کر اپنا جی بہلا رہے تھے۔ منڈیر کے پاس جا کر سڑک کے پار رانی کھیت کلب کا بورڈ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کئی بار اس سڑک سے گزرتے ہوئے مجھے یہ نہیں پتا چلا کہ وہ منڈیر جنرل وارڈ کی سرحد ہے، جسے مریض لانگھ نہیں سکتے۔ مریض کلب میں آتے جاتے لوگوں کو تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ واپس لوٹ کر مریضوں اور کلب کی بات چنتو کو بتاؤں گا۔ کچھ دن پہلے ہی رسالے دیکھنے کے لیے جب میں دن کے وقت کلب پہنچا تو بار کے ایک کونے میں چنتو کو بیئر کی بوتل کے سامنے بیٹھے دیکھ کر مجھے کچھ اندیشہ سا ہوا۔ میں دبے پاؤں واپس لوٹ آیا۔ اس بات کا ذکر میں نے چنتو سے نہیں کیا۔ کمرے میں لوٹا تو رات کا کھانا بیرا لے آیا تھا اور چنتو کھانے کی تیاری ہی کر رہا تھا۔

''بہت جلدی کھانا آ گیا۔ ابھی تو پوری طرح سے اندھیرا ابھی نہیں ہوا،'' میں نے کہا۔

''مجھے تو بھوک لگنے ہی لگی تھی۔'' وہ ٹرے کو گھٹنوں پر رکھ کر کھانے لگا۔ کھانے کی مہک سے بھوک مجھے بھی لگنے لگی تھی۔ میں آرام کرسی پر پھر بیٹھ گیا۔

''آپ اب گھر جایئے۔ تھک گئے ہوں گے...'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔'' میری آواز میں نہ چاہنے پر بھی ایک بیگانگی سمٹ آئی تھی۔

''کل ہی سب ٹیسٹ کریں گے۔ سسٹر کہہ رہی تھیں۔'' چنتو کی آواز میں اشتیاق بھرا تھا۔

•

اس رات بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آ سکی۔ کمرے کے اندر گھٹن سی محسوس ہوئی تو باہر باغ میں ٹہلنے کے لیے آ گیا۔ اندھیری رات ہونے کے سبب ڈھیر سے تارے بہت صاف اور قریب چمکتے ہوئے جان پڑے۔ ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے محسوس کیا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب جو

Scanned with CamScanner

بات لگی، وہ تھا روزی کا میرے آگے پیچھے گھومنا، کبھی برآمدے میں بیٹھے میری طرف پلک جھپکائے بغیر تکتے رہنا، کبھی اٹیک کے بند دروازے تک جا کر کچھ دیر تک سونگھنے کے بعد پھر نیچے واپس لوٹ آنا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ چنتو کے ساتھ اس کا اتنا گہرا لگاؤ ہو گیا تھا۔

اچانک بڑے بھیا کی ڈائری کی بات یاد آئی، جسے چنتو نے مجھ سے پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ اٹیک میں جا کر اس کی میز سے ڈائری لا کر اکیلے اس رات اسے پڑھنے کے خیال سے ہی میں خوفزدہ ہو گیا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ کچھ ایسی باتیں جاننے کو ملیں گی جنھیں میں جاننا نہیں چاہتا تھا، جان کر کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈائری پڑھنے کا خیال میں نے چھوڑ دیا۔ دل میں اس بات کا ڈر موجود تھا کہ کہیں اگلے دن اسپتال جا کر یہ اطلاع نہ ملے کہ چنتو کو کوئی سنگین بیماری ہے۔ لیکن اس اندیشے کو بار بار سوچ کر میں اپنے سے دور کر دیتا تھا کہ پچھلے بیس دن تک چنتو کے ساتھ رہنے کے بعد کہیں اس کی کوئی چھوٹی سی بھی نشانی مجھے دکھائی نہیں دی تھی۔ اسپتال جانا صرف ایک بہانہ تھا، تا کہ رانی کھیت کے روز کے معمول کی اکتاہٹ کو دور کیا جا سکے۔

لیکن اگلے دن صبح جو ہوا، وہ انتہائی حیران کن تھا، جس کا ہم میں سے کسی نے بھی تصور تک نہ کیا تھا۔ روزی اچانک غائب ہو گئی۔ پہلے تو کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا، لیکن صبح کے ختم ہوتے ہوتے یہ خبر آس پاس کے بنگلے اور مال روڈ کی دکانوں تک جا پہنچی۔ کب وہ کہاں چلی گئی، کسی کو پتا نہیں چلا۔ کیا پینتھر اسے کھا گیا؟ لیکن اس کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے اس بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ پھر چوکیدار بھی فکر مند تھا، کیونکہ ڈاکٹر نیگی کو اس کی صفائی دینی ہوگی اور اس کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کے جو روپے اسے ملتے تھے وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ مجھے بھی یہ خبر چنتو کو دینی ہوگی، جس سے وہ دکھی ہوگا۔

❋❋

رام کمار

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

سیلر

اس دن شیشے میں منھ دیکھتے وقت خود بخود ہی جب اس کی نظر اپنی آنکھوں پر پڑی تو لگا جیسے کہیں کچھ کھو سا گیا ہو۔ کب کھویا، یہ پتا اسے نہیں چل سکا، کیونکہ پچھلی بار شیشے میں کب اس نے اپنی آنکھیں دیکھی تھیں، کوشش کرنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا۔ کچھ دیر تک اسی طرح ایک ہاتھ میں شیشہ لیے وہ غیر یقینی، لاتعلق انداز سے دیکھتا رہا۔ کھلی کھلی خالی سی آنکھیں، جیسے دو دروازے اپنے آپ کھل گئے ہوں جن کے بیچ سے دور دور تک پھیلا اجاڑ دکھائی دیتا ہے۔

اور اس دن، اتوار کی اس صبح، کمپنی باغ میں اگر کوئی اسے دیکھتا تو اس کی آنکھیں اس پر ایک ایسی انمٹ چھاپ چھوڑ جاتیں جو کسی دکھائی نہ دینے والی پرچھائیں کی طرح اس سے چمٹی رہتی۔

لیکن اس دن کمپنی باغ میں لوگ نہیں تھے۔ اکیلے اس نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ دو گھاس کے قطعوں کے بیچ بنی پگڈنڈی پر لال بجری اس کے پیروں کے نیچے دب کر چر چر کرتی رہی۔ سورج کی ترچھی کرنیں یوکلپٹس کے لمبے پیڑوں کے اوپری حصوں پر چمک رہی تھیں۔ اور پھل تھے، لال، ہرے، پیلے۔ دو چار کے سوا دوسرے پھولوں کے نام اسے معلوم نہیں تھے۔ نہ کبھی اس کی ضرورت اس نے محسوس کی۔ اس صبح ہوا ٹھنڈی تھی۔

اسے یاد آیا کہ صبح سویرے شیشے میں اس نے دیکھا تھا کہ آنکھوں میں سے کچھ گر گیا ہے، یا انھی میں کچھ کھو گیا ہو۔ لیکن اس نے فکر نہیں کی۔

Scanned with CamScanner

پھر صبح کی تازی ہوا میں وہ سب بھول گیا۔ اس کے بال ہوا میں اڑنے لگے، رسّی کے کھلے سرے کی طرح۔ کالے بالوں میں جب پہلی بار اس نے کچھ سفید بال دیکھے تھے، تب بھی ایک ہاتھ میں شیشہ پکڑے وہ گہری لاتعلقی کے گھیرے میں سمٹ گیا تھا۔ اب ان کا عادی ہو گیا ہے۔ آنکھوں کا بھی عادی ہو جائے گا۔

لگ بھگ ایک ہی مہینہ تو ہوا، ٹھیک سے اسے یاد نہیں آیا، جب سسر نے اپنے کمرے میں بلا کر چھوٹی سی تمہید کے بعد کہا تھا کہ اپنے اور اپنے بیٹے کے خرچ کے جو سو روپے وہ ہر مہینے دیتا ہے، وہ اس بڑھتی ہوئی مہنگائی میں کافی نہیں ہیں۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے انھوں نے آٹے، دال، گھی، چاول کے دام بتائے تھے۔ پھر بجلی، پانی، مہری اور اس کا کمرہ...اور اس کی جھکی ہوئی آنکھیں دیکھ کر دبی آواز میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کا بیٹا بڑا ہوتا جا رہا ہے، جس سے اس کی خوراک بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اسے چپ دیکھ کر وہ اپنائیت بھری آواز میں کہنے لگے، ''میں اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ تمھارے سالے بھی اب بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی اولاد بڑھ رہی ہے اور اپنی کمائی میں سے وہ دوسرے کو کھلانا نہیں چاہتے۔ اور آج کل تو اپنے خون کے رشتوں تک کو کوئی نہیں پوچھتا۔ پھر بیٹا...'' انھوں نے ایک لمحے رک کر کہا تھا، ''الگ مکان لے کر رہتے تو کیا سو روپوں میں گزارا ہوتا؟ پھر یہاں سب طرح کے آرام ہیں، اپنے گھر کی طرح تو سب کچھ ہے۔ تمھاری ساس تمھارے بیٹے سے جتنا پریم کرتی ہے، اتنا اسے کسی پوتے سے بھی نہیں ہے اور یہ بات بہوؤں کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ تم سے چھپا تو نہیں ہے۔''

اور وہ بے تعلق انداز سے سب کچھ سنتا رہا جیسے وہ سب کسی دوسرے شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہو۔ پھر اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا تھا۔

متو نہ ہوتا تو وہ کہیں ایک کمرہ کرائے پر لے کر اپنا الگ ٹھکانہ کر لیتا۔ متو کو لے کر اکیلے کیسے رہے گا؟ الگ نہ رہنے کا اس کے پاس یہ سب سے بڑا جواز تھا۔ پھر الگ رہ کر دوسری فکریں اسے گھیر لیں گی — کھانے کی، گھر گرہستی کی دیکھ بھال۔ سسر کی بات پر اسے یقین نہیں تھا۔ وہ سب مل کر اسے لوٹنا چاہتے ہیں، اسے سیدھا سادہ سمجھ کر اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ نہیں، وہ سو روپے سے زیادہ نہیں دے گا۔

اچانک اپنے سامنے بنچ پر ایک لڑکے کو بیٹھے پڑھتے دیکھ کر چونک سا گیا۔ اسے لگا جیسے وہ چوری

Scanned with CamScanner

کرتا ہوا پکڑلیا گیا ہو۔اگر اس لڑکے کو دور سے ہی دیکھ لیتا تو چپ چاپ پیچھے مڑ جاتا یا دائیں بائیں نکل جاتا۔وہ لڑکے کو کچھ لمحے تک جھکے پڑھتے دیکھتا رہا اور دھیرے دھیرے اس کے پاس بنچ پر بیٹھنے کی اس کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ وہ دبے پاؤں بنچ کے دوسرے کونے پر جا بیٹھا۔لڑکے نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا، جیسے اس طرح کا آدمی وہ پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ پھر اپنی کتاب پر جھک گیا۔لڑکے کو اپنی طرف دیکھتے وقت مسکرایا، لیکن کوئی جواب نہ پاکر وہ سیدھا کچھ دور پر بکھرے تاریخی کھنڈروں کو دیکھنے لگا۔

اس کی بیوی زندہ ہوتی تو دوسری بات تھی۔اب اس کا وہاں رہنا سب کو اکھرنے لگا ہے۔اس کے سسر کا پچکا ہوا، بغیر دانتوں کا چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔اسے تھوڑی گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ وہ پھر تقاضا کریں گے اور اسے یاد دلائیں گے۔اس کے بڑے سالے کی بیوی اکثر کرخت آواز میں کہتی سنائی دیتی کہ اس سے اتنی روٹیاں نہیں سینکی جاتیں۔اور جب اس کی ساس اس سے دھیمی آواز میں کہتی کہ نیچے جمائی سن رہا ہے، تو اس کی آواز اور بھی تیز ہو جاتی، ''مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے! سچی بات کہنے سے جھجکوں، ایسی عورت میں نہیں ہوں۔'' اور وہ نیچے اپنی کوٹھری میں بیٹھا سب سنتا تھا۔کوٹھری کے باہر دالان کے اوپر لگے جال میں سے اوپر کی سب باتیں سنائی دیتی تھیں۔

''معاف کیجیے،'' پاس بیٹھے شاگرد نے پوچھا، ''آپ کو معلوم ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن پڑنے کے کیا سبب ہوتے ہیں؟''

وہ چونک سا گیا۔ کچھ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ شاگرد کی طرف دیکھتا رہا، جس کی آنکھوں میں ہنسی چھپی ہوئی تھی۔ سورج گرہن، چاند گرہن...اس کے دماغ میں دو خلا بڑی تیزی سے گھڑ دوڑ لگانے لگے، جیسے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہوں۔

''آپ نے جغرافیہ تو پڑھا ہی ہوگا؟'' شاگرد نے پوچھا۔ پھر لمحہ بھر تک اس کے چہرے کو دیکھنے کے بعد کہنے لگا، ''اچھا، یہ بتائیے کہ وہ کون سا دیس ہے جہاں چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن رہتا ہے؟'' پھر اسے اپنی طرف تکتے دیکھ کر شاگرد کے ہونٹوں پر ایک ہنسی سی پھیل گئی۔ شاگرد کو اب یقین ہو گیا کہ وہ میٹرک پاس بھی نہیں ہے۔

وہ اس طرح چپ بیٹھا رہا جیسے انٹرویو کے وقت کسی سوال کا جواب نہ دے سکنے پر نوکری کا

امیدوار سوال پوچھنے والے کی طرف دیکھتا ہے۔ ایسا ہی اس نے سوچا۔ شاگرد کے چہرے پر ایک بے فکر سی ہنسی تھی۔ آنکھوں میں اندھیری رات کے تارے جیسی جھلمل کرتی ہوئی چمک تھی — اور صبح شیشے میں جب اس نے اپنی آنکھیں دیکھی تھیں...

''میں میٹرک کا امتحان دے رہا ہوں،'' وہ ہاتھ میں دبی کتاب بند کر کے بولا۔ ''میں سیلر بن جاؤں گا امتحان کے بعد، تاکہ دنیا بھر کی سیر کر سکوں۔ مجھے گھومنے کا بہت شوق ہے اور سیلر بن کر میں بغیر پیسے کے ساری دنیا کا چکر لگا سکتا ہوں۔ اچھا، کیا آپ کبھی جہاز میں بیٹھے ہیں؟'' شاگرد اشتیاق بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔ پہلی بار اسے ایسا شخص ملا تھا جو اپنا منھ کھولے بغیر دلچسپی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ شاگرد کو دیکھتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے منو کا چہرہ ہی گھومتا رہا۔ اسے بھی منو کو کسی اسکول میں داخل کرا دینا چاہیے۔ گھر میں رہتا ہے تو اسے خالی دیکھ کر سب چھوٹے موٹے کام کراتے رہتے ہیں — کبھی حلوائی کی دکان سے دہی لانا، کبھی اس کے سسر کا حقہ بھرنا، چھوٹے سالے کی روتی لڑکی کو گود میں لے کر چپ کرانا... وہ اپنی کوٹھری میں بیٹھا منو کو دیے ہوئے احکام سنتا رہتا ہے، مخالفت میں کبھی کچھ نہیں کہہ پاتا۔

منو اس سے ڈرتا ہے۔ اس کی کوٹھری میں کبھی پاؤں رکھا ہو، اسے یاد نہیں۔ جب اوپر کا کوئی پیغام دینے اسے کوٹھری میں آنا ہی پڑتا تو دہلیز پر ہی کھڑے کھڑے جلدی سے کہہ دیتا، ''بڑی مامی کہتی ہیں کہ آٹا پسوا لائیے،'' یا، ''اچار کے لیے دس سیر کچے آم منڈی سے لے آیئے...'' اور پھر وہ اوپر بھاگ جاتا۔

اسے اندر بلانے کی خواہش کئی بار اس کے دل میں آتی ہے لیکن بات کبھی ہونٹوں کے باہر نہیں نکلتی۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے اندر چھپایا کہرا اپنے آپ پھٹتا جا رہا ہو۔ کسی بچے سے جھگڑا ہو جانے پر مار بھی اسے ہی پڑتی ہے اور وہ اس کے رونے کی آواز سنا کرتا ہے، لیکن شکایت کرنے کبھی منو اس کے پاس نہیں آتا۔ ایک بار سبزی خرید کر جب وہ تھیلا اوپر دینے گیا تو دوسرے بچوں میں منو کو نہ دیکھ کر اسے کچھ فکر سی ہوئی، لیکن کسی سے اس کے بارے میں پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ یہ سوچ کر کہ وہ شاید چھت پر کھیل رہا ہو، وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اندھیرے میں اسے ایک کونے سے منو کے سسکنے کی آواز

سنائی دی۔ اسے دیکھ کر منو کا رونا فوراً بند ہو گیا اور اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

''کیا ہوا منو؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا، ''کیا کسی نے پیٹا ہے؟'' اس سے زیادہ نہیں کہا گیا۔ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ جھجکتے ہوئے اس نے منو کے سر پر بہت پیار سے ہاتھ پھیرا، لیکن وہ اور سکڑ گیا، جیسے اسے اس کی ہمدردی کی ضرورت نہ ہو۔ منو کے بڑے بڑے روکھے الجھے بال اس کی انگلیوں میں پھنس گئے۔ اسے لگا جیسے منو کے بال کٹے دو تین مہینے گزر چکے ہوں۔ اس کی قمیض کندھوں پر پھٹی ہوئی تھی، نیکر پر میل اور دھول کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ ٹانگوں کا کھردرا ماس اسے سوکھا چمڑا جان پڑا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک رات کے اندھیرے میں اسی طرح بیٹھے رہے اور کچھ دھندلی دھندلی پرچھائیاں اس کے چاروں طرف گھومتی رہیں۔ لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی بار اپنے بیٹے کا لمس محسوس کر رہا ہو، جیسے ابھی اس کا جنم ہوا ہو...

''افریقہ کے جنگلوں میں بہت بھیانک شیر اور گینڈے لڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ایسا میں نے اپنی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ اچھا، آپ نے کبھی سمندر دیکھا ہے؟ میں نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن جب سیلر بن جاؤں گا، تو سمندر میں ہی رات دن رہنا پڑے گا۔ اسی لیے مجھے رنج نہیں ہوتا کہ کبھی سمندر نہیں دیکھا...''

شاگرد کو بنچ کے دوسرے سرے پر بیٹھے دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ صبح کی ہلکی ہلکی دھوپ ان تک پہنچ گئی۔ پیڑوں کی لمبی قطار کے نیچے سے پھول دکھائی دے رہے تھے — لال، پیلے... لیکن پھولوں کے نام اسے معلوم نہیں۔ انھیں آنکھ بھر دیکھ لینا ہی کافی تھا۔

''پڑھائی میں میرا جی نہیں لگتا۔ اور پڑھ کر ہوگا بھی کیا؟ میرے بڑے بھائی نے بی اے پاس کیا، لیکن کہیں نوکری نہیں ملی، سو روپے تک کی نوکری نہیں ملی، اور آخر میں وہ گھر سے بھاگ گئے،'' شاگرد کہہ رہا تھا۔ ''اور پتاجی کو میرا سیلر بننا پسند نہیں ہے۔ اگر انھوں نے مخالفت کی تو میں بھی گھر سے بھاگ جاؤں گا۔ اپنی کتابیں بیچ کر مجھے بمبئی کے ٹکٹ کے پیسے مل سکتے ہیں۔ میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے بک سیلر سے بات بھی کر رکھی ہے اور وہ مان گیا ہے۔ اچھا، آپ تو بمبئی گئے ہوں گے؟ وہاں تو سیکڑوں جہاز بندرگاہ پر آتے جاتے رہتے ہیں، کیا مجھے کسی میں بھی کام نہیں ملے گا؟ ملے گا کیوں نہیں!''

Scanned with CamScanner

شاگرد کی آنکھوں میں سمندر کی گہرائی ابھر آئی تھی۔ کبھی اس کی آنکھیں بھی اتنی گہری رہی ہوں گی؟ اسے لگ رہا تھا جیسے اس شاگرد کے ساتھ وہ بھی جہاز میں بیٹھ کر سفر کر رہا ہو، چاروں طرف نیچے سمندر کی اونچی اونچی لہریں ہیں جن کے بیچ میں جہاز آگے بڑھا جا رہا ہے...

اس کی بیوی بھی کہتی تھی کہ منو کو خوب پڑھائیں گے۔ اپنا خرچ کم کر کے اسے کسی طرح کی تنگی نہیں ہونے دیں گے۔ پھر امید بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتی ہوئی کہتی، ''اور تمھاری بھی تو ترقی ہوتی جائے گی۔ زندگی بھر تک کوئی سو ہی تو نہیں ملتے رہیں گے۔'' اور وہ ہنستے ہوے اس کا ساتھ دیتا تھا... وہ آج ہوتی تو دیکھتی کہ اس کے خواب کس طرح پورے ہو رہے ہیں۔ اتوار کی چھٹی میں گھر پر آرام نہ کر کے وہ باغ کی سیر کر رہا ہے، ایک بنچ پر بیٹھا ایک شاگرد سے باتیں کر رہا ہے۔

اس کی ساس کو حقیقت میں منو سے پیار ہے۔ کبھی کبھی اپنی چھوٹی سی جمع پونجی میں سے وہ اس کے لیے کوئی کپڑا بنوا دیتی، کبھی میلے سے کوئی کھلونا خرید لاتی۔ لیکن یہ پیار ان کی بہوؤں کو اکھرتا تھا، جس کے ڈر سے وہ کبھی کھلے طور پر منو پر اپنا پریم ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ ایک دن منو کے معاملے پر ہی گھر میں جھگڑا ہو گیا اور دونوں بہوؤں نے ساس کو جلی کٹی سنائیں۔ ساس دن بھر روتی رہیں اور شام کو اس کے واپس لوٹنے پر اس کی کوٹھری میں آ کر کہنے لگیں، ''بیٹا، گھر کے حالات تم سے چھپے نہیں ہیں۔ وقت ایسا آ گیا ہے کہ سگے رشتے دار بھی پرائے بن گئے ہیں۔ پھر بہوئیں پرائے گھر سے آتی ہیں، جو اپنی سسرال کے پرانے رشتوں کو نبھا نہیں پاتیں۔ تم تو اب بھی گھر کے جمائی ہو...'' وہ دھوتی کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ شاید جمائی کے نام سے انھیں اپنی بیٹی کی یاد آ گئی تھی۔ ''ہمارے لیے ڈوب مرنے کا دن ہے کہ جمائی اپنے کھانے پینے کا خرچ خود دیتا ہے اور بہوؤں کو تمھاری دو روٹیاں سینکنی بھی اکھرتی ہیں!'' اور دبی آواز میں انھوں نے بھی یہ سجھا دیا کہ وہ اپنا الگ ٹھکانہ دیکھے، یہی بہتر ہوگا۔ منو کو، جب تک وہ اور بڑا نہیں ہو جاتا، تب تک سال دو سال کے لیے وہ اپنے پاس رکھے رہیں گی۔ ایک بار الگ ہو جائے گا تو گھر میں سب کو اس کے سو روپوں کی کمی اکھرے گی۔

اور اس رات کتنی ہی دیر تک اپنی چارپائی پر لیٹا وہ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ اپنی بیوی کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔ اس کی موت نہ ہوتی تو شاید اس مسئلے کا سامنا اسے نہ کرنا پڑتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلے دن ہی نئے مکان کی تلاش شروع کرے گا۔ یہاں بھی تو ایک کوٹھری ہی اس کے

Scanned with CamScanner

پاس ہے، جہاں دن میں بھی بتی جلائے بغیر کچھ دکھائی نہیں دیتا اور اگر رات کو کھانے کے بعد بھی اس کی بتی جلتی رہے تو سسرا اوپر جال پر کھڑے ہو کر سیدھے اس سے نہ کہہ کر عام اعلان کرتے ہیں کہ گھر کی سب بتیاں فوراً بجھا دی جائیں، نہیں تو جس کمرے کی بتی جلے گی اس کا تار وہ کاٹ دیں گے۔ کوٹھری کے پاس نالی بہتی ہے، جہاں اوپر سے بہت گندی بو پھیلتی ہے۔ اب اس بدبو کا وہ عادی ہو چکا ہے، لیکن پہلے پہل جب اپنی بیوی کی موت کے بعد اسے اوپر والا کمرہ خالی کر کے نیچے آنا پڑا تھا تو کوٹھری کی سیلن اور نالی کی بدبو اسے ناقابل برداشت سی لگتی تھی۔ ایسی کوٹھری دس پندرہ روپوں میں اسے کہیں بھی مل سکتی ہے... لیکن صبح ہوتے ہوتے اس کا فیصلہ ڈھیلا پڑ گیا اور کچھ دنوں بعد وہ اپنے ارادے کو بالکل بھول گیا۔ زندگی پھر معمول کے مطابق بہنے لگی۔

اپنے دوسرے بیاہ کا خیال اس کے دماغ میں نہ آیا ہو، ایسی بات نہیں۔ لیکن اپنے گھر میں کوئی ہے نہیں، اور سسرال والے اس کے دوسرے بیاہ کی بات کیوں سوچیں گے؟ لیکن ایک دن طبیعت بھاری ہونے کے سبب آدھی چھٹی لے کر جب وہ دن میں ہی لوٹ آیا تھا تو گھر میں کسی کو اس کے آنے کی خبر نہیں لگی تھی۔ تب اس نے سنا تھا، گھر کے کام سے فارغ ہو کر اس کے سالوں کی عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ بڑی کہہ رہی تھی کہ جمائی بابو کا کہیں پھر بیاہ ہو جائے تو وہ اپنی نئی سسرال جا کر بس جائیں گے اور انھیں چھٹی مل جائے گی۔ کوٹھری خالی ہو گی تو بچوں کو پڑھنے کا کمرہ مل جائے گا۔ دونوں زور زور سے ہنسنے لگی تھیں، لیکن چھوٹی نے کہا کہ کوٹھری خالی ہونے پر بچوں کو نہیں ملے گی، سسر کرائے پر اٹھا کر اپنی گانٹھ میں دبائیں گے.... سر میں درد ہونے پر بھی وہ کتنی ہی دیر تک اسی بارے میں سوچتا رہا تھا۔

یوں ہی سامنے بیٹھے شاگرد پر نظر پڑی تو وہ کتاب پر جھکا پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ شاگرد کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ ہونٹوں کے اوپر ہلکے ہلکے مونچھوں کے بال اگنے لگے تھے، چہرے پر کہیں کوئی ناگوار تاثر نہیں تھا۔ پوری زندگی سپاٹ میدان کی طرح اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، جس کے نئے نئے تجربے پانے کی امید اس کے دل میں ہلوریں لیتی ہوگی۔ رات کو سوتا ہوگا تو دنیا بھر کے سپنے دیکھتا ہوگا— شیر اور گینڈے کی لڑائی... وہ دیس جہاں چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن رہتا ہے... جنگل، پہاڑ، سمندر... لمحہ بھر کو اسے لگا جیسے منو ہی بڑا ہو کر اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ وہ بھی تو اسی طرح خواب دیکھتا ہوگا۔ اور اس کی بیوی بھی ایسے ہی خواب دیکھتی تھی۔... اسے نیند میں کبھی خواب دکھائی نہیں دیتے۔

Scanned with CamScanner

کوشش بھی کی تو ناکام رہا۔

وہ بنچ سے اٹھنے لگا تو اس نے شاگرد کی طرف اپنائیت بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے ان دونوں کی پرانی پہچان ہو۔ شاگرد نے اسے اپنے دل کی وہ باتیں بتلائی تھیں جو صرف قریبی دوستوں سے ہی کہی جاتی ہیں؛ وہ راز جنھیں صرف وہ دو ہی جانتے تھے۔ لیکن اس کی آواز سن کر شاگرد نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس کی فکر چھوڑ کر وہ اپنی کتاب پڑھنے میں مگن ہو گیا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں میں وہ خالی پن سما گیا ہو جو اس نے صبح شیشے میں دیکھا تھا۔

اس نے ایک بار پھر یوکلپٹس کے پیڑوں کی قطار کو دیکھا، جن پر اب دھوپ پوری طرح پھیل گئی تھی۔ آج اتوار ہے، وہ کمپنی باغ میں گھوم رہا ہے اور کیاریوں میں پھول لگے ہیں — لال، ہرے، پیلے، جو سدا اس کے لیے اجنبی ہی رہیں گے، جیسا بنچ پر بیٹھا وہ شاگرد ہے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا ہے۔

اور گھر میں شور وغل ہو رہا ہوگا۔ دونوں سالے آج گھر پر ہی رہیں گے اور اگر دونوں میں سے ایک کی سسر سے جھڑپ بھی ہو جائے تو تعجب نہیں۔ بچوں کی بھی اسکول کی چھٹی ہے؛ آپس میں لڑیں گے اور کہیں منو بیچ میں پھنس گیا تو وہی پیٹا جائے گا۔ ایسا ہی اس نے دیکھا ہے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے روتے ہوئے بیٹے کو دلاسے کے دو لفظ نہیں کہہ پاتا۔ اسے لگا کہ اگر وہ گھر واپس لوٹ کر نہ بھی جائے تو کوئی اس کی غیر موجودگی محسوس نہیں کرے گا۔ کھانے کے وقت اس کا انتظار نہیں ہوتا، مہری اس کی تھالی لگا کر اس کی کوٹھری میں ہی دے جاتی ہے۔ اسے اور روٹی یا سبزی کی ضرورت بھی پڑے تو وہ مانگ نہیں سکتا۔

اور سسر کہتے تھے کہ اس کا خرچ سو سے زیادہ ہے۔ منو کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی خوراک بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن اُس دن جب چھت پر اس نے منو کو دیکھا تھا تو سوکھی ٹہنیوں جیسے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھ کر اس کا بڑا سا سر بہت بے ڈول جان پڑا تھا۔ اور یہ بھی اس نے سسر یا شاید بڑے سالے کو کہتے سنا تھا کہ اس کی کوٹھری کے آسانی سے چالیس روپے کرائے کے آسکتے ہیں۔

اس کی بیوی کے گہنے بھی سسر کے پاس دھرے ہیں۔ بیاہ کے بعد جب وہ یہیں آ کر رہنے لگا

Scanned with CamScanner

تھا تو بیوی نے گہنے پتا کے پاس رکھوا دیے تھے۔ جب ضرورت پڑتی تو مانگ کر پہن لیتی۔ اور اس کی موت کے بعد بھی وہ وہیں پڑے رہے۔ ایک بار اس کا ذکر چھڑا تو سسر نے بغیر کسی جھجک کے کہا کہ منو کی شادی ہونے پر اس کی بہو کو وہ گہنے دیے جائیں گے۔ اس نے ہاں نہ کچھ نہیں کی۔ لیکن ایک دن اپنے چھوٹے سالے کی بیوی کو وہی نیکلس پہنے دیکھا تھا جو اس کی بیوی پہنا کرتی تھی۔ تب غصہ آنے پر بھی وہ چپ ہی رہ گیا تھا۔ الگ مکان لے گا تو سسر سے گہنے بھی مانگ لے گا، لیکن دل میں کہیں اندیشہ تھا کہ اب اسے ملیں گے نہیں۔

گھومتے گھومتے اسے لگا، وہ کتنے ہی بوجھ اپنے پر لادے چلا جا رہا ہو۔ ایک ایک کر کے وہ بڑھتے ہی جاتے ہیں، کم نہیں کر پاتا۔ وہ باغ کے ایک کونے میں واقع کھنڈر کے سامنے پہنچ گیا۔ شاید کسی کا مقبرہ تھا۔ اوپر برجی پر بچے ہوئے نیلے پتھروں کے ٹکڑے دھوپ کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا دور سے کھنڈر کی کالی دیواروں اور دیواروں کے سوراخوں کو دیکھتا رہا۔

اچانک بنچ پر بیٹھے شاگرد کا چہرہ اسے یاد آیا تو اپنے اندر کسی کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی اور وہ بغیر ہلے ڈلے اپنی سانس روکے سنتا رہا، جیسے اندر بنی گہری کھائی کو کوئی بھر رہا ہو۔

اب منو کو خود پڑھایا کروں گا۔ شام کو گھر لوٹنے کے بعد روز دو گھنٹے پڑھایا کروں تو ایک دو سال بعد کسی اسکول میں چوتھی پانچویں میں بھرتی ہو سکتا ہے۔ اس سے چھوٹی عمر کے بچے اسکول جاتے ہیں اور وہ گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔

اس خیال سے اس کے پاؤں اپنے آپ گھر کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں ایک دکان سے اس نے ایک پرائمر، ایک سلیٹ، پنسل اور ایک کاپی خریدی۔ پھر کچھ سوچ کر دکاندار سے اس سامان کو اچھی طرح ایک اخبار کے کاغذ میں لپیٹ دینے کے لیے کہا، تا کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ اسے سونے کے بعد خواب دکھائی نہیں دیتے، لیکن کبھی کبھی جاگتے ہوئے، چارپائی پر لیٹے لیٹے، سونی چھت پر یا دفتر میں کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنی فائلوں میں اسے موتیوں جیسی جھلمل کرتی ہوئی بوندیں دکھائی دیتیں اور وہ انھیں تب تک دیکھتا رہتا جب تک وہ دھیرے دھیرے دھندلی ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتیں۔

اپنی کوٹھری میں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھا وہ پرائمر کے ورقوں کو دھیرے دھیرے سہلا رہا ہے،

Scanned with CamScanner

جیسے برسوں سے ایسی قیمتی چیز اس نے نہ دیکھی ہو۔ دن میں اندھیرا ہونے پر بھی وہ بتی نہیں جلاتا، اسے سب دکھائی دیتا ہے۔ اوپر شور ہو رہا ہے بچوں کا، اس کے سالوں کی عورتوں کا، اور رسوئی سے کھانے کی مہک آرہی ہے...

تبھی اپنے سسر کو کوٹھری کی طرف آتے دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ کبھی یہاں آئے ہوں، اسے یاد نہیں۔ اس نے فوراً پرائمر کو کمبل کے نیچے چھپا دیا۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے اور اسے لگا جیسے اس نے اس شخص کو پہلے کہیں دیکھا ہو۔ پھر پاس آنے پر پتا چلا کہ صبح شیشے میں جو اپنا چہرہ دکھائی دیا تھا، اس سے وہ شخص بہت ملتا جلتا ہے۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا جیسے ان میں سے بھی کچھ گر گیا ہے۔ دونوں کو کوٹھری کی دہلیز پر کھڑے دیکھ کر وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن اس کے سسر نے اس پر ایک نظر تک نہیں ڈالی۔ انھوں نے کمرے کی بتی جلا کر اس شخص سے کہا، ''یہی کمرہ ہے۔ پتائی ہونے کے بعد اس کا رنگ نکھر آئے گا۔ میرے پاس کتنے ہی آدمی اسے کرائے پر لینے آئے، لیکن کسی انجانے آدمی کو کیسے دے دوں؟ گھر میں عورتیں ہیں۔ آپ کو وکیل صاحب نے بھیجا ہے اور وہ میرے قریبی دوستوں میں ہیں، اس لیے ان پر بھروسا کر کے آپ کو دینے پر راضی ہوا ہوں۔'' اس شخص کو چپ دیکھ کر وہ پھر کہنے لگے، ''اس علاقے میں خالی کمرہ ملنا ناممکن ہے۔ پھر یہاں سب بات کا آرام ہے۔ کچہری، ڈاک خانہ، چوک، منڈی، سب بہت قریب پڑتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں پیدل ہی سب جگہ پہنچا جا سکتا ہے، رکشے کے پیسے بچیں گے۔''

اسے لگا جیسے وہ شخص کمرے کو دیکھنے کے بجائے اس کی طرف گھورے جا رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس سے آنکھیں ملتے ہی وہ شخص اس کا گلا دبوچ لے گا۔ خوف سے اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔

اس شخص نے وہ کمرہ لینا قبول کر لیا۔ سسر کے پچکے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اگلے اتوار تک وہ اپنا سامان لے آئے گا اور تب تک کمرے کی پتائی ہو جائے گی، سسر نے وعدہ کیا۔ جانے سے پہلے اس شخص نے پھر اس کی طرف دھیان سے دیکھا۔ لیکن وہ اپنا سر جھکائے ہی رہا۔ سانس تک لینا اسے دوبھر جان پڑ رہا تھا۔

ان کے چلے جانے پر بھی وہ کھڑا ہی رہا۔ چارپائی پر بیٹھنے کی اس کی ہمت نہیں پڑی جیسے اس

Scanned with CamScanner

کے بیٹھتے ہی سسر یا وہ شخص آ کر اسے اٹھا دیں گے۔

اس دن دوپہر کے بعد کوٹھری خالی کر دینی پڑی۔ اوپر چھت پر ٹین سے ڈھکا ایک گودام سا تھا جہاں گھر کا بے کار کا سامان پڑا رہتا تھا۔ برسات میں یہاں چارپائیاں، بستر رکھے جاتے تھے۔ دونوں سالوں نے مل کر اس کے بکھرے سامان کو ترتیب سے ایک کونے میں لگا دیا اور خالی جگہ پر، مہری کے جھاڑو لگا دینے کے بعد، اس کی چارپائی بچھا دی۔ اس کا بکس اور دوسرا سامان ایک کونے میں رکھ دیا۔ وہ کچھ نہیں بولا، ذرا سی بھی آنا کانی نہیں کی۔ سب کے نیچے چلے جانے پر وہ چارپائی پر لیٹ گیا، جہاں سے دور دور تک پھیلا صرف آسمان ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اور آسمان کے بیچ اور کچھ نہیں ہے، یہ سوچ کر اسے عجیب سا لگا۔ کچھ دیر بعد اسے اطمینان ہی ہوا۔ اشتیاق میں اس نے اپنے بکس سے پرائمر، سلیٹ اور کاپی نکالی اور انھیں کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا؛ سلیٹ پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچتا رہا۔

''اچھا منو، تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟'' وہ پاس بیٹھے منو کی بڑی بڑی، کھلی آنکھوں میں ڈوب کر پوچھتا ہے۔

لیکن منو کی آنکھیں کھلی ہی رہتی ہیں، جیسے کنکر پھینکنے پر بھی تالاب کے پانی میں کوئی ہلچل نہ ہو۔

''تم پڑھ لکھ کر کچھ تو بنو گے نا؟ ایسے ہی تو نہیں رہو گے؟'' وہ جھنجھلا کر کہتا ہے، ''کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی وکیل، کوئی بیوپاری، کوئی سیلر...'' اور یہ سوچ کر کہ شاید منو کو سیلر کا مطلب معلوم نہ ہو، وہ اس کی وضاحت کرنے لگتا ہے، ''سیلر جہاز میں بیٹھ کر بغیر پیسہ خرچ کیے دنیا بھر کا چکر لگاتا ہے۔ جس بندرگاہ پر جہاز رکتا ہے، وہ اندر جا کر شہر گھوم آتا ہے۔ نئے نئے لوگ، دکانوں میں نئی نئی چیزیں، کہیں شیر اور گینڈے کی لڑائی، کہیں دن میں بھی رات ہوتی ہے اور کہیں رات میں بھی سورج چمکتا رہتا ہے۔ بہت اونچے اونچے برف سے ڈھکے پہاڑ، گھنے جنگل اور میلوں تک پھیلا سمندر... وہ سب دیکھتا ہے۔ تم بھی کیا سیلر بنو گے، منو؟''

منو تعجب سے اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ لمحہ بھر کو اسے لگا تھا جیسے اس کی باتیں سن کر منو کے ہونٹ حیرت اور تجسس سے کھلے رہ گئے ہوں، اس کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا ہو اور اس کی آنکھوں میں موتیوں جیسی چمک آ گئی ہو، جیسے وہ خود یہ سب سوچتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور جیسا تاثر اس نے بہت پہلے ایک اتوار کی صبح بنچ پر بیٹھے ہوئے شاگرد کے چہرے پر دیکھا تھا۔ لیکن منو میں باہر اندر ایسا

ٹھہراؤ ہے جیسے دنیا کا بڑا سے بڑا واقعہ بھی اس کے اندر جل کر راکھ ہو جائے گا۔ کیوں نہیں منو بھی اس شاگرد کی طرح اسے اشتیاق بھری آواز میں بتلاتا کہ وہ بڑا ہو کر کیا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے؟

''میٹرک پاس کرنے کے بعد تجھے بمبئی بھیج دوں گا۔ بمبئی تک کے ٹکٹ کے لیے میرے پاس روپے ہیں۔ وہاں سیکڑوں جہاز روز آتے جاتے ہیں۔ کسی نہ کسی میں تجھے ضرور کام مل جائے گا۔ اور جب تو بہت بڑا سیلر بن جائے گا تو میں بھی ایک بار تیرے ساتھ چلوں گا۔ ہم دونوں اکٹھے دنیا بھر کی سیر کریں گے۔ میں نے ایسی رات کبھی نہیں دیکھی جب سورج چمکتا رہتا ہے، جہاں کبھی اندھیرا نہیں ہوتا۔'' اس کی اواز میں وہ سب چاہی اَن چاہی خواہشیں بھر آئیں، صابن میں گھلے پانی سے نکلے ان بلبلوں کی طرح جنھیں بچپن میں وہ دور دور تک اڑایا کرتا تھا۔

منو کو اپنے سامنے چپ بیٹھے دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ منو اب تک سیلر بن کر جہاز میں گھوم رہا ہوگا۔ خوفزدہ انداز میں اسے اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھ کر اسے غصہ آ گیا۔ ''بولتا کیوں نہیں؟ کیا بڑے ہو کر بھی ایسا گنوار بنا رہے گا؟''

ایسی آواز سن کر منو کی آنکھیں پل بھر کو مُندسی جاتی ہیں، ہونٹ پھڑکنے لگتے ہیں اور وہ رونے لگتا ہے۔ ڈر سے اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں کے اندر چھپا لیا۔

''بس رونا ہی سیکھا ہے اب تک تو نے؟'' اس کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ منو کے کان پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن منو اپنی پوری قوت کے ساتھ سر جھکائے ہی روتا رہتا ہے۔ اس کے آنسو بہت تیزی سے گھٹنوں سے نیچے بہتے ہوئے اس کی سوکھی ٹانگوں پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ رہے ہیں۔

اچانک منو کے کان چھوڑ کر وہ الگ ہو گیا۔ اس کے رونے کی آواز چھت پر کوئی سہارا نہ پا کر اوپر اٹھتی گئی اور ایک منحوس سی خاموشی کے دھند لکے کے ساتھ چمٹی ہوئی اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ وہ خالی آنکھوں سے اوپر مٹیالے رنگ کے آسمان کو دیکھ رہا ہے جیسے سمندر، پہاڑ، جنگل کھوج رہا ہو۔

منو کا رونا دھیرے دھیرے کم ہو کر سناٹے میں کھو گیا۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں اور ٹانگوں پر چمکتی ہوئی نیلی نسیں اور ان کے اوپر دھرا اس کا بڑا سا بے ڈول سر، جس کے الجھے، روکھے، بڑھے ہوئے کالے بال اجاڑ دھرتی میں جھاڑ جھنکاڑ سے جان پڑتے ہیں۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور کتنی ہی

Scanned with CamScanner

دیر تک اسی طرح ساکت بیٹھے رہے۔

اچانک اس نے گھٹنوں پر سر ٹیکے منو کی آنکھوں کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے پہاڑ کی چوٹی سے اسے نیچے دھکیل دیا ہو۔ جھٹکے کے ساتھ منو کے پاس پہنچ کر اس نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور منو کی خالی، بغیر جھپکتی ہوئی آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ منو کی آنکھوں میں بھی جیسے کچھ کھو گیا ہے، جیسا کہ اس اتوار کو شیشے میں اپنی آنکھوں کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا تھا۔ منو کی کھلی کھلی خالی سی آنکھیں، جیسے کوئی بند دروازہ کھل گیا ہے، جس کے بیچ میں سے دور دور تک وہ جھانک سکتا ہے۔ اندر کیا ہے، اسے جاننے کے ڈر سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

❊❊

Scanned with CamScanner

ہندوستانی اردو کتابیں

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ
محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر
قیمت: 235 روپے

کلیاتِ سراج
سراج اورنگ آبادی، مرتبہ: پروفیسر عبدالقادر سروری
قیمت: 207 روپے

کلیاتِ احمد مشتاق
احمد مشتاق
قیمت: 375 روپے

ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب (تنقید)
گیان چند جین
قیمت: 462 روپے

غالب کی تخلیقی حسّیت (تنقید)
شمیم حنفی
قیمت: 300 روپے

غالب: جدید تنقیدی تناظرات (تنقید)
مرتبہ: اسلوب احمد انصاری
قیمت: 300 روپے

متنی تنقید
خلیق انجم
قیمت: 338 روپے

آدھا گاؤں (ناول)
راہی معصوم رضا
قیمت: 420 روپے

جامع التذکرہ
پروفیسر محمد انصار اللہ
قیمت: 840 روپے

ہندوستان کے زمانہ قدیم وسطیٰ کے کتب خانے
بمل کمار دت
قیمت: 104 روپے

Scanned with CamScanner

پاکستانی اردو کتابیں

ادبستان (خاکے)
نیر مسعود
قیمت:140 روپے

مٹی آدم کھاتی ہے (ناول)
حمید شاہد
قیمت:150 روپے

پلِ صراط کا سفر (ناول)
حسینہ معین
قیمت:500 روپے

صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز)
طاہر مسعود
قیمت:400 روپے

تیسرے پہر کی کہانیاں
اسد محمد خاں
قیمت:150 روپے

پہلا آدمی
البیئر کامیو، ترجمہ: رضی مجتبیٰ
قیمت:150 روپے

جملہ حقوق غیر محفوظ (طنز و مزاح)
انوار احمد علوی
قیمت:150 روپے

اردو کے ضرب المثل اشعار
محمد شمس الحق
قیمت:300 روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں (ناول)
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت:600 روپے

تاریخِ اردو ادب (۴ جلدیں)
وہاب اشرفی
قیمت:1600 روپے

Scanned with CamScanner

اورحان پامُک

ابا کا سوٹ کیس

(نوبیل انعام قبول کرنے کی تقریر)

سفید قلعہ

(ناول کی دوسری اور آخری قسط)

Scanned with CamScanner

جدید ترکی سے تعلق رکھنے والے نامور ادیب اورحان پامک (Orhan Pamuk) کے ناول سفید قلعہ کے ترجمے کا پہلا حصہ آج کے شمارہ ۵۱ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کا بقیہ حصہ اس شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس دوران پامک کے وقیع ادبی کام کے اعتراف کے طور پر انھیں ۱۹۹۶ء کا نوبیل ادبی اعزاز پیش کیا گیا۔ اس انعام کو قبول کرتے ہوئے پامک نے جو تقریر کی وہ My Father's Suitcase کے عنوان سے مختلف مقامات پر شائع ہوئی اور انٹرنیٹ پر بھی دستیاب رہی۔ اس تقریر کا اصل ترکی متن نوبیل انعام کی ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا۔ اس دلچسپ اور پرانکشاف متن کا براہ راست ترکی زبان سے ترجمہ کرنا نمیرہ احمد کے تعاون سے ممکن ہوا جو حصول تعلیم کے سلسلے میں ترکی میں کئی برس گزار چکی ہیں۔ اس ترجمے کے دوران پامک کی تقریر کے انگریزی متن کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور کئی مقامات پر یہ محسوس ہوا کہ ترکی اور اردو کے مشترک ذخیرۂ الفاظ اور تہذیبی پس منظر کی یگانگت کے باعث پامک (اور دوسرے ترک ادیبوں) کی تحریروں کا براہ راست ترجمہ کرنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اورحان پامک

ترکی سے ترجمہ: نمیرہ احمد، اجمل کمال

ابا کا سوٹ کیس

وفات سے دو سال پہلے میرے ابا نے اپنی تحریروں، مسودوں اور ڈائریوں سے بھرا ایک چھوٹا سوٹ کیس میرے سپرد کیا۔ ہمیشہ کی طرح بذلہ سنج، پُر مذاق انداز اختیار کرتے ہوئے، انھوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں یہ چیزیں ان کے جانے کے بعد، یعنی ان کی موت کے بعد پڑھوں۔

تھوڑا سا جھجکتے ہوئے بولے، ''انھیں ایک بار دیکھ لینا۔ اگر کچھ کام کی چیزیں ہوں تو انھیں چن کر چھپوا دینا۔''

ہم دونوں میری مطالعہ گاہ میں، کتابوں کے درمیان تھے۔ کسی ایسے شخص کی طرح جو کسی تکلیف دہ اور بہت خاص بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہو، وہ کمرے میں چکر لگا کر کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں اس سوٹ کیس کو رکھ سکیں۔ آخرکار انھوں نے اسے آہستگی سے ایک ایسے کونے میں رکھ دیا جس پر کسی کی سیدھے نظر نہیں پڑتی تھی۔ یہ لمحہ، جو ہم دونوں کے لیے ایک شرمندہ کرنے والا اور ناقابلِ فراموش لمحہ تھا، جوں ہی گزرا ہم دونوں اپنے معمول کے کرداروں میں واپس آ گئے، زندگی کو سبک انداز سے لیتے ہوئے، ہماری شرارتی، پُر مذاق شخصیتیں (personas) دوبارہ ابھر آئیں اور ہم پرسکون ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح ہم نے ہوا پانی، روزمرہ کی زندگی، ترکی کے کبھی نہ ختم ہونے والے سیاسی مسئلوں، اور ابا کے بیشتر ناکامی پر ختم ہونے والے منصوبوں کے بارے میں، کسی خاص افسوس

Scanned with CamScanner

کے بغیر، باتیں کیں۔

مجھے یاد ہے کہ ابا کے جانے کے بعد میں کئی دن اس سوٹ کیس کو چھوئے بغیر اس کے آس پاس پھرتا رہا۔ چمڑے کے بنے اس چھوٹے، سیاہ سوٹ کیس، اس کے تالے اور گول کیے ہوئے کناروں سے میں اپنے بچپن سے واقف رہا تھا۔ ابا کسی مختصر سفر پر جاتے ہوئے اسے ساتھ لے جاتے اور بعض اوقات اسے گھر سے دفتر چیزیں لانے لے جانے کے لیے استعمال کرتے۔ جب ابا کسی سفر سے لوٹتے تو میں اس چھوٹے سوٹ کیس کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیتا اور مجھے یاد ہے کہ اس میں سے نکلنے والی کولون اور اجنبی ملکوں کی مہک مجھے بہت بھاتی تھی۔ یہ سوٹ کیس میرے لیے ایسی نشانی کی طرح تھا جو ماضی اور بچپن کی بہت سی یادوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو، مگر اب میں اس کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں؟ بلا شبہ اس میں چھپا کر رکھی ہوئی چیزوں کے اسرار انگیز وزن کی وجہ سے۔

اب میں اس وزن کے مفہوم کی بات کروں گا۔ ایک کمرے میں بند ہو کر، میز پر بیٹھ کر، گوشہ گیر ہو کر، کوئی شخص کاغذ اور قلم کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے — یہی ادب کے معنی ہیں۔

ابا کے سوٹ کیس کو چھو کر بھی میں اسے کھولنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا، لیکن میں اس میں رکھی ڈائریوں کو جانتا تھا۔ میں نے ان میں سے بعض میں ابا کو کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ میں نے اس سوٹ کیس کے اندر رکھے وزن کا ذکر سنا ہو۔ ابا کی جوانی کے دنوں میں، ۱۹۴۰ء کے عشرے کے آخری برسوں میں، ان کا ایک بڑا کتب خانہ تھا، وہ استنبول میں شاعر بننے کی خواہش رکھتے تھے اور والیری کا ترکی میں ترجمہ کر چکے تھے، لیکن انھیں وہ دشوار زندگی گزارنے کی خواہش نہ تھی جو ایک غریب ملک میں، جہاں پڑھنے والوں کی تعداد قلیل ہو، کسی شاعر کے حصے میں آتی ہے۔ ان کے ابا، یعنی میرے دادا، ایک مالدار تاجر تھے، اور ابا کے بچپن اور جوانی کے دن آرام دہ ماحول میں گزرے تھے اور وہ ادب یا تحریر کے مشغلے کی خاطر مشکل اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ زندگی سے اس کی ساری خوبصورتیوں سمیت محبت کرتے تھے، میں یہ بات سمجھتا تھا۔

ابا کے سوٹ کیس میں رکھی چیزوں سے مجھے دور رکھنے والا پہلا یہ خوف تھا کہ میں جو کچھ پڑھوں گا وہ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ چونکہ ابا یہ بات جانتے تھے اس لیے انھوں نے احتیاطاً یوں ظاہر کیا تھا جیسے ان تحریروں کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ زندگی کے پچیس سال لکھنے میں گزارنے کے بعد یہ دیکھنا

Scanned with CamScanner

میرے لیے غم انگیز تھا۔ لیکن میں ادب کو کافی سنجیدگی سے نہ لینے پر ابا کے لیے غصہ بھی محسوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا اصل خوف، اصل بات جسے میں جاننا یا دریافت کرنا بھی نہیں چاہتا تھا، یہ احتمال تھا کہ شاید ابا ایک اچھے ادیب رہے ہوں۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ میں ابا کا سوٹ کیس کھولنے سے خوفزدہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنے آپ سے اس کا اعتراف بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر ابا کے سوٹ کیس سے اصل اور بڑا ادب برآمد ہوتا تو مجھے ابا کی ذات میں ایک بالکل مختلف شخص کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا۔ یہ ایک خوفناک بات تھی۔ کیونکہ اتنی عمر کا ہو جانے کے باوجود میں اپنے ابا کو صرف ابا کے طور پر قبول کرنا چاہتا تھا، کسی ادیب کے طور پر نہیں۔

میرے نزدیک ادیب انسان کے اندر چھپا ہوا دوسرا شخص ہوتا ہے جسے دریافت کرنے کے لیے، اور اس کو وجود میں لانے والے عالم کو دریافت کرنے کے لیے، اسے برسوں صبر کے ساتھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے: ادب کی بات کرتے ہوئے جو شے سب سے پہلے میرے ذہن میں آتی ہے وہ کوئی ناول، شعر یا ادبی روایت نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس نے خود کو اکیلے کمرے میں بند کر کے، میز پر بیٹھ کر، اپنا رخ اندر کی طرف پھیر لیا ہو، اور اس گوشہ نشینی کے سائے میں لفظوں سے ایک نئی دنیا تخلیق کر رہا ہو۔ یہ شخص —— مرد یا عورت —— ٹائپ رائٹر استعمال کرسکتا ہے، کمپیوٹر کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، یا فاؤنٹین پین سے کاغذ پر ہاتھ سے لکھ سکتا ہے، جیسا کہ میں تیس برس سے کرتا آیا ہوں۔ لکھنے کے دوران وہ قہوہ، چائے یا سگریٹ پی سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً میز سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں، اتفاق سے دکھائی دینے والے درختوں کے منظر یا کسی تاریک دیوار کو دیکھ سکتا ہے۔ شعر، ڈراما یا میری طرح ناول لکھ سکتا ہے۔ یہ سارے فرق میز پر بیٹھنے اور صبر سے اپنا رخ اندر کی طرف پھیر لینے کے اصل عمل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ لکھنے کا مطلب اس اندر کی سمت دیکھنے والی نگاہ کو لفظوں میں ڈھالنا، اور گوشہ نشیں ہونے کے بعد اپنے اندر کی دنیا کا مطالعہ کرنا ہے، اور یہ عمل صبر، ضد اور سرخوشی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خالی صفحے پر الفاظ جوڑتے ہوئے، اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے دن، مہینے اور سال گزارتے ہوئے، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک نئی دنیا کو تخلیق کر رہا ہوں، جیسے اپنے اندر کے شخص کو وجود میں لا رہا ہوں، بالکل اس طرح جیسے کوئی ایک ایک پتھر رکھ کر پل یا گنبد تعمیر کر رہا ہو۔ ہم ادیب جو پتھر استعمال کرتے ہیں وہ لفظ ہیں۔ انھیں ہاتھوں میں تھام کر، اس بات کا اندازہ لگاتے

Scanned with CamScanner

ہوے کہ ہر لفظ دوسرے لفظوں کے ساتھ کس کس طریقے سے جڑ سکتا ہے، کبھی انھیں فاصلے سے دیکھتے ہوے، کبھی بہت قریب سے ان کو اپنی انگلیوں یا قلم کی نوک سے چھوتے ہوے، ان کو تولتے ہوے، انھیں ایک دوسرے پر جما جما کر، برسوں کے دوران، صبر، ضد اور امید کے ساتھ، ہم نئی دنیائیں تعمیر کرتے ہیں۔

میرے نزدیک کسی ادیب کا راز الہام میں نہیں — کیونکہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ الہام کہاں سے آتا ہے — بلکہ ادیب کی ضد اور اس کے صبر میں پوشیدہ ہے۔ ترکی زبان کی وہ خوبصورت کہاوت — سوئی سے کنواں کھودنا — مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ادیبوں ہی کے لیے وضع کی گئی تھی۔ پرانی حکایتوں میں مجھے فرہاد کا صبر بہت عزیز ہے جس نے عشق کی خاطر پہاڑ کریدا تھا، اور میں اسے سمجھتا بھی ہوں۔ اپنے ناول My Name is Red میں جہاں میں نے ان قدیم ایرانی مینا تور سازوں (miniaturists) کا تذکرہ کیا ہے جو برسوں ایک ہی گھوڑے کا نقش کھینچنے کی مشق کیا کرتے تھے، مو قلم کی ایک ایک جنبش کو ذہن نشیں کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ آنکھیں بند کر کے بھی اس خوبصورت گھوڑے کا نقش کھینچنے پر قادر ہو جائیں، وہاں میں جانتا تھا کہ میں لکھنے کے مسلک کی، خود اپنی زندگی کی بات کر رہا ہوں۔ اپنی زندگی کو، دوسرے انسانوں کی کہانی کی طرح، آہستہ آہستہ، بیان کرنے، اس بیان کرنے کی قوت کو اپنے اندر محسوس کرنے، میز پر بیٹھ کر صبر کے ساتھ خود کو اپنے فن، اپنے ہنر کے سپرد کر دینے کے لیے کسی ادیب کو سب سے پہلے امید پرستی حاصل ہونا ضروری ہے۔ الہام کا فرشتہ بعض ادیبوں کے پاس اکثر آتا ہے اور بعض کے پاس کبھی نہیں، لیکن وہ ان ادیبوں کو پسند کرتا ہے جو امید اور اعتماد رکھتے ہیں، اور جس وقت کوئی ادیب خود کو سب سے زیادہ تنہا محسوس کر رہا ہو، جس وقت وہ اپنی کوششوں، اپنے خوابوں اور اپنی تحریر کی قدر و قیمت کے بارے میں سب سے زیادہ شبہے میں مبتلا ہو — جس وقت وہ اس خیال کا شکار ہو جائے کہ اس کی کہانی محض اس کی اپنی کہانی ہے — ٹھیک اس لمحے الہام کا فرشتہ اس پر ایسی کہانیاں، مناظر اور خواب منکشف کر دیتا ہے جو اس دنیا کی تعمیر میں کام آ سکیں جسے وہ تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ لکھنے کا کام جس میں میں نے اپنی پوری عمر گزاری ہے، اس کے بارے میں سوچتے ہوے میرا سب سے زیادہ متاثر کن احساس یہ ہوتا ہے کہ یہ جملے، یہ خیالات اور یہ صفحات جنھوں نے مجھے اس قدر سرشاری اور مسرت بخشی، دراصل میرے تخیل کی

Scanned with CamScanner

پیداوار نہیں تھے — کہ انھیں کسی اور قوت نے تلاش کر کے دریا دلی کے ساتھ مجھے عطا کر دیا تھا۔

میں ابا کا سوٹ کیس کھولنے اور ان کی ڈائریوں کو پڑھنے سے خوفزدہ رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ ان دشواریوں کو برداشت نہ کرتے جو میں سہتا چلا آیا تھا، کہ وہ تنہائی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ انھیں دوستوں کی محفلیں، ہجوم، صحبت گاہ، ہنسی مذاق، اور رفیقوں کا ساتھ پسند تھا۔ لیکن بعد میں میں اس بارے میں ایک مختلف انداز سے سوچنے لگا۔ دنیا کو تج کر گوشہ گیری اور صبر اختیار کرنے کے یہ خیالات اصل میں میرے تعصبات ہو سکتے تھے جنھیں میں نے ایک ادیب کے طور پر اپنی زندگی اور اپنے تجربات سے اخذ کیا تھا۔ ایسے بہت سے عمدہ ادیب رہے ہیں جو بھیڑ بھاڑ اور گھریلو زندگی کے درمیان، رفاقت اور پر مسرت گپ شپ کی چمک دمک میں رہتے ہوئے بھی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ، ہمارے بچپن میں، ایک بار ابا گھریلو زندگی کی یکسانی سے اکتا کر ہمیں چھوڑ کر پیرس چلے گئے تھے جہاں — بہت سے ادیبوں کی طرح — وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ڈائریوں کے صفحات بھرنے میں مصروف رہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان میں سے بعض ڈائریاں سوٹ کیس میں اس لیے بھی رکھی ہیں کہ اسے میرے سپرد کرنے سے پہلے کے چند برسوں میں وہ آخرکار مجھ سے اپنی زندگی کے اُس دور کے بارے میں بات کرنے لگے تھے۔ وہ ان برسوں کے بارے میں اُس وقت بھی بات کرتے تھے جب میں کم عمر تھا، لیکن انھوں نے کبھی اپنی اس کشمکش، ادیب بننے کی آرزو اور شناخت سے متعلق ان سوالوں کا ذکر نہیں کیا تھا جو ہوٹل کے کمرے میں ان کو درپیش رہے تھے۔ اس کے بجائے وہ مجھے ان موقعوں کے بارے میں بتاتے جب انھوں نے سارتر کو پیرس کے فٹ پاتھوں پر گزرتے دیکھا، یا اپنی پڑھی ہوئی کتابوں یا دیکھی ہوئی فلموں کا ذکر کرتے، اور ان کی اس گفتگو سے کسی ایسے شخص کا خلوص ظاہر ہوتا جو کوئی نہایت اہم خبر سنا رہا ہو۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو یہ بات میرے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوئی کہ میرے ادیب بننے کی وجہ یہ بھی تھی کہ میرے ابا نے مجھ سے پاشاؤں اور بڑے مذہبی پیشواؤں سے کہیں زیادہ دنیا کے عظیم ادیبوں کا تذکرہ کیا تھا۔ شاید مجھے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے ابا کی ڈائریاں پڑھنی تھیں، اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا تھا کہ میں ان کے وسیع کتب خانے کا کس قدر احسان مند تھا۔ مجھے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی تھی کہ جن دنوں ابا ہمارے ساتھ رہتے تھے ان کو، میری ہی طرح، اپنے کمرے میں اکیلے، صرف کتابوں کے ساتھ، وقت گزارنا

Scanned with CamScanner

اور اپنے خیالوں سے گتھم گتھا رہنا بہت پسند تھا — اور مجھے ان کی تحریروں کے ادبی معیار کو زیادہ اہمیت دیے بغیر ان پر توجہ دینی تھی۔

لیکن ابا کے سوٹ کیس پر بے چینی سے نظر ڈالتے ہوئے مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہی ایک کام ہے جو میں نہیں کر پاؤں گا۔ ابا کبھی کبھی اپنے کتب خانے کے سامنے کے دیوان پر لیٹ جاتے، اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی کتاب یا رسالے کو رکھ کر کسی خواب میں چلے جاتے یا خود کو طویل عرصے کے لیے اپنے خیالوں میں گم کر دیتے۔ جب میں ان کے چہرے پر ایک ایسا تاثر دیکھتا جو گھریلو زندگی کے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور بحث و تکرار کے دوران ان کے چہرے کے تاثر سے مختلف ہوتا — جب مجھے ان کے چہرے پر اُس دروں بیں نگاہ کے پہلے آثار دکھائی دیتے — خاص طور پر اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں، میں سراسیمہ ہو کر یہ سمجھتا کہ وہ بے چین ہو رہے ہیں۔ اب، اتنے برس گزر جانے کے بعد، میں جانتا ہوں کہ یہ بے چینی وہ پہلی خصوصیت ہے جو کسی شخص کو ادیب بناتی ہے۔ ادیب بننے کے لیے صرف صبر اور ریاضت ہی کافی نہیں: سب سے پہلے ہمیں ہجوم، رفاقت، اور روزمرہ کی عام زندگی سے فرار ہونے اور خود کو کمرے میں بند کر لینے کی زبردست خواہش محسوس ہونی چاہیے۔ ہم صبر اور امید کی تمنا کرتے ہیں تاکہ اپنی تحریر میں ایک عمیق دنیا کو تخلیق کر سکیں۔ لیکن خود کو کمرے میں بند کر لینے کی خواہش ہی وہ شے ہے جو ہمیں عمل پر اکساتی ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے کیف حاصل کرنے والے، صرف اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھر کر دوسروں کے کہے ہوئے لفظوں سے اختلاف کرنے والے، کتابوں سے مکالمہ کرنے کے ذریعے اپنے خیالات اور اپنی دنیا کو وضع کرنے والے آزاد ادیب کی پہلی مثال، جدید ادب کے اولیں دنوں میں یقینی طور پر مونتین (Montaigne) میں دکھائی دیتی ہے۔ مونتین ایک ایسا ادیب تھا جس کی طرف ابا اکثر لوٹتے تھے اور جسے پڑھنے کی مجھ سے سفارش کرتے تھے۔ میں خود کو بھی ادیبوں کی اس روایت سے منسلک کرنے کا خواہش مند ہوں جو — دنیا میں کسی بھی جگہ، مغرب میں یا مشرق میں — خود کو معاشرے سے کاٹ کر، کتابوں کے ساتھ کمرے میں بند کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل ادب کا نقطۂ آغاز یہی ہے کہ کوئی شخص خود کو کتابوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بند کر لے۔

لیکن سب سے الگ تھلگ، کمرے میں بند ہو کر ہم اتنے اکیلے نہیں ہوتے جتنا ہم نے سمجھ رکھا

تھا۔ ہم ان ادیبوں کے لفظوں کی رفاقت میں ہوتے ہیں جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں، ہم دوسروں کی کہانیوں، دوسروں کی کتابوں، دوسروں کے لفظوں، یعنی اُس شے کی رفاقت میں ہوتے ہیں جسے ہم روایت کہتے ہیں۔ میرے نزدیک ادب وہ سب سے زیادہ قابل قدر ذخیرہ ہے جو انسانیت نے خود کو سمجھنے کی کوشش کے دوران جمع کیا ہے۔ قومیں، قبیلے اور معاشرے جوں جوں اپنے لکھنے والوں کے لفظوں پر توجہ دیتے جاتے ہیں، اتنے ہی زیادہ ذکی، پُر مایہ اور ترقی یافتہ ہوتے جاتے ہیں، اور، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، کتابوں کو جلانا اور ادیبوں کو رسوا کرنا کسی قوم کو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ایک تاریک اور بے عقل دور اس پر مسلط ہونے کو ہے۔ لیکن ادب کبھی بھی محض قومی معاملہ نہیں ہوتا۔ ادیب جب خود کو کتابوں کے ساتھ کمرے میں بند کر کے اپنے اندر کے سفر پر نکلتا ہے تو، رفتہ رفتہ، ادب کے قدیم اور ناگزیر اصول کو دریافت کر لیتا ہے: اسے وہ ہنر حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی کہانیاں یوں بیان کر سکے جیسے وہ دوسروں کی کہانیاں ہوں، اور دوسروں کی کہانیاں اس طرح سنا سکے جیسے وہ اس کی اپنی کہانیاں ہوں، کیونکہ ادب اسی کا نام ہے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں دوسرے لوگوں کی کہانیوں اور کتابوں میں سے گزرنا ہوتا ہے۔

ابا کا کتب خانہ بہت اچھا تھا۔ اس میں کل ڈیڑھ ہزار کتابیں تھیں — جو کسی ادیب کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔ میں نے بائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک شاید وہ تمام کتابیں نہیں پڑھیں، لیکن میں ان میں سے ہر کتاب سے مانوس تھا — میں جانتا تھا کہ ان میں سے کون سی اہم ہیں، کون سی ہلکی پھلکی، آسانی سے پڑھی جانے والی ہیں، کون سی کلاسیک ہیں، کون سی دنیا کی کسی بھی تعلیم کا ناگزیر حصہ ہیں، کون سی مقامی تاریخ کے قابل فراموش لیکن پُر لطف قصوں پر مشتمل ہیں، اور کون سی ان فرانسیسی ادیبوں کی تحریر کی ہوئی ہیں جنھیں ابا بہت اونچا درجہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے کتب خانے کو ذرا فاصلے سے دیکھتا اور یہ تصور کرتا کہ ایک دن، کسی اور مکان میں، میں اپنا ایسا ہی بلکہ اس سے بھی اچھا کتب خانہ بناؤں گا — اپنے لیے ایک دنیا تعمیر کروں گا۔ جب میں ابا کے کتب خانے کو فاصلے سے دیکھتا تو وہ مجھے پوری دنیا کی ایک چھوٹی سی تصویر معلوم ہوتا۔ لیکن یہ ایسی دنیا تھی جس کا مشاہدہ ہمارے اپنے گوشے سے، استنبول سے کیا جا رہا تھا۔ کتب خانہ اسی کی شہادت دیتا تھا۔ ابا نے یہ کتب خانہ اپنے غیر ملکی سفروں کے دوران، بیشتر پیرس اور امریکہ سے لائی گئی کتابوں سے بنایا تھا، لیکن اس میں استنبول

Scanned with CamScanner

کی ان دکانوں سے خریدی ہوئی کتابیں بھی شامل تھیں جہاں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے عشروں میں غیر ملکی زبانوں کی کتابیں فروخت کی جاتی تھیں، اور ان پرانی اور نئی کتابیں بیچنے والوں سے خریدی ہوئی کتابیں بھی، جن سے میں بھی واقف تھا۔ میری دنیا مقامی یا قومی دنیا اور مغربی دنیا کا آمیزہ ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں میں نے، کچھ زیادہ ہی بلند عزائم کے ساتھ، اپنا کتب خانہ جمع کرنا شروع کیا۔ میں نے ادیب بننے کا پوری طرح فیصلہ نہیں کیا تھا — جیسا کہ میں نے اپنی کتاب *Istanbul* میں بیان کیا ہے، میں محسوس کر رہا تھا کہ میں مصور تو بہرحال نہیں بنوں گا لیکن مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ میری زندگی کون سا راستہ اختیار کرے گی۔ میرے اندر ایک طرف ہر شے کے بارے میں پڑھنے اور سیکھنے کی ایک شدید اور ختم نہ ہونے والی جستجو اور امید پرستانہ، طاقتور خواہش موجود تھی، لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی میں کسی نہ کسی طرح کی کمی رہے گی، کہ میں دوسروں کی طرح زندگی نہیں گزار سکوں گا۔ میرے اس احساس کا تعلق کسی حد تک اس خیال سے تھا جس کا تجربہ مجھے ابا کے کتب خانے کو دیکھ کر ہوتا تھا — مرکز سے دور، اضلاع میں زندگی گزارنے کا خیال، جو استنبول کے ہم سب رہنے والوں پر اُن دنوں مسلط رہتا تھا۔ کسی چیز کے کم ہونے کے خیال اور اس سے محسوس ہونے والی تشویش کا ایک اور سبب بھی تھا: مجھے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ایک ایسے ملک میں رہتا ہوں جسے فنکاروں سے — خواہ وہ مصور ہوں یا ادیب — کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور جو اپنے فنکاروں کو بہت امید نہیں دلاتا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں، جب میں، ابا کے دیے ہوئے پیسوں سے، استنبول کے پرانی کتابیں بیچنے والوں سے مٹتے ہوئے حروف والی، گردآلود، کونے مڑی کتابیں خریدتا تو ان پرانی کتابوں کی دکانوں کی قابلِ رحم حالت سے، اور سڑک کے کنارے، مسجدوں کے احاطوں میں اور شکستہ ہوتی دیواروں کے سائے میں کتابیں بیچنے والے مفلس، شکن آلود کتب فروشوں کی افسوسناک پریشان حالی سے بھی اتنا ہی متاثر ہوتا جتنا ان کتابوں سے۔

جہاں تک دنیا میں اپنے مقام کا تعلق ہے — زندگی میں بھی اسی طرح جیسے ادب میں — میرا بنیادی احساس یہی تھا کہ میں ''مرکز میں نہیں ہوں''۔ دنیا کے مرکز میں وہ زندگی تھی جو ہماری زندگیوں سے کہیں زیادہ پُرمایہ اور جوش انگیز تھی، اور میں، استنبول اور ترکی کے سب رہنے والوں سمیت، اس سے باہر تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میرا یہ احساس دنیا کے بیشتر لوگوں میں مشترک ہے۔ اسی طرح

ایک عالمی ادب تھا، اور اس کا مرکز بھی مجھ سے بہت دور کہیں واقع تھا۔ دراصل میں جس ادب کے بارے میں سوچتا تھا وہ عالمی نہیں بلکہ مغربی ادب تھا، اور ہم ترکی کے رہنے والے اس سے باہر تھے۔ ابا کا کتب خانہ بھی اس بات کی شہادت دیتا تھا۔ ایک کنارے پر استنبول کی کتابیں تھیں — ہمارا ادب، ہماری مقامی دنیا، اپنی تمام محبوب تفصیلات سمیت — اور دوسرے کنارے پر اُس دوسری، مغربی دنیا کی کتابیں تھیں جس سے ہماری دنیا ذرا بھی مشابہت نہ رکھتی تھی، جس سے مشابہت کی کمی ہمیں تکلیف بھی دیتی تھی اور امید بھی دلاتی تھی۔ لکھنا، پڑھنا، دراصل ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا کی اجنبیت، انوکھے پن اور حیرت انگیزی میں تسکین ڈھونڈنا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ابا ناول اس لیے پڑھتے تھے تاکہ اپنی زندگی سے فرار ہو کر مغرب میں جا چھپیں — جیسا کہ بعد میں میں نے بھی کیا۔ یا اُن دنوں مجھے ایسا لگتا کہ کتابیں ان چیزوں کا نعم البدل ہیں جن کی ہمیں اپنی ثقافت میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ پڑھنا ہی نہیں، لکھنا بھی استنبول میں اپنی زندگیوں سے نکل کر مغرب کا سفر کر آنے کا ذریعہ تھا۔ سوٹ کیس میں رکھی بیشتر ڈائریوں کے صفحات بھرنے کے لیے ابا پیرس گئے تھے جہاں انھوں نے خود کو ہوٹل کے کمرے میں بند کر لیا تھا اور پھر اپنی تحریریں لے کر ترکی لوٹ آئے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ابا کے سوٹ کیس پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات بھی مجھے بےچین کرتی ہے۔ ترکی میں ایک ادیب کے طور پر زندہ رہنے کے لیے پچیس برس کمرے میں بند رہ کر کام کرنے کے بعد مجھے یہ بات ناقابلِ برداشت محسوس ہوتی تھی کہ ابا نے اپنے ان گہرے خیالات کو سوٹ کیس میں چھپائے رکھا، یوں ظاہر کیا جیسے لکھنا کوئی راز میں رکھا جانے والا عمل ہو، جسے معاشرے سے، ریاست سے، لوگوں سے پوشیدہ رکھنا ضروری ہو۔ شاید یہی اصل وجہ تھی کہ مجھے ابا پر غصہ آیا کہ انھوں نے میری طرح ادب کو اتنی سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا۔

دراصل مجھے ابا پر غصہ تھا کیونکہ انھوں نے میری جیسی زندگی نہیں گزاری تھی، ان کا اپنی زندگی سے کبھی تنازع نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان خوش و خرم رہے۔ لیکن میں اپنے اندر یہ بات بھی جانتا تھا کہ مجھے اتنا 'غصہ' محسوس نہیں ہو رہا ہے جتنا 'حسد' — شاید یہ موخر الذکر لفظ ہی زیادہ درست ہے — اور یہ بات بھی مجھے بےچینی میں مبتلا کر رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں اپنی معمول کی ملامت آمیز، ناراض آواز میں خود سے سوال کرتا: ''خوشی کیا ہے؟'' کیا خوشی یہ سوچنے میں

ہے کہ میں نے اپنے اس تنہا کمرے میں ایک عمیق زندگی گزاری ہے؟ یا اس کا مطلب معاشرے کے درمیان رہ کر، وہی کچھ مانتے ہوئے جو دوسرے لوگ مانتے ہیں، یا کم از کم اپنے عمل سے یہی ظاہر کرتے ہوئے، ایک آرام دہ زندگی گزارنا ہے؟ کیا یہ خوشی ہے یا ناخوشی کہ انسان زندگی کو پوشیدہ طور پر لکھنے میں بسر کرے جبکہ عیاں طور پر وہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے مطابقت میں رہ رہا ہو؟ لیکن یہ سب ضرورت سے زیادہ جھنجھلاہٹ پر مبنی سوالات تھے۔ مجھے یہ خیال کہاں سے سوجھ گیا کہ اچھی زندگی کا سب سے اہم پیمانہ خوشی ہے؟ لوگ، اخبارات، ہر شخص یہی ظاہر کیا کرتا کہ خوشی زندگی کا اہم ترین پیمانہ ہے — کیا یہی بات اس کے لیے کافی نہیں کہ پرکھ کر دیکھ لیا جائے، شاید حقیقت اس کے بالکل برعکس ہو؟ آخر اتنی بار ابا اپنے گھر سے فرار ہو کر دور چلے گئے تھے — میں انھیں کتنی اچھی طرح جانتا ہوں اور کتنے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی بےچینی میری سمجھ میں آتی ہے؟

چنانچہ جب میں نے ابا کا سوٹ کیس پہلی بار کھولا تو یہی بات مجھے تحریک دے رہی تھی۔ کیا ابا کی زندگی میں کوئی راز تھا، کوئی ناخوشی، جس سے میں بالکل ناواقف رہا تھا، جس کو برداشت کرنے کا ان کے پاس یہ واحد طریقہ تھا کہ وہ اسے اپنی تحریر میں سمو دیں؟ سوٹ کیس کھولتے ہی مجھے سفر کی وہی مہک یاد آ گئی، میں نے اس میں رکھی کئی ڈائریوں کو پہچان لیا اور مجھے یاد آیا کہ ابا نے یہ برسوں پہلے مجھے دکھائی تھیں لیکن ان کے بارے میں زیادہ دیر بات نہیں کی تھی۔ زیادہ تر ڈائریاں جنھیں میں نے اپنے ہاتھ میں لیا وہ تھیں جن کے صفحات کو ابا نے اپنی جوانی کے دنوں میں اس وقت بھرا تھا جب وہ ہم سے دور، پیرس میں تھے۔ ان بہت سے ادیبوں کی طرح جو مجھے محبوب تھے — جن کی سوانح عمریاں میں نے پڑھ رکھی تھیں — میں جاننا چاہتا تھا کہ ابا، اس عمر میں جس عمر کا میں اب ہوں، کیا لکھتے تھے، کیا سوچتے تھے۔ مجھے یہ بات جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ان ڈائریوں میں مجھے ایسی کوئی چیز ہاتھ نہیں آئے گی۔ مجھے سب سے زیادہ بےچینی اس وقت محسوس ہوتی جب ابا کی تحریر میں، کہیں کہیں، مجھے ایک ادیب کی سی آواز سنائی دیتی۔ یہ ابا کی آواز نہیں ہے، میں خود کو بتاتا، یہ ان کی اصل آواز نہیں ہے، کم از کم یہ اُس شخص کی آواز نہیں ہے جس سے میں اپنے ابا کے طور پر واقف رہا ہوں۔ میرے اس خوف کی تہہ میں، کہ ابا لکھتے وقت میرے ابا نہیں رہے ہوں گے، ایک اس سے زیادہ گہرا خوف پنہاں تھا: یہ کہ کہیں، اپنے بہت اندر، میں بھی حقیقی شخص نہیں ہوں، کہ مجھے ابا کی تحریروں میں کوئی اچھی چیز

ہاتھ نہیں آئے گی۔ اس خیال سے میرا یہ خوف اور بڑھ گیا کہ مجھے معلوم ہوگا کہ ابا پر دوسرے ادیبوں کا بہت زیادہ اثر رہا ہے، اور اس خیال نے مجھے اسی مایوسی میں مبتلا کر دیا جس نے نوجوانی کے دنوں میں مجھ پر اس بری طرح حملہ کر دیا تھا کہ میں اپنی زندگی، اپنے پورے وجود، اپنی لکھنے کی خواہش اور اپنی تحریر سب کے بارے میں شک میں پڑ گیا تھا۔ ناول نگاری کے پہلے دس برسوں کے دوران میں نے اس شک اور اضطراب کو انتہائی گہرائی میں محسوس کیا اور اس کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی مجھے کبھی کبھی خوف ہوتا تھا کہ ایک دن مجھے شکست تسلیم کرنی ہی پڑے گی — جیسے میں نے مصوری کے میدان میں ہار مان لی تھی — اور خود کو اپنی بے اطمینانی کے حوالے کرتے ہوئے، ناول نگاری کو بھی خیر باد کہنا ہوگا۔

میں نے اپنے ان دو احساسات کو بیان کیا ہے جو ابا کا سوٹ کیس بند کر کے ایک کونے میں رکھتے ہوئے میرے اندر بیدار ہوئے تھے: یہ احساس کہ میں مرکز سے دور کسی غیر اہم جگہ رہ رہا ہوں، اور یہ خوف کہ میں حقیقی (authentic) ادیب نہیں ہوں۔ بلاشبہ ان مضطرب کن احساسات سے میرا پہلی بار سابقہ نہیں پڑ رہا تھا۔ میں برسوں، اپنی میز پر بیٹھ کر لکھنے اور پڑھنے کے دوران، ان احساسات کو ان کے ضمنی نتائج، حساس اعصابی ریشوں، ان کی اندرونی گرہوں اور بے شمار رنگوں سمیت بار بار دریافت کرتا رہا ہوں، ان کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں، انھیں اور زیادہ گہرا کرتا رہا ہوں۔ بلاشبہ زندگی اور کتابوں سے جنم لینے والے اس مضطرب کن احساس اور آتے جاتے درد کے ہاتھوں میرا حوصلہ جواب دیتا رہا ہے، خاص طور پر اُن دنوں جب میں جوان آدمی تھا۔ لیکن یہ کتابیں لکھنے ہی سے ممکن ہوا کہ میں حقیقی پن (authenticity) کی بابت تشویش کو زیادہ مکمل طور پر سمجھ سکا (مثلاً *My Name is Red* اور *The Black Book* میں) یا مرکز سے دور، حاشیے پر رہنے کے احساس کو زیادہ گہرائی میں جان سکا (مثلاً *Snow* یا *Istanbul* میں)۔ میرے نزدیک ادیب ہونے کا مطلب ان زخموں کو تسلیم کرنا ہے جو ہم اپنے وجود میں پوشیدہ رکھتے ہیں، جو اس قدر مستور ہوتے ہیں کہ خود ہمیں بھی ان کا بمشکل شعور ہوتا ہے، اور ادیب ہونے کا مطلب ان زخموں اور تکلیفوں کا صبر کے ساتھ متواتر مشاہدہ کرنا، انھیں جاننا، ان کو روشنی میں لانا، انھیں اپنانا اور اپنی شناخت اور تحریر کا شعوری جز بنانا ہے۔

ادیب ان چیزوں کا تذکرہ کرتا ہے جن کا سب لوگوں کو علم ہوتا ہے، لیکن انھیں اس علم کا ادراک نہیں ہوتا۔ اس علم کو کھوجنا، اسے بڑھتے ہوئے دیکھنا اور دوسروں کو اس میں شریک کرنا ایک

Scanned with CamScanner

پرمسرت تجربہ ہے؛ پڑھنے والا حیرت کے ساتھ ایک ایسی اجنبی دنیا کی سیر کرتا ہے جو اس کے لیے مانوس بھی ہوتی ہے۔ یہ مسرت ہمیں اس علم کی سچائی سے اور اس ہنر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے جس کی مدد سے یہ علم چھلک کر تحریر میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی ادیب خود کو برسوں کے لیے اپنے کمرے میں بند کر لیتا ہے تاکہ اپنے ہنر کو بہتر بنا سکے —ایک دنیا کو تخلیق کر سکے — تب، اپنے ان پوشیدہ زخموں کو اپنے نقطۂ آغاز کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، وہ، دانستہ یا نادانستہ، انسانیت پر گہرائی سے یقین کر رہا ہوتا ہے۔ میرے اعتماد کا منبع میرا یہ یقین ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں، کہ دوسروں کے وجود میں بھی ویسے ہی زخم ہیں جیسے میرے وجود میں —اور یہ کہ یہی وجہ ہے کہ وہ میری بات سمجھ جائیں گے۔ تمام ادب اسی بچکانہ، پُر امید یقین کا سہارا لیتا ہے کہ سارے انسان ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی ادیب خود کو برسوں کے لیے کمرے میں بند کر لیتا ہے تو اپنے اس عمل سے وہ اسی انسانیت، اور ایک بے مرکز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میرے ابا کے سوٹ کیس سے، اور بلاشبہ استنبول میں گزرنے والی ہماری زندگیوں کے ماند رنگوں سے، ظاہر ہوتا ہے، دنیا کا ایک مرکز یقیناً تھا، اور وہ مرکز ہم سے بہت دور واقع تھا۔ اپنی کتابوں میں میں نے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح زندگی کی سکھائی ہوئی اس بنیادی حقیقت نے صوبائیت (provinciality) کے ایک ایسے احساس کو ابھارا جو ہمیں چیخوف کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے، اور کس طرح، ایک اور راستے سے ہو کر، اس احساس نے مجھے خود اپنی اصلیت کے بارے میں تشویش میں مبتلا کیا۔ میں اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ اس زمین پر رہنے والے بیشتر انسان انھی احساسات کی پیدا کردہ گھٹن کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، اور یہ کہ بہت سے لوگ مجبور، غیر محفوظ اور بے توقیر ہونے کا شدید خوف رکھتے ہیں۔ ہاں، انسانیت کو درپیش سب سے بڑی تکالیف اب بھی بے زمینی، بے گھری اور بھوک کی تکالیف ہیں... لیکن آج ہمارے ٹیلی وژن اور اخبار ہمیں ان بنیادی مسائل کی اطلاع اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری اور سادگی سے پہنچا دیتے ہیں جتنا ادب سے ممکن ہو سکتا ہے۔ آج ادب کو جن مسائل کے بیان اور تجزیے کی ضرورت ہے وہ انسانیت کی بنیادی تکالیف ہیں: الگ تھلگ رہ جانے کا خوف، بے قدر ہونے کا خوف، اور بے مصرف ہونے کا وہ احساس جو اس خوف کے ساتھ آتا ہے؛ اجتماعی تذلیل، خطرے کا احساس، تحقیر،

محرومی، حساسیت اور مفروضہ توہین، اور ان سب سے بہت قریبی طور پر منسلک قومی غرور اور مبالغہ آمیزی... جب کبھی ایسے جذبات سے، اور اس غیر عقلی، ضرورت سے زیادہ شدید زبان سے جس میں ان کا اظہار کیا جاتا ہے، میرا سامنا ہوتا ہے، میں جان جاتا ہوں کہ یہ میرے اندر کی ایک تاریکی کو چھوتے ہیں۔ ہم نے مغرب سے باہر ایسے عوام، معاشروں اور قوموں کا اکثر مشاہدہ کیا ہے — اور میں آسانی سے خود کو ان کے ساتھ شناخت کر سکتا ہوں — جو ان احساسات کی تاب نہیں لا پاتے اور ان کے زیر اثر بعض اوقات حماقتیں کر بیٹھتے ہیں، صرف اس لیے کہ انھیں تذلیل کا ڈر رہتا ہے اور وہ اس بارے میں بے حد حساس ہوتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مغرب میں — جس کے ساتھ بھی میں خود کو اتنی ہی آسانی سے شناخت کر سکتا ہوں — قومیں اور عوام اپنی مالی خوشحالی پر ضرورت سے زیادہ ناز کرتے ہیں، اور اس بات• پر کہ انھوں نے ہمیں نشاۃ ثانیہ، روشن خیالی اور جدیدیت کا تحفہ دیا، اور وقتاً فوقتاً وہ ایک ایسی خود اطمینانی کا شکار ہو جاتے ہیں جو اتنی ہی احمقانہ ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے ابا اپنی قسم کے واحد شخص نہیں تھے، اور یہ کہ ہم سب ایک ایسی دنیا کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس کا ایک مرکز ہو۔ جبکہ وہ شے جو ہمیں خود کو برسوں تک کمرے میں بند کر کے لکھتے رہنے پر مجبور کرتی ہے، اس کے بالکل برعکس ہے: یہ یقین کہ ایک دن ہماری تحریروں کو پڑھا اور سمجھا جائے گا، کیونکہ دنیا کے تمام لوگ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ لیکن، جیسا کہ میں اپنی اور ابا کی تحریروں کے ذریعے سے جانتا ہوں، یہ ایک اذیت ناک امید پرستی ہے، اس غصے سے مجروح کہ ہمیں حاشیے پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے، کہ ہم الگ تھلگ رہ گئے ہیں۔ مغرب کی بابت وہ محبت اور نفرت جسے دستوئیفسکی ساری عمر محسوس کرتا رہا، اسے میں نے بھی بہت سے موقعوں پر محسوس کیا ہے۔ لیکن اگر میں کسی بنیادی حقیقت کو دریافت کر پایا ہوں، اگر میرے پاس حقیقی امید پرستی کا کوئی جواز ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس عظیم ادیب کے مغرب سے نفرت اور محبت کے رشتے میں سے ہو کر گزرا ہوں، اور میں نے اس دنیا کی سیر کی ہے جسے اُس نے، دوسرے کنارے پر، تعمیر کیا تھا۔

تمام ادیب جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کام میں لگا دیں، اس حقیقت سے واقف ہیں: ہمارا اصل مقصد جو کچھ بھی ہو، برسوں تحریر کے امید پرستانہ عمل میں مشغول رہ کر ہم جو دنیا تخلیق کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

وہ، آخر کار، بہت سے مختلف مقامات پر جا بستی ہے۔ یہ ہمیں اس میز سے بہت دور لے جاتی ہے جس پر بیٹھ کر ہم غم یا غصے کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، یہ ہمیں اس غم اور غصے کے دوسری جانب، ایک اور دنیا میں لے جاتی ہے۔ کیا ابا خود اس قسم کی دنیا تک نہیں پہنچ سکتے تھے؟ جس طرح ایک طویل سمندری سفر کے بعد زمین رفتہ رفتہ کسی جزیرے کی طرح دھند میں سے نکل کر اپنے تمام رنگوں سمیت مجسم ہوتی جاتی ہے، یہ دوسری دنیا ہمیں اسی طرح مسحور کرتی ہے۔ اس دنیا کی بابت ہمارا احساس ان مغربی سیاحوں کی کیفیت سے ملتا جلتا ہے جو جنوب کی سمت سے جہاز میں آتے ہوئے استنبول شہر کو دھند میں سے برآمد ہوتا ہوا دیکھتے تھے۔ امید اور تجسس کے عالم میں شروع ہونے والے لمبے سفر کے اختتام پر ان کے سامنے مسجدوں اور میناروں سے بھرا ایک شہر، مکانوں، گلیوں، پہاڑیوں، پلوں اور ڈھلانوں کا ایک مجموعہ، یعنی ایک مکمل دنیا ہوتی تھی۔ ہم اپنی نظروں کے سامنے ظاہر ہوتی ہوئی اس دنیا کو دیکھ کر اس میں داخل ہونے، اس میں خود کو گم کر دینے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں جیسے کوئی اچھا پڑھنے والا کسی کتاب میں گم ہو جاتا ہے۔ کسی میز پر اس وجہ سے بیٹھ کر کہ ہم مرکز سے دور، کسی صوبائی مقام پر، دنیا کے حاشیے پر ہیں، یا غصے یا گہری اداسی میں مبتلا ہیں، ہم نے ایک ایسی دنیا کو پا لیا جو ان تمام احساسات کو ذہن سے محو کر دینے کے لیے کافی ہے۔

میں اپنے بچپن اور جوانی میں جو محسوس کرتا تھا اب اس کا بالکل الٹ محسوس کرتا ہوں: میرے لیے اب دنیا کا مرکز استنبول ہے۔ اس کی صرف یہ وجہ نہیں کہ میں نے اپنی پوری زندگی یہیں گزاری ہے، بلکہ یہ کہ پچھلے تینتیس سال سے میں اس کی گلیوں، اس کے پلوں، اس کے باسیوں، اس کے کتوں، اس کے مکانوں، اس کی مسجدوں، اس کے فواروں، اس کے عجیب سورماؤں، اس کی دکانوں، اس کے مشہور کرداروں، اس کے تاریک گوشوں، اس کے دنوں اور اس کی راتوں کو اپنے وجود کا حصہ بناتے ہوئے، ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے، بیان کرتا آیا ہوں۔ ایک مقام ایسا آیا جب یہ دنیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، یہ دنیا جو صرف میرے سر میں آباد تھی، میرے نزدیک اُس شہر سے کہیں زیادہ حقیقی ہوگئی جس میں میں دراصل رہتا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب یوں لگا جیسے لوگ اور گلیاں، چیزیں اور عمارتیں ابھی ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں گی، آپس میں اس قسم کے عملی تعلق قائم کر لیں گی جس کی میں نے پیش گوئی نہیں کی تھی، جیسے وہ صرف میرے تخیل میں یا میری

کتابوں میں آباد نہیں بلکہ خود اپنے لیے زندہ رہنے لگی ہوں۔ یہ دنیا جسے میں نے اس طرح تخلیق کیا تھا جیسے کوئی شخص سوئی سے کنواں کھودتا ہو، ہر دوسری چیز سے بڑھ کر سچی معلوم ہونے لگی۔

ان برسوں کے دوران جو ابا نے لکھنے میں گزارے، ممکن ہے انھوں نے بھی اس قسم کی خوشی دریافت کی ہو، میں نے ان کے سوٹ کیس کی طرف دیکھتے ہوے سوچا: مجھے ان سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میں ان کا اس قدر احسان مند تھا: وہ کبھی حکم چلانے والے، پابندیاں لگانے والے، تسلط قائم کرنے والے، سزا دینے والے، رواجی باپ نہیں رہے، بلکہ وہ ایسے باپ تھے جس نے مجھے ہمیشہ آزاد رہنے دیا، ہمیشہ مجھ سے نہایت احترام کا سلوک کیا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر میں وقتاً فوقتاً اپنے تخیل سے کچھ اخذ کرنے کے قابل ہوا ہوں، خواہ یہ آزادی ہو یا بچکانہ پن، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ، اپنے بچپن اور جوانی کے بہت سے دوستوں کے برخلاف، مجھے اپنے باپ سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا، اور میں نے اس بات پر ہمیشہ گہرا یقین رکھا ہے کہ اگر میں ادیب بن پایا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابا نے بھی، اپنی جوانی میں، ادیب بننے کی آرزو کی تھی۔ مجھے ان کی تحریروں کو تحمل کے ساتھ پڑھنا ہوگا—— ہوٹل کے ان کمروں میں انھوں نے جو کچھ لکھا اسے سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

ان پُرامید خیالات کے ساتھ میں چل کر اس سوٹ کیس تک گیا، جو اب تک اسی جگہ تھا جہاں ابا نے اسے رکھا تھا؛ اپنی پوری قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوے میں نے ان میں سے چند مسودوں اور ڈائریوں کا مطالعہ کیا۔ ابا نے کس بارے میں لکھا تھا؟ مجھے پیرس کے ہوٹلوں کی کھڑکیوں سے دیکھے ہوے چند منظر یاد آتے ہیں، چند نظمیں، کچھ معمے، کچھ تجزیے... اس وقت یہ سطریں لکھتے ہوے میں اس شخص کی طرح محسوس کر رہا ہوں جو ابھی ٹریفک کے کسی حادثے سے دوچار ہوا ہو اور ذہن پر زور ڈال کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ تفصیلات یاد کرنا بھی نہ چاہتا ہو۔ جب میں بچہ تھا، اور ابا اور امی آپس میں کسی جھگڑے کی لگر پر ہوتے تھے—— جب وہ اُس ہلاکت خیز خاموشی میں چلے جاتے تھے—— تو ابا موڈ تبدیل کرنے کے لیے فوراً ریڈیو چلا دیتے تھے، اور موسیقی ہمیں یہ سب کچھ تیزی سے بھلا دینے میں بہت مدد دیتی تھی۔

آیئے میں بھی موڈ کو تبدیل کرنے کے لیے چند خوشگوار لفظ کہوں جو، مجھے امید ہے کہ وہی کام کریں گے جو موسیقی کرتی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہم ادیبوں سے سب سے زیادہ موقعوں پر کیا

Scanned with CamScanner

جانے والا، سب کا پسندیدہ سوال یہ ہے: آپ کیوں لکھتے ہیں؟ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے لکھنے کی ایک فطری خواہش محسوس ہوتی ہے! میں لکھتا ہوں کیونکہ میں دوسرے لوگوں کی طرح کوئی نارمل کام نہیں کر سکتا۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے ویسی کتابیں پڑھنا اچھا لگتا ہے جیسی میں خود لکھتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے آپ سب پر، ہر ایک پر بہت غصہ آتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے دن بھر کمرے میں بیٹھ کر لکھنا بہت پسند ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں حقیقی زندگی کو تبدیل کیے بغیر سہار نہیں سکتا۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ، ہم سب، پوری دنیا یہ جان لے کہ ہم استنبول میں، ترکی میں، کس طرح کی زندگی گزارتے آئے ہیں اور گزار رہے ہیں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ کاغذ، قلم اور روشنائی کی خوشبو مجھے بھاتی ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں کسی بھی اور شے سے زیادہ ادب پر، ناول کے فن پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ یہ ایک عادت، ایک شوق ہے۔ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے بھلا دیے جانے سے خوف آتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے وہ وقار اور توجہ پسند ہے جو لکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ میں تنہا ہونے کے لیے لکھتا ہوں۔ شاید میں اس لیے لکھتا ہوں کہ سمجھ سکوں کہ مجھے آپ سب پر اتنا زیادہ غصہ کیوں آتا ہے، ہر شخص پر اتنا زیادہ غصہ کیوں آتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ مجھے پڑھا جانا پسند ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ ایک بار جب میں کوئی ناول، کوئی مضمون، کوئی صفحہ شروع کر دوں تو میں اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ ہر شخص مجھ سے لکھنے کی توقع کرتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میرا کتب خانوں کے لافانی ہونے پر، شیلفوں میں اپنی کتابوں کے رکھے ہونے کے انداز کے لافانی ہونے پر بچکانہ عقیدہ ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ زندگی اور دنیا کی ہر چیز ناقابل یقین حد تک خوبصورت اور حیران کن ہے۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ زندگی کی تمام زیبائیوں اور خزانوں کو لفظوں میں ڈھالنا بے حد مسرور کن کام ہے۔ میں کوئی کہانی سنانے کے لیے نہیں لکھتا بلکہ اسے ترتیب دینے کے لیے لکھتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں تاکہ اس احساس سے فرار حاصل کر سکوں کہ کوئی جگہ ہے جہاں مجھے پہنچنا ہے لیکن — جیسا کہ خوابوں میں ہوتا ہے — میں وہاں پہنچ نہیں پاتا۔ میں لکھتا ہوں کیونکہ میں کبھی خوش نہیں ہو سکا۔ میں خوش ہونے کے لیے لکھتا ہوں۔

میری مطالعہ گاہ میں آ کر اپنا سوٹ کیس میرے سپرد کرنے کے ایک ہفتے بعد ابا ایک بار پھر مجھ سے ملنے آئے: ہمیشہ کی طرح وہ میرے لیے ایک چاکلیٹ کا پیکٹ لائے تھے (وہ بھول چکے تھے

Scanned with CamScanner

کہ میں اڑتالیس سال کا ہوں)۔ ہمیشہ کی طرح ہم زندگی، سیاست اور خاندانی قصوں کے بارے میں بات کرتے اور ہنستے رہے۔ ایک موقع ایسا آیا جب ابا کی نظریں کمرے کے اس گوشے کی طرف گئیں جہاں انھوں نے اپنا سوٹ کیس رکھا تھا، اور وہ سمجھ گئے کہ میں نے اسے سرکایا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے آنکھیں ملائیں۔ اس کے بعد ایک خجالت بھری خاموشی چھا گئی۔ میں نے انھیں نہیں بتایا کہ میں نے سوٹ کیس کھولا تھا اور اس میں رکھی چیزوں کو پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بجائے میں نے نظریں چرالیں۔ لیکن وہ سمجھ گئے۔ میں بھی سمجھ گیا کہ وہ سمجھ گئے ہیں۔ وہ یہ بات بھی سمجھ گئے۔ لیکن یہ سمجھنا اتنا ہی تھا جتنا چند سیکنڈ میں ممکن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ابا ایک مسرور، خوش باش آدمی تھے جسے خود پر اعتماد تھا: وہ میری طرف دیکھ کر اسی طرح مسکرائے جیسے ہمیشہ مسکراتے تھے۔ گھر سے رخصت ہوتے ہوے انھوں نے وہ ساری پیاری اور حوصلہ بڑھانے والی باتیں کہیں جو وہ، باپ کے طور پر، ہمیشہ کہتے تھے۔

ہمیشہ کی طرح میں ان کے مسرور، خوش باش اور اوسان بحال رکھنے والے مزاج پر رشک کرتا ہوا، انھیں جاتے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ اُس دن میرے اندر خوشی کی ایک لہر بھی اٹھی جس نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔ یہ اس خیال سے اٹھی تھی کہ ممکن ہے میں ان کی طرح اتنا پُرسکون نہ رہا ہوں، ان کی طرح خوش باش یا پُراعتماد نہ رہا ہوں، لیکن میں نے اپنی زندگی لکھنے میں صرف کی ہے — آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے... میں اپنے ابا کے خلاف ایسی باتیں سوچنے پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ کوئی اور نہیں بلکہ میرے ابا، جو کبھی میرے لیے تکلیف کا باعث نہیں بنے — جنھوں نے مجھے ہمیشہ آزاد رہنے دیا۔ ان سب باتوں سے ہمیں اس بات کی یاددہانی ہوتی ہے کہ تحریر اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہماری زندگیوں کے مرکز میں کسی شے کی کمی سے، اور ہمارے خوشی اور شرمندگی کے احساسات سے ہے۔

لیکن میری کہانی کی تعمیر میں ایک ایسا توازن (symmetry) ہے جس نے اُس دن مجھے فوری طور پر ایک اور بات یاد دلا دی، اور مجھے اور بھی زیادہ شرمندگی میں مبتلا کر دیا۔ ابا کے اپنا سوٹ کیس میرے حوالے کرنے سے تیئس سال پہلے، اور بائیس سال کی عمر میں میرے خود کو کمرے میں بند کر کے ناول لکھنے کے فیصلے کے چار سال بعد، میں نے اپنا پہلا ناول *Cevdet Bey and Sons* مکمل کیا؛ میں نے اس ناول کا، جو اس وقت تک غیر مطبوعہ تھا، ٹائپ کیا ہوا مسودہ کپکپاتے

ہاتھوں سے ابا کو دیا تا کہ وہ اس کو پڑھ کر اپنی رائے دیں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ مجھے ان کے ذوق اور ذکاوت پر اعتماد تھا: ان کی تائید میرے نزدیک بہت اہم تھی کیونکہ انھوں نے، امی کے برعکس، میری ادیب بننے کی خواہش کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس وقت ابا ہمارے ساتھ نہیں بلکہ بہت دور تھے۔ میں نے بے تابی سے ان کے لوٹنے کا انتظار کیا۔ دو ہفتے بعد جب وہ واپس آئے تو میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ابا نے کچھ نہیں کہا، لیکن ایک دم مجھے یوں لپٹا لیا جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میری کتاب انھیں بہت پسند آئی ہے۔ کچھ دیر تک ہم اس بے چین کر دینے والی خاموشی میں گم رہے جو اکثر شدید جذباتی لمحوں کے ہمراہ ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد، جب ہم پُرسکون ہوئے اور بات چیت کرنے لگے، تب ابا نے بہت پُرجوش اور مبالغہ آمیز زبان میں مجھ پر یا میری پہلی کتاب پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا: ان کی زبان سے نکلا کہ ایک دن مجھے وہ اعزاز ملے گا جسے نہایت مسرت کے ساتھ وصول کرنے کے لیے میں آج یہاں موجود ہوں۔

انھوں نے یہ لفظ اس لیے نہیں کہے تھے کہ وہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، یا اس اعزاز کو میرا ہدف بنانا چاہتے تھے: انھوں نے یہ لفظ اس انداز میں کہے تھے جیسے کوئی ترک باپ اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے کہتا ہے کہ ایک دن تم پاشا ہو گے! برسوں بعد تک جب کبھی وہ مجھ سے ملتے تو اپنے انھی لفظوں سے میری حوصلہ افزائی کرتے۔

ابا نے دسمبر ۲۰۰۲ء میں وفات پائی۔

آج، جب میں یہ عظیم انعام — یہ عظیم اعزاز — عطا کرنے والی سویڈش اکیڈمی اور اس کے ممتاز ارکان کے سامنے، اور ان کے معزز مہمانوں کے سامنے کھڑا ہوں، میری دلی حسرت ہے کہ آج ابا ہمارے درمیان ہوتے۔

❀❀

Scanned with CamScanner

اورحان پامک

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

سفید قلعہ

۷

میں نے تھوڑا سا پیسہ، جو موقع ملنے پر خوجہ سے چرایا تھا، اور وہ بھی جو میں نے اِدھر اُدھر کام کر کے کمایا تھا، پس انداز کر رکھا تھا۔ گھر چھوڑنے سے پہلے میں نے صندوق سے یہ اندوختہ نکالا جسے میں نے کتابوں کے درمیان، جن پر اب وہ کبھی ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالتا تھا، ایک موزے کے اندر چھپا رکھا تھا۔ تجسس کی گرفت میں آ کر، اب میں خوجہ کے کمرے میں گیا، جہاں وہ سو چکا تھا، بری طرح پسینے میں شرابور، اور چراغ روشن تھا۔ مجھے اس پر تعجب ہوا کہ وہ آئینہ جو مجھے اس حیرت انگیز مشابہت سے، جو پوری طرح مجھے کبھی اپنا یقین نہیں دلا سکی تھی، پوری رات ڈراتا رہا تھا، اس قدر چھوٹا سا تھا۔ کسی چیز کو چھوئے بغیر، میں بڑی تیزی کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ محلے کی ویران سڑکوں پر مجھے ایک ہلکی سی ہوا چلتی محسوس ہوئی۔ ایک لہر سی اٹھی کہ اپنے ہاتھ دھوؤں، مجھے معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے، میں آسودہ خاطر تھا۔ فجر کی خاموشی میں سڑکوں پر چلتے ہوئے، پہاڑیوں سے نشیب میں سمندر کی طرف اترتے ہوئے، فواروں میں ہاتھ دھوتے ہوئے، گولڈن ہورن کا منظر دیکھتے ہوئے مجھے لطف آ رہا تھا۔

میں نے جزیرۂ حَیبِیلی کا ذکر پہلی بار ایک نوجوان راہب سے سنا تھا جو استنبول وہیں سے آیا تھا؛ جب گلتا [غلطہ] کے یورپی علاقے میں ہماری ملاقات ہوئی، اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ جزائر کے حسن کا ذکر کیا۔ یقیناً میں متاثر ہوا ہوں گا کیونکہ اپنا علاقہ چھوڑتے ہی مجھے علم ہو گیا تھا کہ

Scanned with CamScanner

میں وہیں جاؤں گا۔ جن ملاحوں اور مچھیروں سے میں نے بات کی انھوں نے جزیرے تک پہنچانے کی ناقابلِ یقین اجرت مانگی، اور مجھے یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ انھیں معلوم تھا کہ میں ایک مفرور ہوں —— خوجہ جن لوگوں کو میری تلاش میں بھیجے گا یہ انھیں میرا اتا پتا بتا دیں گے! بعد میں میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا یہ طرزِ عمل ان عیسائیوں کو ڈرانے دھمکانے کی خاطر تھا جنھیں وہ طاعون سے خوفزدہ ہونے پر حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لوگوں کی توجہ میں نہ آنے کی خاطر میں نے جس دوسرے کشتی بان سے بات کی اسی سے سودا بھی کر لیا۔ وہ مضبوط آدمی نہیں تھا، اور اس نے چپّو چلانے پر کم اور طاعون کے ذکر پر، جو گناہوں کی سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا، زیادہ محنت صرف کی۔ تکمیلِ کلام کے طور پر اس نے یہ بھی بڑھا دیا کہ طاعون سے جان بچانے کے لیے جزیرے بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ جب وہ محوِ کلام تھا، مجھے احساس ہوا کہ وہ بھی اتنا ہی خائف ہے جتنا کہ میں۔ سفر میں چھ گھنٹے لگے۔

یہ بعد ہی میں ہوا کہ مجھے جزیرے پر گزارے ہوئے دن پُرمسرت معلوم ہوئے۔ ایک تن تنہا یونانی مچھیرے کے گھر پر اقامت کا معاوضہ مجھے بہت کم دینا پڑا، اور میں نے حتی المقدور نظروں سے دور رہنے کی کوشش کی کیونکہ میں خود کو پوری طرح محفوظ نہیں محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتا کہ خوجہ مر مرا چکا ہوگا، بعض اوقات یہ کہ وہ آدمیوں کو میرے تعاقب میں بھیجے گا۔ جزیرے پر میری طرح بہت سے عیسائی تھے جو طاعون سے امان پانے وہاں پہنچے تھے، لیکن میں ان کی توجہ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

میں ہر صبح مچھیرے کے ساتھ سمندر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ ایک مدت تک کانٹے دار برچھے سے کیکڑوں اور کیکڑوں کا شکار کرتا رہا۔ اگر موسم اتنا برا ہوتا کہ مچھلی مارنے کے قابل نہ ہوتا تو میں جزیرے میں چاروں طرف گھومتا پھرتا، اور ایسے وقت بھی آتے جب میں خانقاہ کے باغ میں جا کر بیلوں کے نیچے سکون سے سو جاتا۔ ایک سایہ دار کنج تھا جسے انجیر کے ایک درخت نے سہارا دیا ہوا تھا جہاں سے اچھے موسم میں آدمی ٹھیک آیا صوفیہ تک دیکھ سکتا تھا۔ میں یہاں سائے میں بیٹھ کر استنبول کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا، اور مسلسل گھنٹوں دن سپنوں میں گم رہتا۔ ایک سپنے میں میں کشتی میں سوار جزیرے کی طرف جا رہا تھا اور کشتی کے پہلو میں تیرتی ہوئی ڈولفنوں کی ہمراہی میں مجھے خوجہ دکھائی دیا، اس نے انھیں دوست بنا لیا تھا اور میری پوچھ تاچھ کر رہا تھا؛ ایک اور مرتبہ میری ماں بھی ان کے ساتھ نظر آئی جو مجھے دیر کر دینے پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ جب چہرے پر چمکتے ہوئے سورج کی تمازت سے پسینے میں شرابور میں جگ

Scanned with CamScanner

پڑتا تو پھر انھیں خوابوں میں لوٹ جانے کی خواہش کرتا، اور ایسا نہ کر سکنے پر، خود کو غور و فکر پر مجبور کرتا: کبھی میں تصور کرتا کہ خوجہ مر گیا ہے اور مجھے اس کی لاش خالی گھر میں نظر آ رہی ہے جسے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں تجہیز و تکفین کے سناٹے کو محسوس کر سکتا ہوں جس میں شریک ہونے کے لیے کوئی نہیں آئے گا؛ پھر میرا خیال اس کی پیش گوئیوں کی طرف جاتا، ان پُرتفنن چیزوں کی طرف جو اس نے ہنسی خوشی اختراع کی تھیں اور وہ بھی جو اس نے بیزاری اور طیش کے عالم میں گھڑی تھیں؛ اور سلطان اور اس کے جانوروں کی طرف بھی۔ ان دن سپنوں کے ہمراہ وہ بوجھل رقص کرتے ہوئے کیکٹ اور کیکڑے بھی آتے جن کی پشت کے آر پار میں نے برچھا اتار دیا ہوتا۔

میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جلد یا بدیر میں اپنے وطن فرار ہو سکوں گا۔ بس اس جزیرے کے کھلے دروازوں سے دبے پاؤں سرک جانے کی دیر ہی تو تھی، لیکن اس سے پہلے خوجہ کو بھول جانا لازمی تھا۔ کیونکہ میں بے خبری میں اس چیز کے طلسم میں آ گیا تھا جو مجھ پر وارد ہوئی تھی، یاد کی ترغیب کے؛ میں تقریباً خود کو ایک ایسے آدمی کو اکیلا چھوڑ آنے کا قصوروار ٹھہرا رہا تھا جو شکلاً مجھ سے اس قدر ملتا جلتا تھا۔ جیسے اب، اِس وقت بھی میں بڑے شدید جذبے سے اس کا آرزومند تھا؛ کیا واقعی وہ مجھ سے اتنا ہی مشابہ تھا جتنا یاد میں نظر آتا تھا یا میں اپنے کو فریب دے رہا تھا؟ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گزشتہ گیارہ سالوں میں میں نے ایک مرتبہ بھی ٹھیک سے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا؛ حقیقت یہ ہے کہ ایسا میں نے بار بار کیا تھا۔ مجھے یہ ہڑک بھی ہوئی کہ استنبول جاؤں اور ایک آخری بار اس کے مردہ جسم کو دیکھوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر مجھے آزاد ہونا ہے تو خود کو یہ یقین دلانا ہی پڑے گا کہ ہمارے درمیان وہ پُراسرار مشابہت یادداشت کی فاش غلطی تھی، ایک تلخ فریبِ نظر جسے فراموش کر دینا ضروری ہے، اور مجھے اس حقیقت کا عادی ہو جانا چاہیے۔

خوش قسمتی سے میں اس کا عادی نہ ہوا۔ کیونکہ ایک دن میں نے اچانک خوجہ کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ میں مچھیرے کے پائیں صحن میں لیٹا دن سپنے دیکھ رہا تھا، میری بند آنکھیں سورج کی طرف تھیں کہ مجھے اس کے سائے کا احساس ہوا۔ اس کا رخ میری طرف تھا، وہ مجھے اس آدمی کی طرح دیکھ رہا تھا جسے مجھ سے محبت ہو، نہ کہ اس کی طرح جس نے کسی کھیل میں مجھے شکست دی ہو۔ مجھے تحفظ کا غیر معمولی احساس ہوا، اتنا غیر معمولی کہ میں کسی خدشے سے چوکنا ہو گیا۔ شاید میں اندر اندر اسی کا انتظار کر رہا تھا،

Scanned with CamScanner

کیونکہ میں نے فوراً ایک کاہل غلام، ایک حقیر، تعظیماً سر جھکائے ملازم کے مجرمانہ محسوسات میں مراجعت کی۔ اپنا اثاثہ اکٹھا کرتے ہوئے، بجائے خوجہ سے نفرت کرنے کے، خود اپنے کو برا بھلا کہا۔ اور یہ وہ تھا جس نے مچھیرے کا جو قرضہ مجھ پر نکلتا تھا چکایا۔ وہ اپنے ساتھ دو آدمی لایا تھا اور ہم دوہرے چپو چلاتے ہوئے بسرعت لوٹ گئے۔ رات پڑنے تک ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ مجھے گھر سے اٹھنے والی مہک کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ اور آئینہ دیوار سے اتار دیا گیا تھا۔

اگلی صبح خوجہ نے سامنے کھڑا کر کے مجھ پر الزام لگانے شروع کیے: میرا جرم بہت گھناؤنا تھا اور وہ مجھے سزا دینے کو بے چین تھا، بھاگ جانے ہی پر نہیں، بلکہ یہ سوچ کر کہ کیڑے کی کاٹ طاعون کی گلٹی تھی اسے اپنے بسترِ مرگ پر تنہا چھوڑ کر چلے جانے پر بھی، لیکن یہ سزا دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے وضاحتاً کہا کہ گزشتہ ہفتے سلطان نے بالآخر اسے بلوایا اور پوچھا کہ یہ طاعون کب ختم ہوگا، اور کتنی زندگیوں کی قربانی لے گا، اور آیا اس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔ خوجہ نے، جو بڑے جوش میں آیا ہوا تھا، گول مول جواب دیے کیونکہ وہ تیار نہیں تھا، اور کچھ مہلت دیے جانے کی درخواست کی کیونکہ اسے ستاروں سے رجوع جو کرنا تھا۔ وہ احساسِ فتح مندی سے باؤلا باؤلا، ناچتا ہوا گھر لوٹا تھا، لیکن اس سے لاعلم کہ سلطان کی دلچسپی کو کس طرح اپنے فائدے کے حسبِ حال بنائے۔ تو اس لیے اس نے مجھے واپس لانے کا فیصلہ کیا۔

اسے ایک زمانے سے معلوم تھا کہ میں اس جزیرے پر مقیم ہوں؛ میرے رفو چکر ہونے کے بعد اسے سردی لگ گئی تھی، اور تین دن بعد وہ میری تلاش میں نکل پڑا تھا، مچھیروں سے میرا سراغ لگا لیا تھا، اور جب اس نے اپنے بٹوے کو ذرا اَور وا کیا تو باتونی کشتی بان نے بتا دیا کہ وہ مجھے ہَیبیلی لے گیا تھا۔ چونکہ خوجہ کو معلوم تھا کہ میں جزائر سے آگے فرار نہیں ہو سکتا، اس نے مزید میرا تعاقب نہیں کیا۔ جب اس نے کہا کہ سلطان سے یہ ملاقات اس کی زندگی کا فیصلہ کن موقع تھی تو میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اور اس نے بے کم و کاست کہا کہ اسے میرے علم کی حاجت ہے۔

ہم نے فوراً کام شروع کر دیا۔ خوجہ کا فیصلہ کن انداز اس آدمی کا سا تھا جسے کماحقہٗ معلوم ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے؛ اور میں اس عزمِ صمیم پر، جو میں نے اس سے قبل مشکل ہی سے اس میں دیکھا تھا، بے حد مسرور ہوا۔ چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اگلے دن اس کی دوبارہ طلبی ہوگی، ہم نے کچھ دیر اس میں پیچ لگانے کا

فیصلہ کیا۔ ہم نے اتفاق کیا کہ بہت زیادہ معلومات نہیں فراہم کرنی چاہئیں اور صرف اسی کا ذکر کرنا چاہیے جس کی تصدیق ممکن ہو۔ خوجہ کی تیز فہمی، جس کا میں اس قدر مداح تھا، اسے براہ راست اس رائے تک لے آئی تھی کہ ''پیشین گوئی مسخرہ پن ہے، لیکن اسے احمقوں کو متاثر کرنے کے لیے اچھی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔'' مجھے بولتا سنتے وہ اس پر اتفاق کرتا ہوا لگا کہ طاعون ایک تباہی ہے جس کی روک تھام صرف تندرستی سے متعلق پیش بندیوں ہی سے کی جا سکتی ہے۔ میری طرح وہ اس کا انکاری نہیں تھا کہ یہ تباہی خدا کے ارادے سے تھی، لیکن صرف بالواسطہ طور پر ہی؛ اسی لیے ہم فانی انسان بھی اس کا جائزہ لے سکتے ہیں اور خدا کی کبریائی کو مجروح کیے بغیر اپنے تحفظ کے لیے اقدامات کر سکتے ہیں۔ کیا خلیفۂ راشد عمر نے والی ابوعبیدہ کو شام سے مدینہ اس لیے نہیں بلوالیا تھا کہ فوج کو طاعون کی زد سے بچایا جاسکے؟ خوجہ سلطان کو مشورہ دے گا کہ اپنے تحفظ کے لیے اغیار سے اپنا میل جول مطلق کم سے کم کر دے۔ یہ نہیں تھا کہ سلطان کے دل میں موت کا خوف ڈال کر اسے ان پیش بندیوں پر کاربند ہونے کا قائل کرنے کا خیال ہمیں نہ آیا ہو، لیکن یہ ایک خطرناک بات تھی۔ یہ سلطان کو موت کے مبالغہ آمیز بیان سے محض خوفزدہ کرنے کا معاملہ نہیں تھا؛ خوجہ کی بک بک کی اثر انگیزی سے قطعِ نظر، اس کے نزدیک احمقوں کا ایک ہجوم اس کے خوف میں شرکت اور اس پر فتح پانے میں اس کی مدد کے لیے موجود تھا۔ بعد میں یہی بے اصولے احمق خوجہ کو بے دین ہونے کا الزام دے سکتے تھے۔ چنانچہ، میرے ادبیات کے علم پر بھروسا کرتے ہوئے، ہم نے سلطان کو سنانے کے لیے ایک افسانہ گھڑا۔

جو چیز خوجہ کے لیے سب سے زیادہ حوصلہ شکن ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ طاعون کب ختم ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ ہمیں ابتدا یومیہ اموات کے اعداد و شمار سے کرنی چاہیے؛ جب میں نے خوجہ سے اس کا ذکر کیا تو وہ بہت زیادہ متاثر نہیں ہوا، بہرکیف اس نے سلطان سے اعداد و شمار کی درخواست کی حامی بھر لی لیکن کہا کہ اپنی درخواست کی غرض و غایت پر پردہ پوشی کرے گا۔ ریاضی پر مجھے بہت زیادہ اعتماد نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

اگلی صبح وہ محل گیا، اور میں طاعون زدہ شہر میں۔ میں اب بھی طاعون سے اتنا ہی خائف تھا جتنا پہلے، لیکن حیاتِ روزمرہ کے پُرشور اور غیر منظم تحرک، اور دنیا سے کچھ نہ کچھ، خواہ اس کا ادنیٰ ترین حصہ ہی کیوں نہ ہو، اینٹھ لینے کی ہمہ جا موجود جستجو نے میرا سر چکرا دیا۔ یہ گرما کا ایک ٹھنڈا، ہوادار دن تھا؛ مرے

Scanned with CamScanner

ہوؤں اور مرتے ہوؤں کے درمیان پھرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ زندگی کو اس شدت سے چاہے ہوئے مجھے کتنے سال بیت گئے ہیں۔ میں مسجدوں کے دالانوں میں گیا، ایک کاغذ پر جنازوں کی تعداد درج کی، اور مختلف محلوں سے گزرتے ہوئے جو کچھ مجھے نظر آیا اس کے اور موت کے اعداد و شمار کے درمیان کسی ربط کو قائم کرنے کی کوشش کی: تمام گھروں، لوگوں، بھیڑ بھاڑ، چمک جھمک، اندوہ اور خوشی کے درمیان کسی معنی کی تفہیم آسان نہیں تھی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ میری آنکھ اگر کسی چیز کی بھوکی تھی تو یہ صرف تفاصیل تھیں، دوسروں کی زندگیاں، اور ان لوگوں کی مسرت، بے چارگی، اور لاتعلقی تھی جو اپنے گھروں میں اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ فروکش تھے۔

دوپہر کے قریب میں گولڈن ہورن کے دوسرے کنارے جا اترا، گلتا کے اس علاقے میں جہاں یورپی لوگ رہتے ہیں، اور بھیڑ بھاڑ اور مردہ لاشوں سے سرشار ہو کر گھٹیا سے قہوہ خانوں، گودیوں کے گردونواح میں گھومتا پھرا، جھجکتے ہوئے تمباکو پیا، حقیر سے طعام خانوں میں کھایا پیا، محض تفہیم کی خواہش کی خاطر، بازاروں اور دکانوں میں گیا۔ میں ہر تفصیل کو اپنے ذہن پر نقش کر لینا چاہتا تھا تاکہ کسی نتیجے تک پہنچ سکوں۔ جھٹ پٹے کے بعد گھر لوٹا، تھکن سے چور چور، اور خوجہ سے محل کا ماجرا سنا۔

وہاں سب ٹھیک گزری تھی۔ ہماری گھڑنت کہانی نے سلطان کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کی عقل نے یہ بات قبول کر لی تھی کہ طاعون ایک شیطان ہے جو انسان کا روپ دھار کر اسے فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے؛ اس نے محل میں اجنبیوں کے داخلے کی ممانعت کا فیصلہ کیا؛ آمد و رفت پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ جب خوجہ سے پوچھا گیا کہ کب اور کیسے طاعون ختم ہوگا، تو اس نے باتوں کا وہ طوفان اٹھا دیا کہ سلطان نے خوفزدہ ہو کر کہا کہ اسے موت کا فرشتہ عزرائیل شہر بھر میں کسی شرابی کی طرح مارا مارا پھرتا نظر آ رہا ہے، جس پر نظر جما دیتا ہے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لے جاتا ہے۔ خوجہ نے لپک کر اس کی تصحیح کی، یہ عزرائیل نہیں، خود شیطان ہے جو لوگوں کو بہلا پھسلا کر ان کی موت تک پہنچا دیتا ہے: اور وہ نشے میں دھت نہیں ہے بلکہ غایت درجے کا عیار ہے۔ خوجہ نے، عین ہمارے منصوبے کے مطابق، یہ بالکل واضح کر دیا تھا کہ شیطان سے جنگ آزمائی اشد ضروری ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ طاعون کب شہر سے رخصت ہوگا اس کی حرکات کا مشاہدہ از بس ضروری ہے۔ ہر چند کہ اس کے مصاحبین میں ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا کہ طاعون سے جنگ آرائی خدا کی مخالفت کے مترادف ہے، لیکن سلطان نے اس کو

Scanned with CamScanner

بالکل لائق اعتنا نہ سمجھا؛ اور بعد میں اپنے جانوروں کے بارے میں استفسار کیا؛ کیا طاعون کا شیطان اس کے شکروں کو گزند پہنچائے گا، اس کے عقابوں، شیروں، بندروں کو؟ خوجہ نے فوراً جواب دیا کہ شیطان انسانوں کے پاس انسانی روپ میں آتا ہے اور جانوروں کے پاس ایک چوہے کے روپ میں۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانچ سو بلیاں ایک دور افتادہ شہر سے لائی جائیں جو طاعون سے پاک ہو، اور کہ خوجہ کو جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو مہیا کیے جائیں۔

ہم نے لپک جھپک وہ بارہ آدمی جو ہماری ماتحتی میں دیے گئے تھے استنبول کے چاروں کناروں میں پھیلا دیے تا کہ سارے علاقوں کا پہرہ دیں اور ہمیں اموات کا شمار بتائیں اور دیگر تمام باتوں کی اطلاع دیں جو ان کے مشاہدے میں آئیں۔ ہم نے میز پر استنبول کا جو سرسری سا نقشہ میں نے کتابوں سے دیکھ کر بنایا تھا پھیلا دیا۔ خوف اور سرخوشی سے ہم ہر شب نقشے پر ان علاقوں پر نشان لگاتے جاتے جہاں طاعون پھیلا ہوتا، اور ان نتائج کا خلاصہ تیار کرتے جو ہم سلطان کو پیش کرنے والے ہوتے۔

شروع شروع میں ہمیں خوش امیدی نہ تھی۔ طاعون کسی ہرزہ گرد کی طرح شہر میں سترگشت کر رہا تھا، کسی فریبی شیطان کی طرح نہیں۔ ایک دن اُکسرائے کے علاقے میں اس نے چالیس آدمیوں کی جان لے لی، اگلے دن فاتح پر جھپٹا مارا، ناگہانی دوسرے کنارے پر نمودار ہوا، توپ خانے، جہانگیر میں، اور اگلے دن جب ہم نے دوبارہ دیکھا تو اس نے ان مقامات کو بمشکل ہی چھوا تھا اور زے رَک سے گزرتے ہوئے ہمارے علاقے میں داخل ہوا جہاں سے نشیب میں گولڈن ہورن نظر آتا تھا، اور بیس آدمی مار ڈالے۔ اموات کے اعداد سے ہماری سمجھ میں خاک نہ آیا؛ ایک دن پانچ سو جاں بحق ہوئے، اگلے دن ایک سو۔ کافی وقت برباد کرنے کے بعد احساس ہوا کہ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ طاعون نے کہاں شکار کیا ہے بلکہ یہ کہ اس کا چھوت پہلے کہاں لگا ہے۔ دریں اثنا سلطان پھر خوجہ کو طلب کر رہا تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ خوجہ یہ کہے گا کہ طاعون کی گزرگاہ بھیڑ بھڑکے سے پُر مارکیٹیں ہیں، بازار جہاں لوگ ایک دوسرے کو ٹہوکے دیتے ہیں، قہوہ خانے جہاں لوگ ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ وہ رخصت ہوا، شام پڑنے پر لوٹا۔

خوجہ نے یہ سب اس سے کہہ دیا۔ ''تو ہم کیا کریں؟'' سلطان نے پوچھا۔ خوجہ نے مشورہ دیا کہ مارکیٹوں میں ہونے والی آمد و رفت کو بہ زورِ بازو کم کیا جائے: حاکم کے نادان مصاحبین نے فوراً اس کی

مخالفت کی، ظاہر ہے: تو پھر شہر بھر میں کھانے پینے کا بندوبست کیسے ہوگا، بیوپار بند تو زندگی بھی ختم شد، یہ خبر کہ طاعون آدمی کے بھیس میں گھومتا پھر رہا ہے اپنے سننے والوں کو خوفزدہ کردے گی، وہ سوچیں گے کہ یوم الحساب آ گیا ہے اور کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا بیٹھیں گے؛ کون چاہے گا کہ ایسے محلے میں محصور ہو جائے جس میں طاعون کا شیطان دندناتا پھر رہا ہو، وہ اچھی خاصی بغاوت کھڑی کر دیں گے۔'' اور وہ اس میں بالکل حق بجانب ہوں گے،'' خوجہ نے کہا۔ اُس وقت کوئی احمق پوچھ بیٹھا کہ عوام کو اس درجہ قابو میں رکھنے کے لیے حسبِ ضرورت لوگ کہاں سے آئیں گے، اور سلطان مشتعل ہوگیا؛ اس نے یہ کہہ کر سب کی سٹی گم کر دی کہ اگر کسی نے اس کی طاقت میں شک کیا تو وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اپنے طیش میں اس نے حکم صادر کیا کہ خوجہ کی سفارشوں پر عمل درآمد کیا جائے، لیکن اس کے حلقے سے رجوع کرنے سے پہلے نہیں۔ شاہی منجم صدقی افندی نے، جس کے خوجہ کے تعلق سے دانت کافی تیز تھے، یاددہانی کرائی کہ اس نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ طاعون استنبول سے کب رختِ سفر باندھے گا۔ اس بات سے خائف کہ کہیں سلطان شاہی منجم کی رائے کو خاطر میں نہ لے آئے، خوجہ نے کہا کہ وہ جب اگلی دفعہ آئے گا تو ایک تقویم بھی ساتھ لائے گا۔

ہم نے میز پر نقشے کو نشانوں اور اعداد سے بھر دیا تھا لیکن ہنوز شہر میں طاعون کی نقل و حرکت کی منطق تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تک سلطان نے ہماری امتناعی سفارشات کو عملی جامہ پہنا دیا تھا اور تین دن سے زیادہ ہو رہے تھے کہ ان کا التزام کیا جا رہا تھا۔ ینی چیری مارکیٹوں میں داخلے کے دروازوں، شاہراہوں، بندرگاہوں پر پہرہ دے رہے تھے، مسافروں کو روک رہے تھے، ان سے پوچھ گچھ کر رہے تھے: ''کون ہو تم؟ کہاں جا رہے ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟'' وہ سہمے ہوئے، حیران پریشان مسافروں اور بےکار پھرنے والوں کو واپس اپنے گھر بھیج رہے تھے تاکہ طاعون کی زد میں نہ آ جائیں۔ جب تک ہمیں معلوم ہوا کہ صدر بازار اور اُن کا پہ میں نقل و حرکت سرد پڑ گئی ہے، ہم بیٹھے اموات کے اعداد و شمار پر غور کر رہے تھے جو ہم نے ماہ گزشتہ میں اکھٹے کیے تھے، اور کاغذ کے پرزوں پر درج کر کے دیوار پر لگا دیے تھے۔ خوجہ کی رائے تھی کہ ہم بےکار ہی طاعون کے کسی منطق کے مطابق نقل و حرکت کرنے کے منتظر ہیں اور اگر اپنے سروں کی جاں بخشی چاہتے ہیں تو سلطان کو پیش کرنے کے لیے کوئی بہانہ گھڑنا ناگزیر ہے۔

کم وبیش اسی وقت اجازت ناموں کا نظام بھی جاری کیا گیا۔ ینی چریوں کے آغا نے ان لوگوں میں اجازت نامے تقسیم کیے جو کاروباری امور کی بجا آوری کے لیے ضروری خیال کیے جاتے تھے، کہ کام جاری رکھیں اور شہر کو غذا بہم پہنچائیں۔ جب مجھے اموات کے اعداد میں پہلی بار ایک خاص قرینہ نظر آنا شروع ہوا تو ہمیں پتا چلا کہ آغا اس دھندے سے کافی پیسہ بٹور رہا ہے، اور چھوٹے بیوپاری، جو پیسہ دینے پر راضی نہیں تھے، بغاوت کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ جب خوجہ کہہ رہا تھا کہ وزیراعظم کپرولو چھوٹے تاجروں کے ساتھ مل کر ایک بغاوت کا منصوبہ بنا رہا ہے، تو میں نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے اسے اس مخصوص قرینے سے متنبہ کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ طاعون بیرونی محلوں اور تنگ حال علاقوں سے بتدریج اٹھتا جا رہا ہے۔

میری بات سے وہ پوری طرح قائل نہیں ہوا، لیکن تقویم کی تشکیل کا کام میرے سپرد کر دیا۔ بولا کہ سلطان کی توجہ بٹانے کے لیے اس نے ایک کہانی لکھی ہے جو اتنی لایعنی ہے کہ کوئی بھی اس سے کسی قسم کا نتیجہ نہیں نکال سکے گا۔ چند دن بعد اس نے پوچھا کہ کیا ایسی کہانی وضع کرنا ممکن ہے جس کا سوائے پڑھنے اور سننے کے لطف کے کوئی اور اخلاقی سبق یا مطلب نہ ہو۔ ''جیسے موسیقی؟'' میں نے تجویز پیش کی، اور خوجہ الجھن میں پڑ گیا۔ ہم نے اس پر بحث کی کہ مثالی کہانی کو کس طرح ایک معصوم پریوں کی کہانی کی طرح شروع ہونا چاہیے، اپنے وسط میں کسی ڈراؤنے خواب کی طرح مہیب ہونا چاہیے، اور اس کا اختتام کسی ہجر و فراق پر ختم ہونے والی عشقیہ کہانی کی طرح دردانگیز ہونا چاہیے۔ اس کے محل جانے سے پچھلی رات کو ہم دیر تک بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے اور جلد بازی سے کام کیا۔ دوسرے کمرے میں ہمارا چپ دست کاتب دوست اس کہانی کی شروعات کا مبیضہ تیار کرتا رہا جسے خوجہ ہنوز تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔ صبح کے قریب، ان محدود اعداد و شمار کو بروے کار لاتے ہوئے جو مجھے دستیاب تھے، میں نے ان مساواتِ جبریہ (equations) سے، جن کو بنانے کی میں دنوں جدوجہد کرتا رہا تھا، یہ نتیجہ نکالا کہ طاعون اپنے آخری شکار مارکیٹوں میں کرے گا اور بیس دن کے اندر اندر شہر چھوڑ دے گا۔ خوجہ نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ نتائج میں نے کن بنیادوں پر قائم کیے ہیں، اور صرف یہ جملہ تراشتے ہوئے کہ یومِ نجات بہت دور ہے، ہدایت کی کہ میں دو ہفتوں کے حساب سے تقویم پر نظرِ ثانی کروں اور اس مدت کو دوسرے اعداد میں خلط ملط کر دوں۔ مجھے اس میں کامیابی پر شک تھا، لیکن جو اس نے کہا تھا کر دیا۔

Scanned with CamScanner

چند تاریخوں کی رعایت سے خوجہ نے جھٹ پٹ شعری مادہ ہائے تاریخ نکالے اور کاتب کے ہاتھ میں ٹھونس دیے جو بس اب اپنا کام ختم کرنے ہی والا تھا؛ اس نے مجھے حکم دیا کہ مختلف شعروں کے لیے وضاحتی تصویریں بناؤں۔ دوپہر آتے آتے، چڑچڑا، مایوس اور خوفزدہ، اس نے مقالے کو ابری دار غلافوں میں باندھا اور اسے لے کر روانہ ہوا۔ بولا کہ اسے تقویم پر ان پیلیکنوں، پردار بیلوں، سرخ چیونٹیوں اور ناطق بندروں سے بھی کم تر یقین ہے جنھیں اس نے اپنی کہانی میں ٹھونسا ہے۔

جب وہ شام کو لوٹا تو خوشی سے باغ باغ تھا، اور یہ سرخوشی ان تین ہفتوں میں حاوی رہی جن کے دوران اس نے سلطان کو وافی وشافی طور پر اپنی پیش گوئی کی صحت کا قائل کر دیا: آغاز میں اس نے کہا تھا، ''کچھ بھی ہو سکتا ہے،'' پہلے دن وہ بالکل پرامید نہیں تھا؛ سلطان کے گرد جن لوگوں کا جمگھٹا تھا ان میں سے بعضے تو ایک خوش لحن بچے کی زبانی اس کی کہانی کو سنتے ہوئے ہنس بھی دیے تھے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ انھوں نے خوجہ کی تحقیر کے لیے کیا تھا، سلطان کی عنایات سے اس کو محروم کرنے کے لیے، لیکن حاکم نے خاموشی کا مطالبہ کیا اور ان کی سرزنش کی؛ اس نے خوجہ سے صرف یہی پوچھا کہ اس نے کن نشانیوں کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دو ہفتوں کے اندر اندر طاعون کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خوجہ بولا کہ یہ سب کچھ کہانی میں شامل ہے، جس کی تفہیم سے ہر کس قاصر رہا ہے۔ پھر، سلطان کو خوش کرنے کے لیے، اس نے بھانت بھانت کے رنگوں والی بلیوں سے موانست کا دکھاوا کیا جو ترابزون سے جہاز پر لائی گئی تھیں اور اب محل کے سارے دالانوں اور کمروں میں ہجوم کر رہی تھیں۔

اس نے کہا کہ دوسرے دن اس کی آمد پر محل دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا؛ ایک گروہ، جس میں شاہی منجم صدقی آفندی شامل تھا، ان تمام حفاظتی تدابیر کو جو شہر پر لاگو کی گئی تھیں ہٹانے کے حق میں تھا؛ جب کہ دوسرے جو خوجہ کی حمایت کر رہے تھے، بولے، ''شہر کو سانس لینے کی اجازت بھی نہیں ملنی چاہیے، طاعون کے شیطان کو سانس کے ساتھ بھی اندر داخل نہ ہونے دینا چاہیے۔'' اموات کے اعداد کو روز بروز کم ہوتے دیکھ کر میں پرامید تھا، لیکن خوجہ ہنوز متفکر، کیونکہ یہ بات سرگوشیوں میں سنی جا رہی تھی کہ پہلے گروہ نے، کپر ولو کے ساتھ سمجھوتا کر کے، بغاوت کی تیاریاں شروع کر دی ہیں؛ ان کا مقصد طاعون کو فتح کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے حریفوں سے نجات پانا۔

پہلے ہفتے کے اختتام پر اموات کے اعداد میں بیّن تخفیف نظر آ رہی تھی، لیکن میرے حساب

Scanned with CamScanner

کتاب سے عیاں تھا کہ وبا محض ایک اور ہفتے میں ٹلنے والی نہیں۔ میں نے خوجہ سے میری تقویم میں ہیر پھیر کرنے کی شکایت کی، لیکن اب وہ خود پر امید تھا؛ اس نے بڑے جوش کے عالم میں مجھ سے کہا کہ وزیراعلیٰ کی بابت وہ کانا پھونسیاں اب سننے میں نہیں آ رہیں۔ مستزاد یہ کہ خوجہ کی حمایتی جماعت نے یہ خبر پھیلادی ہے کہ کپرولوان کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔ جہاں تک سلطان کا تعلق ہے، وہ ان تمام ریشہ دوانیوں سے بری طرح خائف ہو کر اپنی بلیوں میں اپنے ذہنی سکون کا متلاشی ہے۔

دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے شہر کا دم طاعون کے مقابلے میں ان حفاظتی تدابیر سے زیادہ گھٹا جا رہا تھا؛ ہر گزرتے دن کے ساتھ کم سے کم لوگ مر رہے تھے، لیکن اس کا احساس صرف ہمیں تھا یا ہم جیسے دوسروں کو جو مرنے والوں کا شمار کر رہے تھے۔ قحط پڑنے کی افواہیں اڑنے لگی تھیں، استنبول قوی ایک اجڑے ہوئے شہر کی طرح ہو گیا؛ یہ سب مجھے خوجہ نے بتایا، کیونکہ میں محلے کے باہر ہی نہیں نکلتا تھا: ان تمام بند کھڑکیوں اور صحنوں کے پھاٹکوں کے پیچھے ان لوگوں کی بے بسی کو محسوس کر سکتا تھا طاعون جن کا دم گھونٹے دے رہا ہو، جو طاعون اور موت سے وقتی آرام مل جانے کے منتظر ہوں۔ محل بھی امید و بیم کے عالم میں تھا، اگر کبھی ایک پیالی بھی زمین پر گر جاتی یا کوئی زور سے کھانستا، لال بجھکڑوں کے ایک پورے ہجوم کے مثانے پیش قیاسی سے پھٹ پڑتے، سب کے سب فوراً سرگوشیوں میں کہتے: ''دیکھیں سلطان آج کیا فیصلہ کرتا ہے؛'' ان تمام بے چاری روحوں کی طرح شدید جذباتی ہیجان کے عالم میں جو کچھ ہو رہنے کے لیے بے تاب ہوں، خواہ یہ کچھ بھی ہو۔ اس تمام اضطراب سے خوجہ بڑی بری طرح متاثر ہوا؛ اس نے سلطان کو ٹھیک سے بتانے کی کوشش کی کہ طاعون رفتہ رفتہ اتر رہا ہے، کہ اس کی پیش گوئیاں درست ثابت ہوئی ہیں، لیکن وہ اس کو متاثر کرنے میں ناکام رہا، اور آخر جانوروں کے بارے میں گفتگو کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

دو دن بعد مسجدوں سے حاصل کیے جانے والے اعداد و شمار کی بنیاد پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے کے قابل ہو گیا کہ طاعون پورے طور پر سمٹ گیا ہے، لیکن اس جمعے کے دن خوجہ کی مسرت کچھ اس وجہ سے زیادہ تھی کہ مایوس ہوتے ہوتے بیوپاریوں میں کی ایک جماعت شاہراہوں پر پہرہ دینے والے ینی چریوں سے دو دو ہاتھ کر بیٹھی تھی، اور کہ ینی چریوں کا ایک اور گروہ، جو ان امتناعی اقدامات سے غیر مطمئن تھا، مسجدوں میں وعظ دینے والے دو ایک گھامڑ اماموں سے جا ملا تھا، چند آواروں سے جو

لوٹ کھسوٹ کے واسطے بے تاب تھے اور دیگر نکموں سے جن کی دانست میں طاعون خدا کے ارادے سے تھا اور کسی کو اس میں خلل انداز ہونے کا اختیار نہیں تھا۔ لیکن اس ابتری کو بے قابو ہونے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔ شیخ الاسلام سے فتویٰ ملتے ہی بیس آدمیوں کو فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، شاید ان واقعات کو اپنی اہمیت سے زیادہ یادگاری بنانے کے لیے۔ خوجہ کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

اگلی شام اس نے اپنی فتح کا ڈنکا بجا دیا۔ اب محل میں کسی کی مجال نہیں رہی تھی کہ حفاظتی اقدامات کے خلاف چوں بھی کر سکے؛ جب ینی چری کے آغا کو بلوایا گیا، تو اس نے محل کے باغی حامیوں کی نشان دہی کر دی؛ سلطان طیش میں آ گیا؛ وہ جماعت جس کی عداوت نے کچھ وقت کے لیے خوجہ کی زندگی اجیرن کر دی تھی تیتروں کے غول کی طرح تتر بتر ہو گئی۔ ایک وقت تک یہ سرگوشیاں ہوتی رہیں کہ کپرولو ان باغیوں کے خلاف سخت اقدامات کرے گا جن کے ساتھ، عام خیال کے مطابق، اس نے خفیہ تعاون کیا تھا۔ بالکل واضح مسرت کے ساتھ خوجہ نے اعلان کیا کہ اس معاملے میں بھی وہ سلطان پر اثر انداز ہوا ہے۔ جنھوں نے بغاوت فرو کی تھی وہ سلطان کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ طاعون بیٹھ گیا ہے، اور ان کا کہا درست بھی تھا۔ سلطان نے خوجہ کی اتنی تعریف کی کہ پہلے کبھی نہیں کی تھی؛ وہ اسے اپنے بندر دکھانے لے گیا جو افریقہ سے پنجرے میں لائے گئے تھے جو خاص اس نے حکم دے کر بنوایا تھا۔ جب دونوں بندروں کو دیکھ رہے تھے، جن کی غلاظت اور بے شرمی نے خوجہ کو متنفر کر دیا تھا، حاکم نے پوچھا آیا وہ توتوں کی طرح بولنا سیکھ سکتے ہیں۔ اپنے مصاحبین کی طرف رخ کر کے سلطان نے بالجبر کہا کہ وہ مستقبل میں خوجہ کو کثرت سے اپنے پہلو میں دیکھنے کا خواہاں ہے، جو تقویم اس نے مرتب کی تھی وہ حرف بہ حرف صادق آئی ہے۔

مہینہ بھر بعد ایک جمعے کے دن خوجہ کو شاہی منجم مقرر کر دیا گیا؛ اس نے اس سے بھی زیادہ بڑا مرتبہ پایا: جب سلطان نمازِ جمعہ ادا کرنے مسجدِ آیا صوفیہ گیا، جس میں پورا شہر طاعون کے رخصت ہونے کی خوشی منانے اُمڈ آیا تھا، تو خوجہ کا مقام عین اس کے پیچھے تھا؛ حفاظتی اقدامات اٹھا لیے گئے تھے، اور شادمانی کا جشن منانے والوں کے ہجوم میں میں خود بھی خدا اور سلطان کا شکر بجا لانے کو موجود تھا۔ جب سلطان گھوڑے پر سوار ہمارے سامنے سے گزرا، عوام الناس پورے زور سے نعرے لگانے لگے؛ وہ وجد میں آ گئے، بڑی دھکم پیل ہوئی، ہجوم ایک موج کی طرح امڈا اور ینی چری نے ہمیں بہ زور پیچھے دھکیل دیا،

Scanned with CamScanner

ایک لمحے کے لیے میں ایک درخت اور اُمڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان بھنچ کر رہ گیا، اور جب کہنیوں سے دھکم دھکا کر کے میں کسی نہ کسی طرح آگے نکل آیا تو خود کو خوجہ کے عین روبرو پایا، جو مجھ سے کوئی چار پانچ قدم کی دوری پر چل رہا تھا اور مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے میری طرف سے رخ پھیر لیا جیسے مجھے جانتا ہی نہ ہو۔ اس ناقابلِ بیان شور و غوغا میں، ناگہانی، جوش و خروش کی اس عام کیفیت سے احمقانہ طور پر متاثر ہو کر، میں نے یہ تصور کر لیا تھا کہ خوجہ نے اس لمحے مجھے نہیں دیکھا تھا، کہ اگر میں اپنی پوری قوت سے اسے پکاروں تو وہ میری موجودگی سے آگاہ ہو جائے گا اور مجھے اس بے اماں جمِ غفیر سے نجات دلا دے گا، یوں میں ان لوگوں کے پُرمسرت جلوس میں شامل ہو جاؤں گا جن کے ہاتھوں میں زمامِ فتح واقتدار ہے! یہ بات نہیں تھی کہ میں فتح مندی میں اپنے حصے کا طلب گار تھا یا اپنی کارکردگی پر کسی انعام کا خواہاں؛ میرا احساس بالکل دوسری نوعیت کا تھا: مجھے اس کے پہلو میں ہونا چاہیے، کیونکہ میں خود خوجہ کی ذات ہی تھا! میں اپنی ذات سے جدا ہو گیا تھا اور اسے باہر سے مشاہدہ کر رہا تھا، ٹھیک ان ڈراؤنے خوابوں کی طرح جو مجھے اکثر نظر آتے تھے۔ مجھے تو اِس دوسرے آدمی کی شناخت کی کوئی حاجت ہی نہیں تھی میں جس کے اندر تھا؛ اپنی ذات کو بغیر اپنے کو پہچانے گزرتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے دیکھتے وقت میں صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس سے جا ملوں۔ لیکن ایک وحشی سپاہی نے مجھے اپنی پوری قوت کے ساتھ واپس ہجوم میں دھکیل دیا۔

۸

طاعون کا زور ٹوٹنے کے بعد کے چند ہفتوں میں نہ صرف یہ کہ خوجہ کو شاہی نجومی کا رتبہ دے دیا گیا بلکہ اس نے سلطان سے اتنا قریبی تعلق بھی پیدا کر لیا کہ ہم جس کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے: اس چھوٹی موٹی بغاوت کی ناکامی کے بعد وزیرِاعلیٰ نے حاکم کی والدہ کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ اس کے بیٹے کو ان جغادریوں سے نجات دلائی جائے جو اس نے اپنے اردگرد جمع کر رکھے تھے؛ کیونکہ تاجروں اور ینی چری دونوں ہی کا خیال تھا کہ لال جھگڑوں کا یہی ہجوم، جس نے سلطان کو اپنی نکمی مہملیات سے گمراہ کیا ہے، ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ جب سابقہ شاہی منجم صدقی افندی کے آدمیوں کو، جس کے بارے میں یہ اشتباہ کیا جاتا تھا کہ سازش میں اس کا ہاتھ بھی شامل رہا ہے، محل سے نکال دیا گیا اور جلاوطن

Scanned with CamScanner

کردیا یا دوسرے عہدوں پر لگا دیا گیا، تو ان کے فرائض منصبی بھی خوجہ ہی کے سر آن پڑے۔

اب وہ روز ہی کسی نہ کسی محل میں، جہاں سلطان متمکن ہوتا، جانے لگا، اور ان اوقات میں جو سلطان نے اس کے ساتھ گفت وشنید کے لیے مخصوص کیے ہوتے اس سے تبادلۂ خیالات کرتا۔ جب خوجہ گھر لوٹتا تو، شاداں وظفرمند، مجھے بتاتا کہ ہر صبح کس طرح سلطان پہلے پہل اس سے اپنے گزشتہ رات کے خواب کی تعبیر کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اور ان تمام فرائض کے مقابلے میں جو اس کے ذمے تھے یہ اس کا سب سے زیادہ من بھاتا کام ہے: جب سلطان نے ایک صبح افسردگی کے ساتھ اعتراف کیا کہ پچھلی رات اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا، تو خوجہ نے کسی اور کے خواب کی تعبیر پیش کرنے کی پیشکش کی، اور جب حاکم نے بڑی گرمجوشی سے ہاں کردی تو شاہی نگراں دوڑے گئے اور کسی شخص کو جس نے رات کو اچھی طرح خواب دیکھا تھا حاکم کے حضور لے آئے، اور یوں ہر صبح ایک خواب کی تعبیر بیان کرنے کی دیرپا رسم کی داغ بیل پڑی۔ بقیہ وقت میں دونوں باغوں میں ارغوان اور چیڑ کے بڑے بڑے درختوں کے سائے میں چہل قدمی، یا باسفورس میں ڈونگیوں میں سیر کرتے ہوئے سلطان کے پیارے جانوروں اور، ظاہر ہے، اس مخلوق کے بارے میں جسے ہم نے اپنے تخیل میں جنم دیا تھا باتیں کرتے۔ لیکن وہ سلطان کے سامنے دیگر موضوعات بھی چھیڑتا رہا تھا، جو اس نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ مجھ سے بیان کیے: باسفورس کی داخلی لہروں کی وجہ کیا ہے؟ چیونٹیوں کی باقاعدہ عادات سے کیا کارآمد علم حاصل کیا جاسکتا ہے؟ مقناطیس میں قوتِ جذب اگر خدا کی جانب سے نہیں تو پھر کہاں سے آتی ہے؟ ستاروں کے یہاں وہاں ہونے کی کیا اہمیت ہے؟ کفار کے رسم ورواج میں کفر کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے، کوئی چیز جو جاننے کے قابل ہو؟ کیا ایسا ہتھیار ایجاد ہوسکتا ہے جو اُن کے لشکروں میں خوف وہراس پھیلا کر انھیں تتر بتر کردے؟ مجھے یہ بتانے کے بعد کہ سلطان نے کس قدر غور کے ساتھ اس کی باتوں کو سنا، خوجہ لپک کر میز پر جاتا اور وزنی، گراں قیمت کاغذ پر اس ہتھیار کے خاکے بنانے لگتا: لمبی لمبی نالیوں والی توپ، گولہ باری کرنے کے مشینی نظام جو از خود دھما کا کرسکیں، جنگ کے انجن، بھوت پریت جو شیطانی جانوروں کی طرف دھیان کو لے جائیں، پھر مجھے میز پر بلا کران پیکروں کے تشدد کے مشاہدے کی دعوت دیتا جو اس کے قول کے مطابق جلد ہی معرضِ وجود میں آنے والے تھے۔

اس کے باوجود میں خوجہ کے ساتھ ان خوابوں میں شریک ہونے کا خواہشمند تھا۔ شاید اس وجہ

سے کہ میرا ذہن ہنوز طاعون کے گرد منڈلا رہا تھا جس نے ہمیں اخوت کے ان دنوں کا تجربہ کروایا تھا۔ شیطان طاعون سے گلو خلاصی کے شکرانے کی نماز آیا صوفیہ میں پورے استنبول نے ادا کی تھی، لیکن بیماری ابھی تک شہر سے مکمل رخصت نہیں ہوئی تھی۔ صبح کو، جب خوجہ بہ عجلت سلطان کے محل کی جانب نکل پڑتا، میں تشویش کے عالم میں شہر بھر میں گھومتا پھرتا، تجہیز و تکفین کی رسوم کا شمار رکھتا جو محلے کی کوتاہ قامت میناروں والی مسجدوں میں اب بھی منعقد ہو رہی ہوتیں، وہ چھوٹی نادار سی مسجدیں جن کی سرخ ٹائل کی چھتیں کائی سے اَٹی تھیں، جو خدا جانے کن محرکات کی بنا پر اس امید میں ڈوبی ہوتیں کہ بیماری شہر کو اور ہمیں چھوڑ کر رخصت نہ ہو۔

جب خوجہ سلطان پر اثر انداز ہونے کا ذکر کر رہا ہوتا، اپنی فتح کا، میں اسے بتاتا کہ وبا ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے اور چونکہ امتناعی پابندیاں ہٹالی گئی ہیں، کسی دن بھی عود کر آسکتی ہے۔ وہ مجھے بھڑک کر خاموش کر دیتا، اس دعوے کے ساتھ کہ میں اس کی کامیابیوں سے جلتا ہوں۔ میں اس کا نکتہ سمجھ گیا: وہ اب شاہی منجم تھا، سلطان اپنے خواب اس سے ہر صبح بیان کرتا تھا، وہ تخلیے میں سلطان کو اس کے ان احمقوں کے مجمعے سے الگ تھلگ اپنی بات سنا سکتا تھا، یہ وہ باتیں تھیں جن کے ہم پندرہ سال سے منتظر رہے تھے، یقیناً یہ ایک کامیابی تھی؛ لیکن وہ کیوں اس انداز میں کامیابی کا ذکر کر رہا تھا گویا یہ تنہا اسی کی ہو؟ وہ بھول گیا تھا کہ طاعون کے خلاف اقدامات میں نے ہی تجویز کیے تھے، میں نے ہی وہ تقویم تیار کی تھی جو حرف بہ حرف درست ثابت نہ بھی ہوئی ہو لیکن اس طرح قبول ضرور کر لی گئی تھی: اس سے بھی کہیں زیادہ میں نے اس بات کا برا منایا کہ اسے صرف یہی یاد رہا تھا کہ میں جزیرے فرار ہو گیا تھا، لیکن وہ حالات نہیں جن کی بنا پر وہ مجھے بہ عجلت وہاں سے واپس لے آیا تھا۔

شاید وہ صحیح تھا، شاید جو میں محسوس کر رہا تھا اسے حسد کہا جا سکتا ہو، لیکن اس نے یہ نہیں خیال کیا کہ یہ برادرانہ احساس تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ سمجھ لے، لیکن جب میں نے اسے یاد دلانا چاہا کہ طاعون پھیلنے سے پہلے کے دنوں میں ہم کس طرح دو غیر شادی شدہ جوانوں کی طرح میز کے دونوں سروں پر بیٹھ کر اجاڑ راتوں کی اکتاہٹ کو بھلا دینے کی کوشش کرتے تھے، جب میں نے اس کی یاددہانی کرانی چاہی کہ کس طرح بعض موقعوں پر ہم خوفزدہ ہوتے تھے تاہم ہم نے ان خوفوں سے کتنا کچھ سیکھا تھا، اور یہ اعتراف کیا کہ جزیرے پر جب میں تن تنہا تھا تو کس شدت سے میں نے ان راتوں کی کمی محسوس کی

Scanned with CamScanner

تھی، تو اس نے یہ سب بڑے توہین آمیز انداز میں سنا گویا وہ محض میری ریاکاری کو کسی ایسے کھیل میں ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہو جس میں اس نے کوئی حصہ نہ لیا ہو؛ اس نے مجھے کوئی امید نہ دلائی، اس نے اشارتاً بھی یہ نہیں کہا کہ ہم ان دنوں کی طرف لوٹیں گے جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔

ایک سے دوسرے علاقے میں مٹرگشت کرتے ہوئے میں اب یہ دیکھ سکتا تھا کہ پابندیاں ہٹا دی جانے کے باوجود طاعون، گویا یہ نہ چاہتا ہو کہ اس چیز پر جسے خوجہ ''فتح'' کہتا تھا اپنا تاریک سایہ ڈالے، شہر سے بتدریج پیچھے ہٹ رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے اس پر حیرت ہوتی کہ ہمارے درمیان سے موت کے تاریک خوف کے اٹھنے اور چلے جانے کے خیال سے آخر کیوں میں خود کو اتنا اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا کہ ہم دونوں بات چیت کریں، سلطان کے خوابوں یا ان منصوبوں کے بارے میں نہیں جو خوجہ اس سے بیان کرتا تھا، بلکہ باہم گزارے ہوئے اپنے اگلے دنوں کے بارے میں: ایک مدت سے میں اس کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کے لیے تیار تھا، موت کے خوف کے باوجود، حتیٰ کہ اس ہیبت ناک آئینے کے سامنے بھی جو اس نے دیوار سے اتار دیا تھا۔ لیکن ادھر ایک زمانے سے خوجہ میرے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنے لگا تھا، یا کم از کم دکھاوے کے طور پر؛ بدتر یہ کہ بعض اوقات تو مجھے یہ یقین ہونے لگتا کہ وہ اس کی زحمت بھی اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں۔

جب تب، اس کو ہماری سابقہ پرمسرت زندگی کی طرف لوٹا لانے کے لیے، میں اس سے کہتا کہ ہمارا میز پر دوبارہ بیٹھنے کا وقت آ گیا ہے۔ مثال قائم کرنے کی خاطر، میں نے دو ایک بار لکھنے کی کوشش بھی کی؛ جب میں نے اسے طاعون کی دہشت کے مبالغہ آمیز بیان، خوف کی زائیدہ کسی شر کے ارتکاب کی وہ خواہش، اپنے معاصی کا بیان جو ادھورا ہی رہ گیا تھا، سے لبریز اپنے صفحات پڑھ کر سنائے، تو اس نے سننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی، الٹے تمسخر سے کہا، ایک ایسی قوت کے ساتھ جو اس نے اپنی کامرانی سے زیادہ شاید میری بے چارگی سے اخذ کی تھی، کہ اسے اس وقت بھی یہ معلوم تھا کہ ہمارا نوشتہ لغویت سے زیادہ نہیں، اس وقت یہ کھیل اس نے اکتاہٹ کی وجہ سے کھیلے تھے، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کہاں جا کر ختم ہوں گے، اور اس لیے بھی کہ وہ میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ میں ایک گناہ گار تھا! آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں: نیکوکار جیسا کہ وہ ہے اور مجرم جیسا کہ میں ہوں۔

Scanned with CamScanner

میں نے اس کے ان الفاظ کا، جنھیں میں نے فتح کے خمار پر محمول کیا، کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن اب بھی اتنا ہی زیرک تھا جتنا پہلے، اور جب میں بیچ باتوں پر خود کو مشتعل ہوتے دیکھتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ میں نے طیش میں آنے کی اپنی صلاحیت کھو نہیں دی ہے، لیکن میں ایسا ضرور ظاہر ہوتا جیسے یہ نہ جانتا ہوں کہ اس کے اکسانے کا جواب کیسے دوں، یا اسے کیسے شہ دوں، یا اسے کیسے زیرِ دام لاؤں۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دن جو میں نے اس سے مفرور جزیرۂ جیبیلی میں گزارے تھے ان میں میں اپنے مقصد کو بھول بیٹھا تھا۔ اگر وینس واپس پہنچ بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ پندرہ برسوں بعد میں نے عرصہ ہوا کہ یہ باور کر لیا تھا کہ میری ماں مر مرا چکی ہوگی، میری منگیتر میرے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی، اس نے شادی رچالی ہوگی، اب اس کا اپنا کنبہ کٹم ہوگا؛ میں ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا، وہ میرے خوابوں میں بھی کم سے کم آنے لگے تھے؛ علاوہ بریں، اپنے اولین سالوں کے برخلاف میں خود کو وینس میں ان کی معیت میں اب اور نہیں دیکھتا تھا، بلکہ انھیں خواب میں استنبول میں، ہمارے درمیان اقامت گزیں پاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وینس لوٹ بھی گیا تو اپنی زندگی کا آغاز وہاں سے نہیں کر سکوں گا جہاں وہ مجھ سے چھوٹ گئی تھی؛ بہت سے بہت کوئی دوسری زندگی از سرِ نو شروع کر سکوں گا۔ اُس سابقہ زندگی کی تفاصیل کے بارے میں مجھے کوئی جوش و خروش نہیں محسوس ہوتا تھا، سوائے ترکوں اور اپنی غلامی کے سالوں کی بابت ایک دو کتابوں کی خاطر جن کو لکھنے کا کبھی منصوبہ بنایا تھا۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ خوجہ میرے ساتھ حقارت سے شاید اس لیے پیش آتا ہے کہ اسے معلوم ہے میں بے وطن اور بے مقصد ہوں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں کمزور ہوں، اور بعض اوقات مجھے اس کے یہ جاننے کی بابت بھی شک ہوتا۔ ہر روز وہ سلطان کو جو کہانیاں سنائی ہوتیں ان سے، اور اس ناقابلِ یقین ہتھیار کے پیکر اور اس کی کامیابی سے جو وہ خواب میں دیکھتا اور کہتا کہ یہ سلطان کا دل ضرور جیت لیں گے، اس قدر نشے میں ہوتا کہ میرے خیالات کا شاید احساس تک نہ کرتا۔ میں خود کو خوجہ کی اس مطلقاً اپنے میں مگن آسودگی کو رشک سے دیکھتے ہوئے پکڑتا۔ مجھے اس سے محبت تھی، مجھے اس غیر حقیقی سرشاری سے جو اسے اپنے مبالغہ آمیز احساسِ فتح سے حاصل ہوتی تھی، غیر مختتم منصوبوں سے، اور اس کے یہ کہنے کے انداز سے کہ کوئی دم جاتا ہے وہ سلطان کو شیشے میں اتار لے گا، محبت تھی۔ میں نے کبھی یہ اعتراف نہ کیا ہوتا، خود اپنے سے بھی نہیں، کہ ایسے ہی خیالات مجھے بھی آتے تھے، لیکن جب میں اس کی

Scanned with CamScanner

حرکات کا تعاقب کرتا، اس کے روزمرہ کے افعال کا، تو اس احساس سے مغلوب ہو جاتا کہ میں خود اپنا ہی مشاہدہ کر رہا ہوں۔ کسی طفل، کسی نوجوان کو دیکھتے ہوئے، آدمی کو کبھی خود اپنی طفولیت اور شباب نظر آتا ہے، اور وہ اُسے محبت اور تجسس سے دیکھتا ہے: مجھے محسوس ہونے والا خوف اور تجسس بھی اسی نوعیت کا تھا؛ مجھے اکثر یاد آتا کہ اس نے کس طرح میری گدی دباتے ہوئے کہا تھا: ''میں، تم بن گیا ہوں''، لیکن جب میں نے اسے وہ دن یاد دلائے، تو خوجہ میری بات کاٹ کر ان سب باتوں کا ورد شروع کر دیتا جو اس دن اس نے سلطان سے اس ناقابل یقین ہتھیار پر یقین کرا لینے کے لیے کہی ہوتیں، یا تفصیل سے یہ بتانے لگتا کہ اس صبح اس نے حاکم کے خواب کی تعبیر کرتے ہوئے کس طرح اس کے ذہن کو رغبت دلائی۔

میں خود بھی ان کامیابیوں کی زیرکی پر یقین کر لینا چاہتا تھا جو اس کے بیان میں اس قدر شیریں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی یوں ہوتا کہ، اپنی شترِ بے مہار فسوں کاریوں کے بہاؤ میں، میں خوشی خوشی اس کی جگہ لے لیتا اور ان پر، فی الواقع، یقین کرنے لگتا۔ پھر میں اس سے اور اپنے سے محبت کرنے لگتا، ہم دونوں سے، اور کسی سادہ لوح کی طرح جس کا منھ پریوں کی کسی ہوش ربا کہانی کو سنتے وقت کھلا کا کھلا رہ گیا ہو، جو وہ کہہ رہا ہوتا اسے سننے میں مستغرق، میں یہ یقین کرنے لگتا کہ وہ ان آنے والے دنوں کا جو دنگ کر دینے والے تھے ایسے مقصد کے طور پر ذکر کر رہا ہے جس کا تعاقب ہم ساتھ ساتھ کریں گے۔

تو اس طرح میں سلطان کے خوابوں کی تعبیر کرنے میں اس کا شریک بنا۔ خوجہ نے اکیس سالہ حاکم کو حکومت پر اپنا زیادہ سے زیادہ تسلط جمانے پر اکسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان اکیلے گھوڑوں کی جو اسے اکثر اپنے خوابوں میں دیوانہ وار سرپٹ دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے یہ تفسیر کی کہ وہ اداس ہیں کیونکہ ان پر کوئی سوار نہیں؛ اور یہ کہ وہ بھیڑیے، جنھوں نے اپنے شکار کے حلقوم میں اپنے دانت گڑوئے ہوئے تھے، خوش ہیں کیونکہ خود کفیل ہیں؛ کہ گریہ کناں بوڑھی عورتیں اور حسین نابینا لڑکیاں اور درخت جو سیاہ بارشوں میں اپنے پتوں سے ننگے ہو گئے تھے اسے مدد کے لیے پکار رہے تھے؛ کہ مقدس عنکبوت اور پُرغرور شکرے خود مختاری کے گنوں کا علم ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ سلطان اپنی حکومت پر قبضہ جمانے کے بعد ہماری سائنس میں دلچسپی لے؛ اور اس مقصد کے واسطے ہم نے اس کے خوابوں سے بھی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ طویل، تھکا دینے والے شکاری دھاووں کی راتوں کے دوران سلطان، بہت سوں کی طرح جن کو شکار سے عشق ہوتا ہے، یہ خواب دیکھتا کہ شکار وہ خود ہے، یا، اس ڈر سے کہ ہاتھ سے تخت نہ

جاتا رہے، اپنے کو ایک طفل کی جون میں تخت نشیں دیکھتا، اور خوجہ اس کی یہ تاویل کرتا کہ تخت پر وہ سدا جوان رہے گا، لیکن صرف ہمارے ہمہ وقت چوکنے دشمنوں کے ہتھیاروں سے برتر ہتھیار بنا کر ہی ان کی دھوکا دہی سے مامون رہ سکے گا۔ سلطان نے خواب دیکھا کہ اس کے دادا سلطان مراد نے اپنی بہادری کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنی تلوار کے محض ایک ہی وار سے ایک گدھے کو اتنی پھرتی سے دولخت کر دیا کہ دونوں لخت سرپٹ دوڑتے ہوئے ایک دوسرے سے دور ہو گئے؛ کہ بدزبان اور بداطوار عورت، اس کی دادی، جس کا نام کوسم سلطانہ تھا، اپنی قبر سے اس کا اور اس کی ماں کا گلا گھونٹنے کے لیے باہر نکل آئی ہے اور الف ننگی اس پر جھپٹی ہے؛ کہ تماشا گھر میں چیڑ کے درختوں کے بجائے انجیر کے درخت ہیں جن سے پھلوں کی جگہ لاشیں لٹکی ہیں؛ کہ شرانگیز لوگ جن کے چہرے اس سے ملتے جلتے ہیں اس کا تعاقب کر رہے ہیں تاکہ اسے بوروں میں دھکیل کر اس کا دم گھونٹ دیں؛ یا کہ اپنی پشتوں پر موم بتیاں اٹھائے، جو ہوا کے باوجود کسی وجہ سے گل نہیں ہو رہی ہیں، کچھوؤں کا ایک لاؤلشکر اوسکدار کی جانب سے سمندر میں داخل ہوا اور اب سیدھا محل کی طرف چلا آ رہا ہے، اور ہم نے ان خوابوں کی تفسیر کرنے کی کوشش کی، جنھیں میں نے بڑے صبر اور بہجت کے ساتھ ایک کتاب میں نقل کیا اور ان کی درجہ بندی کی، تاکہ سائنس اور اس ناقابلِ بیان ہتھیار کا بھلا ہو سکے جس کو ضرور بننا چاہیے، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ درباری کس قدر غلط ہیں جو یہ سرگوشیاں کرتے پھرتے ہیں کہ سلطان حکومتی امور سے غفلت برتتا ہے اور اس کے سر میں شکار اور جانوروں کے سوا کچھ نہیں۔

بقول خوجہ ہم اس پر بتدریج اثرانداز ہو رہے تھے، لیکن مجھے اپنے کامیاب ہونے پر اب اور یقین نہیں رہا تھا کہ ایک نئے ہتھیار یا رصدگاہ یا سائنس گھر کے قیام کی بابت جو وعدہ اس نے خوجہ سے کیا تھا وہ وفا ہو گا، اور راتوں کے مسلسل جاگنے کے بعد جن میں وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ نئے منصوبوں کے خواب دیکھتا، مہینے گزر جاتے اور وہ ان موضوعات کا سلطان کے سامنے کبھی ذکر بھی نہ چھیڑتا۔ طاعون کے ایک سال بعد، جب وزیرِاعظم کپرولو کا انتقال ہوا، خوجہ کو امید باندھنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا: خوجہ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں سلطان کے تامل کی وجہ کپرولو کے اقتدار اور شخصیت کا خوف تھا، اور اب جبکہ وزیرِاعظم مر چکا ہے اور اس کی جگہ اس کے بیٹے نے، جو باپ کے مقابلے میں کمزور تھا، سنبھال لی ہے، سلطان سے جرأت مندانہ اقدامات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

لیکن ہم اگلے تین سال تک بس ان کا انتظار ہی کرتے رہے۔ جو چیز اب مجھے ہکا بکا کیے دے رہی تھی وہ سلطان کی بے عملی نہیں تھی، جو اپنے خوابوں اور شکاری مہمات کی چکا چوند سے چندھیا گیا تھا، بلکہ یہ خیال کہ خوجہ نے اپنی امیدیں ہنوز اس پر ثبت کی ہوئی ہیں۔ یہ تمام سال میں اس دن کا انتظار کرتا رہا تھا جب وہ امید سے دست کش ہو کر ٹھیک مجھ جیسا بن جائے گا! ہر چند وہ اب ''فتح'' کا اتنا زیادہ ذکر نہیں کرتا تھا جتنا پہلے، نہ اپنی روح میں اتنی بالیدگی ہی محسوس کرتا تھا جتنی طاعون کے بعد کے مہینوں کے دوران، تاہم وہ ہنوز اپنے اس خواب کو زندہ رکھے ہوئے تھا کہ ایک نہ ایک دن سلطان کو اپنے ''عظیم الشان منصوبے'' کے ضمن میں شیشے میں اتار لے گا۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ہمیشہ ہی تراش لیتا: اس عظیم آتش زدگی کے فوراً بعد، جس نے پورے استنبول کو ملبے کا ڈھیر بنا ڈالا تھا، اگر سلطان عظیم الشان منصوبوں میں فراخ دلی سے پیسہ لگاتا تو اس سے اس کے دشمنوں کو اس کے بھائی کو تخت نشیں کرنے کی ساز باز کا موقع مل جاتا؛ سلطان کے ہاتھ فی الوقت اس لیے بندھے ہوئے تھے کہ فوج بن قوم کے خلاف مہم پر گئی ہوئی تھی؛ اگلے سال ہم جرمنوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کرنے کے متوقع تھے؛ پھر یہ کہ گولڈن ہورن کے کنارے پر نئی والدے مسجد کی تکمیل بھی باقی تھی جہاں خوجہ حاکم اور اس کی ماں ترخان سلطانہ کے ساتھ اکثر جایا کرتا تھا، اور جس کی تعمیر پر ایک خطیر رقم خرچ کی جا رہی تھی؛ اور وہ غیر مختتم شکاری مہمات جن میں میں شریک نہیں ہوتا تھا ان پر مستزاد۔ خوجہ کے شکار سے لوٹنے کے انتظار میں، میں گھر میں پڑا پڑا اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی غرض سے اس ''عظیم الشان منصوبے'' اور ''سائنس'' کے حق میں نت نئے درخشاں خیالات پیدا کرنے کی کوشش کرتا، اور اس کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے کاہلی سے اونگھنے لگتا۔

ان منصوبوں کے دن سپنے دیکھنے سے بھی اب میرا دل نہیں بہلتا تھا؛ مجھے اس کی پروا بھی نہیں رہی تھی کہ اگر یہ کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے تو ان سے کیا نتائج حاصل ہوں گے۔ خوجہ کو اتنی ہی اچھی طرح معلوم تھا جتنی اچھی طرح مجھے کہ ان سالوں کے دوران جب ہم نے پہلے پہل ایک دوسرے کو جانا تھا، فلکیات، جغرافیہ، حتیٰ کہ طبعی سائنس کے بارے میں ہمارے خیالات کی کوئی بنیاد نہیں تھی؛ گھڑیوں، آلات اور نمونوں کو کونے میں ڈال کر بھلا دیا گیا تھا اور وہ زمانے سے پڑے پڑے زنگ پکڑنے لگے تھے۔ ہم نے ہر چیز کو اس وقت پر اٹھا رکھا تھا جب ہم اس مبہم چیز کا جسے وہ ''سائنس'' کہتا تھا، شغل کریں

گے؛ ہماری گرفت میں کوئی عظیم الشان منصوبہ نہیں تھا جو ہمیں برباد ہونے سے بچائے گا بلکہ کسی ایسے منصوبے کا بس خواب ہی۔ اس بے کیف طلسم خیال پر یقین کرنے کے لیے، جو مجھے فریب دینے میں بالکل ناکام رہا تھا، اور خوجہ کے ساتھ بھائی چارہ محسوس کرنے کے لیے، میں بعض اوقات صفحے پلٹتے ہوئے انھیں اس کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا، یا خیالات کے ذہن میں الل ٹپ آتے وقت خود کو اس کی جگہ رکھتا۔ جب وہ شکار سے واپس آ چکا ہوتا تو میں یہ ظاہر کرتا کہ اس موضوع سے متعلق جو وہ میرے پاس سر مارنے کے لیے چھوڑ گیا تھا ایک نیا نکتہ دریافت کر لیا ہے، اور اس نکتے کی روشنی میں ہم ہر چیز کی کایا پلٹ کر رکھ دیں گے؛ جب میں کہتا، ''سمندر کے اتار چڑھاؤ کا تعلق اس میں خالی ہونے والے دریاؤں کی حدت پر ہے،'' یا، ''طاعون ہوا میں چکراتے ہوئے ننھے ننھے ذروں کے ذریعے پھیلتا ہے، اور تبدیلی موسم کے ساتھ کوچ کر جاتا ہے،'' یا، ''زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور سورج چاند کے گرد،'' تو خوجہ اپنی گرد آلود شکاری پوشاک تبدیل کرتے ہوئے، ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا، اور مجھے محبت سے مسکرانے پر مجبور کر دیتا: ''اور یہاں کے احمق اتنا بھی نہیں سمجھتے!''

پھر وہ طیش میں پھٹ پڑتا جو مجھے بھی اپنی زد میں لے آتا، گھنٹوں ہذیان بکتا رہتا کہ کس طرح حاکم ایک حواس باختہ سؤر کا تعاقب کرتا رہا، اور ایک خرگوش پر جسے اس کے گرے ہاؤنڈ دبوچ لائے تھے آنسو بہانا اس کے واسطے کتنی احمقانہ بات تھی، یہ اعتراف کرنا کہ وہ سب جو اس نے سلطان سے شکار کے دوران کہا تھا کس طرح اس کے ایک کان میں داخل ہوتا اور دوسرے کان سے خارج، اور بار بار تلخی سے پوچھتا کہ آخر کب ان احمقوں کو حقیقت کا احساس ہوگا۔ کیا اتنے بہت سے احمق ایک ہی جگہ محض اتفاق سے جمع ہو گئے ہیں یا یہ ناگزیر تھا؟ وہ کیوں اس قدر احمق ہیں؟

چنانچہ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ اسے اس چیز سے جسے وہ ''سائنس'' کہتا ہے از سرِ نو آغاز کرنا چاہیے، اس باران کے دماغوں کی فطرت جاننے کے لیے۔ چونکہ اس سے میرے ان محبوب دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جب ہم ایک ہی میز کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور باہمی حقارت کے باوجود کس قدر ایک دوسرے کے مشابہ تھے، میں اس ''سائنس'' پر کام شروع کرنے کے لیے اتنا ہی گرم جوش تھا جتنا خوجہ، لیکن چند ابتدائی کوششوں کے بعد ہم جان گئے کہ اشیا پہلے جیسی نہیں رہی ہیں۔

سب سے پہلے، چونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے کیسے شہ دوں یا کیوں دوں، میں اس پر دباؤ

Scanned with CamScanner

نہیں ڈال سکا۔ اہم تر یہ کہ اس کی اذیتیں اور شکستیں مجھے خود اپنی محسوس ہونے لگیں۔ ایک موقعے پر میں نے یہاں کے لوگوں کے حُمق کی بابت اس کی یاددہانی کرائی، اس حُمق کی مبالغہ آمیز مثالیں دیں، اور یہ محسوس کرایا کہ انھی کی طرح اس کا مقسوم بھی ناکامی ہی ہے — گو مجھے اس پر یقین نہیں تھا — اور پھر اس کے ردِعمل کا مشاہدہ کیا۔ حالانکہ اس نے مجھ سے سخت اختلاف کیا، بولا کہ اگر ہم اول کام کریں اور اس کام کے لیے خود کو وقف کردیں تو ناکامی ناگزیر نہیں — اگر، مثال کے طور پر، ہم اس ہتھیار والے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں، تو اب بھی تاریخ کے دریا کے بہاؤ کا رخ موڑ سکتے ہیں جو ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے — اور اس کے باوجود کہ اس نے ''اپنا'' نہیں، جیسا کہ وہ مایوسی کے وقت کرتا تھا، بلکہ ''ہمارا'' منصوبہ کہہ کر میرا دل خوش کیا، اسے اٹل شکست کے قریب آنے کا خوف بھی دامن گیر تھا۔ میں نے اس کا تصور ایک یتیم بچے کے طور پر کیا، مجھے اس کے طیش اور افسردگی سے الفت تھی کہ یہ مجھے اپنی غلامی کے اولین سالوں کی یاد دلاتے تھے؛ اور میں اس جیسا ہی ہونا چاہتا تھا۔ جب وہ کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے باہر غلیظ، کیچڑ سے لت پت سڑکوں کو تاریک بارش میں یا دھلے دھلائے ٹمٹماتے چراغوں کو گولڈن ہورن کے ساحل پر ایک دو گھروں میں ہنوز فروزاں دیکھ رہا ہوتا، جیسے وہاں کسی نئی علامت کا متلاشی ہو جس سے اپنی امیدیں وابستہ کرسکے، تو یوں محسوس ہوتا کہ کمرے کے اندر اذیت ناکی سے چہل قدمی کرنے والا خوجہ نہیں ہے بلکہ خود میری جوانی۔ وہ شخص، جو کبھی میں ہوا کرتا تھا، مجھے چھوڑ کر جاچکا ہے، اور کونے میں پڑا اونگھنے والا میں بڑی رقابت سے اس شخص کا تمنائی ہے، جیسے میں اس میں اپنے گم گشتہ جوش وخروش کی بازیافت کرسکتا ہوں۔

لیکن یہ بھی ہے کہ انتہائے کار میں اس جوش وخروش سے ہی تنگ آ گیا جو کبھی بھی اپنی افزائشِ نو سے نہیں تھکتا تھا۔ شاہی منجم بننے کے بعد خوجہ کی گیبزے والی املاک میں اضافہ ہوگیا تھا اور ہماری آمدنی بھی بڑھ گئی تھی۔ بس سلطان سے کبھی کبھار گپ شپ کے علاوہ اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً ہم گیبزے جاتے، شکستہ ملوں اور دیہاتوں کی سیر کرتے جہاں سب سے پہلے ہمارا استقبال کرنے والے بھیڑوں کے رکھوالے کتے ہوتے، آمدنی کی جانچ پڑتال کرتے، اور حساب کتاب کی چھان پھٹک کرکے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ نگراں نے ہمیں کس قدر غچہ دیا ہے۔ ہم حاکم کی تفریحِ طبع کے واسطے رسالے لکھتے، کبھی ہنستے ہوئے، لیکن زیادہ تر اکتاہٹ سے ریں ریں کرتے

ہوے، اور بس یہی کام رہ گیا تھا۔ اور اگر میں اصرار نہ کرتا تو غالباً وہ ان وقفوں کا بھی انتظام نہ کرتا جن میں دنوں بے کار وقت گزاری کے بعد ہم عطر بیز طوائفوں کے درمیان جا پسرتے۔

جس بات نے اس کے ہاتھ پاؤں اور زیادہ پھلا دیے وہ یہ تھی کہ سلطان نے لشکر کی عدم موجودگی سے حوصلہ پا کر اور پاشاؤں کے جرمن مہم یا کریٹن کے فوجی قلعے پر چڑھائی کے واسطے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے، اور اس بات سے کہ اب اس کی والدہ اس کو اپنا کہا سننے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، پھر اپنے اردگرد ان بک بکی لال بجھکڑوں، مسخروں اور بہروپیوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا جنھیں پہلے محل بدر کر دیا گیا تھا۔ اپنے کو ان جعل بازوں سے ممتاز رکھنے کی خاطر جن سے اسے نفرت اور بیزاری تھی اور جن سے اپنی برتری منوانا چاہتا تھا، خوجہ نے ان سے میل جول نہ رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا، لیکن جب حاکم اصرار کرتا تو ان سے گفتگو کرنے اور ان کی بحث بحثی کو سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔ ان محفلوں میں ان سوالوں پر بحث کرنے کے بعد کہ جانور ذی روح ہوتے ہیں یا نہیں، اگر ہوتے ہیں تو ان میں سے کون سے جنت میں جائیں گے اور کون سے جہنم رسید ہوں گے، کہ گھونگے نر ہوتے ہیں یا مادہ، ہر صبح طلوع ہونے والا آفتاب نیا آفتاب ہوتا ہے یا محض وہی آفتاب جو دوسری طرف صبح غروب ہوتا ہے، وہ مستقبل سے مایوس ہو کر وہاں سے نکلتا، اور کہتا کہ اگر ہم نے کوئی اقدام نہیں کیا تو سلطان جلد ہی ہماری گرفت سے نکل جائے گا۔

چونکہ وہ ''ہمارے'' منصوبوں کے بارے میں بات کرتا، ''ہمارے'' مستقبل کے بارے میں، میں راضی برضا اس کی ہاں میں ہاں ملاتا جاتا۔ ایک مرتبہ، یہ گرفت میں لانے کے لیے کہ سلطان کے ذہن میں کیا ہے، ہم نے ان نوٹ بکس کی ورق گردانی کی جن میں برسوں تک میں نے ہمارے خواب، ہماری یادیں قلمبند کی تھیں۔ جیسے ہم درازوں کی مشمولات کا شمار کر رہے ہوں، ہم نے حاکم کے دماغ کی مشمولات کی گنتی کر ڈالی؛ نتیجہ بالکل ہمت افزا نہیں نکلا؛ اگرچہ خوجہ اب بھی بڑے جوش کے ساتھ اس ناقابلِ یقین ہتھیار کی بابت مسلسل ٹرٹر کرتا جو ہمارا نجات دہندہ ثابت ہونے والا تھا، یا ان اسرار کو حل کرنے کے بارے میں جو ہنوز ہمارے دماغوں کے کونوں کھدروں میں پوشیدہ تھے، وہ اب اور یہ طرزِ عمل نہیں اختیار کر سکتا تھا جیسے اسے کسی ایسی تباہ کن شکست کی توقع نہ ہو جو قریب تر آ رہی ہو۔ اس موضوع پر مہینوں بحث کر کے ہم نے خود کو ہلکان کر لیا۔

Scanned with CamScanner

کیا ''شکست'' سے ہم یہ مطلب نکالتے تھے کہ سلطنت ایک ایک کر کے اپنے جملہ مملوکہ علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گی؟ ہم اپنے نقشے میز پر پھیلا دیتے اور سوگواری سے تعین کرتے، کون سا علاقہ سب سے پہلے گرفت سے نکلے گا، پھر کون سے پہاڑ یا دریا۔ یا شکست کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد غیر محسوس طور پر تبدیل یا متغیر ہو جائیں گے؟ ہم تصور کرتے کہ ہوسکتا ہے استنبول میں ہر کس ایک صبح اپنے گرم گرم بستر سے ایک بدلے ہوئے شخص کی جون میں اٹھے گا: کپڑے کیسے پہننے چاہئیں یہ اسے نہیں معلوم ہوگا، اور نہ یہ یاد ہوگا کہ میناروں کا کیا مصرف ہے۔ یا شاید شکست کا مطلب دوسروں کی برتری کا اقرار اور ان کے اوصاف میں ان کی برابری کرنا تھا: پھر وہ میری وینس کی زندگی کی کوئی واردات دہراتا، اور ہم تصور کرتے کہ یہاں ہمارے واقف کار کس طرح اپنے سروں پر غیر ملکی ہیٹ منڈھ کر اور ٹانگوں پر پتلونیں چڑھا کر میرے تجربات کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

آخری چارۂ کار کے طور پر، ہم نے سلطان کو اپنے وہ خواب پیش کرنے کا فیصلہ کیا جن کی اختراع کے دوران ہم وقت کے گزران کو فراموش کر دیتے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ شکست خوردگی کے یہ رؤیا، جنھوں نے ہماری فنطاسیوں کے شوخ رنگوں میں زندگی پائی تھی، شاید اسے عمل پیرا ہونے کی ترغیب دلا سکیں۔ چنانچہ، پرسکوت، اندھیری راتوں میں، ہم نے ایک پوری کتاب ان تمام مکاشفوں سے بھر دی جو شکست اور ناکامی کی فنطاسیوں سے جنھیں ہم نے ایک افسردہ، یاس بھری مسرت کے ساتھ ایجاد کیا تھا امڈے پڑتے تھے: وہ سرخمیدہ مفلسین، کیچڑ سے سَنی شاہراہیں، عمارتیں جنھیں نیم مکمل ہی چھوڑ دیا گیا تھا، تاریک، اجنبی سڑکیں، اس بات کی منت سماجت کرتے ہوئے لوگ کہ ہر شے ویسی ہی ہو سکے جیسی پہلے ہوا کرتی تھی، اس حال میں کہ لبوں پر وہ دعائیں ہوتیں جن کے مطلب سے وہ ناآشنا تھے، محزوں مائیں اور باپ، رنجیدہ آدمی جن کی زندگیاں اتنی کوتاہ تھیں کہ وہ سب جو دوسری سرزمینوں پر حاصل اور تحریری طور پر محفوظ کیا گیا تھا ہم تک پہنچا سکیں، مشینیں جو بے کار پڑی تھیں، روحیں جن کی آنکھیں ماضی کے خوشگوار دنوں کے غم بے سے پرنم تھیں، آوارہ گرد کتے جو محض کھال اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئے تھے، گاؤں والے جن کے پاس اپنی زمین نہیں تھی، بے ٹھکانہ لوگ جو شہر بھر میں جہاں تہاں دیوانہ وار گھومتے پھر رہے تھے، جاہل مسلمان جو پتلون پہنے ہوئے تھے اور تمام جنگیں جن کا انجام شکست تھا۔ میری مدھم پڑتی یادوں کو ہم نے کتاب کے ایک الگ حصے میں درج کیا: وینس میں میری ماں، باپ، بھائیوں اور

Scanned with CamScanner

بہنوں کے ساتھ میرے اسکول کے زمانے کے پر مسرت اور سبق آموز تجربات کے چند مناظر: جو ہمیں فتح کریں گے، اس طور زندگی گزاریں گے، اور ہمیں لازم ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے پہلے خود کوئی عملی قدم اٹھائیں اور ان کے حریف ہوں! تتمے میں، جسے ہمارے چپ دست کاتب نے نقل کیا، ایک موزوں شعر تھا جس میں بے ترتیب درازوں والی الماری کے استعارے سے فائدہ اٹھایا گیا تھا جو خوجہ کو بے حد مرغوب تھا، اور جسے ایک دروازہ سمجھا جا سکتا تھا جو ہمارے اذہان میں جاگزیں پیچیدہ اسرار کے تاریک معمے پر کھل رہا ہو۔ اس شعر کی نفیس، بڑی باریک بافتہ دھند کی گرفت میں، جو اپنے مخصوص شکوے اور خاموشی کی حامل تھی، ان تمام کتابوں اور رسالوں کا پُر ملال جوہر آ گیا تھا جو میں نے خوجہ کے ساتھ مل کر تحریر کی تھیں۔

خوجہ کے اس کتاب کو پیش کرنے کے ایک ماہ بعد، سلطان نے ہمیں اس ناقابلِ یقین ہتھیار پر کام شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے حکم سے ہمارے اوسان خطا ہو گئے، اور ہم کبھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ہماری کامیابی کا دارومدار کس حد تک اس کتاب پر تھا۔

۹

جب سلطان نے کہا، ''چلو یہ حیرت انگیز ہتھیار دیکھیں جو ہمارے دشمنوں کو تباہ کر دے گا،'' تو شاید وہ خوجہ کی چھیڑ خانی کر رہا ہو، شاید اس نے کوئی خواب دیکھا ہو جو خوجہ سے پوشیدہ رکھا ہو، شاید وہ اپنی مطلق العنان والدہ اور ان پاشاؤں کو جنھوں نے اس کا قافیہ تنگ کیا ہوا تھا یہ جتانا چاہتا ہو کہ وہ ''فلسفی'' جو اس نے پال رکھے ہیں کسی نہ کسی مصرف کے ضرور ہیں، شاید اسے خیال گزرا ہو کہ طاعون کے بعد خوجہ کوئی اور معجزہ کر دکھائے گا، شاید وہ فی الواقع شکست کے ان پیکروں سے متاثر ہوا ہو جن سے ہم نے اپنی کتاب بھر ماری تھی، یا شاید یہ سب ہمارے شکست کے پیکروں کا کیا دھرا نہ ہو بلکہ ان چند واقعی فوجی پسپائیوں کا جو اسے ہوئی تھیں جس نے اسے اس کھٹکے سے چوکنا کر دیا ہو کہ، جیسا کہ اسے خدشہ تھا، وہ لوگ جو اس کے بجائے اس کے بھائی کو تخت پر بٹھانے کے خواہاں تھے، اس کو تخت سے ہٹا دیں گے۔ ہم نے ان سارے امکانات پر حواس باختگی کے اس عالم میں غور کیا جب ہم اس بے پناہ آمدنی کا تخمینہ لگا رہے تھے جو گاؤوں، کارواں سرایوں، زیتون کے جھنڈوں سے ہونے والی تھی جو حاکم

نے ہمیں اس ہتھیار کی تیاری کے مصارف کے واسطے عطا کیے تھے۔

خوجہ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں صرف اپنی حیرانی سے ہی حیران ہونا چاہیے: کیا وہ جھوٹی تھیں، وہ تمام کہانیاں جو اس نے سال بہ سال سلطان کو سنائی تھیں، رسالے اور کتابیں جو ہم نے تالیف کی تھیں، کہ اب جبکہ سلطان ان پر یقین کرنے لگا ہے ہم کو سزاوار ہے کہ ان پر شک کریں؟ کچھ اور بھی تھا: حاکم کو ہمارے اذہان کی تاریکی میں کیا پیش آ رہا ہے اس پر تجسس ہونے لگا تھا۔ خوجہ نے بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ کیا یہ وہی کامیابی نہیں ہے جس کے لیے ہم اتنا طویل انتظار کرتے رہے ہیں۔

بالکل تھی، اور اس بار ہم نے ہمکاروں کی طرح کام شروع کیا؛ چونکہ نتیجے کی بابت میں اس کے مقابلے میں کم فکر مند تھا، میں بھی خورسند تھا۔ اگلے چھ سال، جن میں وہ ہتھیار کو وضع کرنے پر ڈٹا رہا، ہم مسلسل خطرے میں رہے۔ اس لیے نہیں کہ بارود سے کھیل رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ خود کو اپنے دشمنوں کے رشک کا ہدف بنا رہے تھے: کیونکہ ہر کس و ناکس ہمارے کامیاب یا ناکام ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا؛ اور ہم اس لیے بھی خطرے میں تھے کہ خود بھی انھی باتوں سے خوفزدہ تھے۔

اول اول تو ہم نے ایک پوری سردیاں محض میز کے پاس بیٹھ کر کام کرنے میں برباد کر دیں۔ ہم مشتعل اور گرم جوش تھے، لیکن ہاتھ میں سوائے ہتھیار کے خیال اور ان مبہم اور بے ہنگم تصورات کے کچھ اور نہیں تھا جو رہ رہ کے ہمارے ذہن میں یہ تصور کرتے وقت آتے کہ ہتھیار ہمارے دشمنوں کا کس بری طرح بھرکس نکال دے گا۔ بعد میں ہم نے کھلی فضا میں جا کر بارود کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ بالکل آتش بازی کے تماشوں کی تیاری والے ہفتوں کے طرح، اس بار بھی ہمارے کارندوں نے ہماری متعینہ مقدار میں مرکبات آمیز کیے، اور پھر ان میں محفوظ فاصلے سے دھماکا کیا جبکہ ہم بلند قامت درختوں کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں میں ہٹ آئے۔ انوکھی باتوں کے مشتاق لوگ صوتی اعتبار سے مختلف درجوں کے دھماکوں سے چھٹتے رنگین دھویں کو دیکھنے استنبول کے چاروں دانگ سے آئے۔ ہجومِ خلق نے اس میدان کو جہاں ہم نے اپنے خیمے نصب کیے تھے، اہداف، اور اپنی ڈھالی ہوئی کوتاہ اور لمبی نالی والی توپ جمائی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ میلے ٹھیلے کا میدان بنا ڈالا۔ گرما کے ختم پر ایک دن، سلطان بہ نفسِ نفیس پیشگی اطلاع دیے بغیر وہاں نمودار ہوا۔

ہم نے ایک تماشا خاص اس کے لیے کیا، ساری زمین اور آسمان کو دھماکے سے ہلا کر رکھ دیا؛

Scanned with CamScanner

ایک ایک کر کے کارتوس کے ڈبوں اور توپ کے گولوں کی جنھیں ہم نے بارود کے مختلف مرکبات سے خوب تیار کر رکھا تھا، نئی بندوقیں اور لمبی نالی والی توپیں جو ابھی نہیں ڈھالی گئی تھیں ان کے سانچوں کے خاکوں کی، مقررہ وقت پر چھٹنے والے میکانکی نظام جو لگتا کہ از خود دھماکا کر رہے ہوں ان سب کی نمائش کی۔ اس نے خوجہ سے زیادہ مجھ میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ شروع میں خوجہ نے مجھے سلطان سے دور رکھنا چاہا لیکن جب تماشا شروع ہو گیا اور سلطان نے دیکھا کہ جس کثرت سے خوجہ حکم صادر کر رہا ہے اتنی ہی کثرت سے میں بھی، کہ ہمارے کارندے میری طرف بھی اتنا ہی دیکھ رہے ہیں جتنا خوجہ کی طرف، تو اس کو تجسس ہوا۔

جب پندرہ سال میں دوسری بار مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا تو سلطان نے مجھے یوں دیکھا جیسے پہلے دیکھ چکا ہو لیکن فوری پہچان لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو آنکھیں بند کیے کوئی پھل چکھتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اس کی عبا کے پلو کو بوسہ دیا۔ یہ معلوم کر کے کہ میں یہاں بیس سال سے ہونے کے باوجود ابھی تک مسلمان نہیں ہوا ہوں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس کا ذہن تو کسی اور ہی چیز کی طرف لگا ہوا تھا۔ ''بیس سال؟'' اس نے کہا، ''کتنی عجیب بات ہے!'' پھر اس نے اچانک مجھ سے وہ سوال پوچھا: ''کیا یہ تم ہو جو اسے یہ سب سکھا رہے ہو؟'' بہ ظاہر یہ اس نے میرا جواب معلوم کرنے کے لیے نہیں پوچھا تھا، کیونکہ وہ ہمارے پارہ پارہ خیمہ سے نکل چکا تھا جس سے بارود اور شورے کی بو آ رہی تھی، اور اپنے خوبصورت سفید گھوڑے کی طرف جا رہا تھا۔ ناگہانی وہ رکا، ہم دونوں کی طرف، جو ٹھیک اس وقت برابر برابر کھڑے تھے، مڑا اور اچانک یوں ہنس دیا جیسے اس نے لاثانی عجائب میں سے وہ عجوبہ دیکھ لیا ہو جسے خدا نے نسل آدمی کا گھمنڈ توڑنے کے لیے خلق کیا ہو، اپنی مہملیت کا احساس دلانے کے لیے — ایک کامل بونا یا دو جڑواں بھائی جو ایک ہی مٹر کی پھلی کے دو دانے ہوں۔

اس شب میں سلطان کی بابت سوچ رہا تھا، لیکن خوجہ کے حسبِ خواہش نہیں۔ وہ نہایت تنفر سے اس کا ذکر کرتا رہا، لیکن مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ میں نفرت اور حقارت نہیں محسوس کر سکوں گا: اس کی بے تکلفی نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، اس کی مٹھاس نے، پیار دلار سے بگڑے بچے کے اس انداز نے جو بلا روک ٹوک جو ذہن میں آیا کہہ بیٹھتا ہے۔ میں چاہتا تھا اس جیسا ہو جاؤں یا اس کا دوست بنوں۔

Scanned with CamScanner

خوجہ کے غصے میں پھٹ پڑنے کے بعد میں جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور یہ سوچتے ہوئے سونے کی کوشش کی کہ سلطان دھوکا دیے جانے کا مستحق نہیں؛ میں اسے سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بے کم و کاست تھا کیا؟

میری دلچسپی غیر متبادل نہیں رہی۔ ایک دن جب خوجہ نے بادلِ ناخواستہ کہا کہ اس صبح حاکم میری آمد کا بھی متوقع ہے، تو میں اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ یہ خزاں کا ایسا ہی دن تھا جس میں سمندر کی بوباس ہوتی ہے۔ ایک عظیم جنگل میں جو جھڑے ہوئے سرخ پتوں سے اٹا پڑا تھا ہم نے پوری صبح چیڑ کے درختوں کے سائے میں سوسن کے تالاب کے پاس گزاری۔ سلطان کلبلاتے مینڈکوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا جن سے پورا تالاب بھرا تھا۔ خوجہ اس کی تسکین کے لیے بالکل تیار نہیں تھا، اور بس چند پامال سے فقرے دہرا کر رہ گیا جن میں نہ رنگ تھا نہ ندرت۔ سلطان نے اس بدتہذیبی پر، جس نے مجھے شدید صدمہ پہنچایا، سرے سے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ اسے مجھ میں زیادہ دلچسپی تھی۔

تو میں نے مینڈکوں کی کود پھاند کے پیچھے کارفرما میکانیکی عمل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی، ان کے خون کے نظامِ گردش کے بارے میں، کس طرح جسم سے بہ احتیاط جدا کر دیے جانے کے بڑی دیر بعد تک بھی ان کے قلب کی دھڑکن جاری رہتی ہے، ان مکھیوں اور کیڑوں کے بارے میں جو ان کی غذا تھے۔ میں نے زیادہ وضاحت سے یہ دکھانے کے لیے کہ بیضہ کتنے مرحلوں سے گزر کر تالاب کا ایک پختہ مینڈک بنتا ہے، قلم اور کاغذ کی فرمائش کی۔ جب میں سینٹھے کے قلموں سے جو میرے لیے یاقوت جڑے قلمدان میں لائے گئے، تصویریں بنا تا رہا تو حاکم توجہ سے ان کا مشاہدہ کرتا رہا۔ مینڈکوں کی جو کہانیاں مجھے یاد تھیں اس نے بالکل بچّوں لطف کے ساتھ سنیں اور جب میں اس مقام پر پہنچا جو شہزادی کے مینڈک کو بوسہ دینے کے بارے میں تھا تو اس نے ابکائی سی لی اور برا سا منھ بنایا، تاہم وہ خوجہ کے بیان کردہ گاؤدی نوجوان جیسا بالکل نہیں لگا؛ بلکہ ایک سنجیدہ دماغ بالغ آدمی زیادہ نظر آیا جو اس بات پر مصر ہو کہ اس کے ہر دن کی ابتدا سائنس اور فن سے ہو۔ ان پرسکون گھڑیوں کے ختم پر، جن میں خوجہ تمام وقت ناک بھوں چڑھاتا رہا تھا، سلطان نے اپنے ہاتھ میں کی مینڈکوں کی تصویروں کو دیکھا اور بولا ''مجھے ہمیشہ یہی شک رہا ہے کہ ان کہانیوں کو گھڑنے والے مکھی ہو۔ تو تصویریں بھی تمھی نے بنائیں!'' اب اس نے مجھ سے مونچھ دار مینڈکوں کے بارے میں پوچھا۔

Scanned with CamScanner

تو اس طرح میرا تعلق سلطان سے پیدا ہوا۔ اب جب کبھی خوجہ محل جاتا تو میں بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ شروع شروع میں خوجہ کم ہی کچھ کہتا، سلطان سے زیادہ تر بات میں ہی کرتا۔ اس سے اس کے خوابوں، ولولوں، اس کے خوفوں، ماضی اور مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میں سوچتا کہ میرے سامنے جو خوش طبع، ذہین آدمی ہے وہ اس سلطان سے کس درجہ مشابہت رکھتا ہے جس کے بارے میں خوجہ سال بہ سال بات کرتا رہا ہے۔ ان برجستہ سوالوں سے جو وہ کرتا اور اس کی فراست سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ٹھیک جب سے ہم نے سلطان کو اپنی تصانیف پیش کی تھیں یہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا ہے کہ میں کس حد تک خوجہ ہوں اور خوجہ کس حد تک میں۔ جہاں تک خوجہ کا تعلق ہے، اس وقت وہ توپ اور لمبی نالیوں کو ڈھلوانے کی فکر میں اتنا زیادہ غلطاں تھا کہ اسے اس تخمین وظن سے، جو بہر کیف اس کے حسابوں نری حماقت تھی، کوئی سروکار نہیں تھا۔

توپ پر کام شروع کرنے کے چھ ماہ بعد خوجہ کے کان یہ جان کر کھڑے ہو گئے کہ شاہی امیرِ توپ خانہ اس بات پر تاؤ کھائے بیٹھا ہے کہ ان معاملات میں ہم کیوں ٹانگ اڑا رہے ہیں، اور اس نے مطالبہ کیا ہے کہ یا تو خود اسے اس کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے یا ہم جیسے پاگل احمقوں کو، جو توپ سازی کے فن کو اپنے اس خیال سے کہ کوئی نئی شے ایجاد کر رہے ہیں بدنام کر رہے ہیں، اور استنبول سے باہر نکال دیا جائے۔ لیکن خوجہ کسی قسم کے تصفیے پر آمادہ نہ ہوا، گو شاہی امیرِ توپ خانہ کسی سمجھوتے پر پہنچنے پر رضامند ضرور معلوم ہوا۔ ایک ماہ بعد، جب سلطان نے ہم سے ہتھیار کو کچھ اس طرح تیار کرنے کے لیے کہا کہ اس میں توپ کا گزر نہ ہو، تو خوجہ اس بات سے بہت زیادہ پراگندہ خاطر نہیں ہوا۔ اب ہم دونوں ہی کو پتا چل گیا تھا کہ جو نئی توپیں اور لمبی نالی کی توپ ہم نے ڈھلوائی تھی ان پرانی قسم کی توپوں سے جو برسہا برس سے استعمال ہو رہی تھیں، بہتر نہیں تھیں۔

تو بہ قول خوجہ ہم ایک اور نئے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے جس میں ہر شے کا نئے سرے سے تصور کرنا ضروری تھا، لیکن چونکہ اب میں اس کی برافروختگی اور اس کے خوابوں کا عادی ہو چلا تھا، میرے لیے اگر کوئی چیز نئی تھی تو یہ حاکم سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ اور سلطان کو ہماری صحبت پسند آتی تھی۔ کسی متوجہ باپ کی طرح جو گولیوں پر جھگڑتے ہوئے دو بھائیوں کو یہ کہہ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتا ہے کہ "یہ تمھاری ہیں، اور یہ تمھاری،" وہ ہمارے اندازِ تکلم اور برتاؤ کی بابت کوئی تبصرہ کر کے ہمیں ایک

دوسرے سے چھڑا دیتا۔ یہ تبصرے، جو کبھی بڑے عاقلانہ نظر آتے اور کبھی بچکانہ، مجھے پریشان کرنے لگے: مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ میری شخصیت مجھ سے کٹ کر الگ ہو گئی ہے اور خوجہ کی شخصیت سے جا ملی ہے، اور اس کے برعکس بھی ہوا ہے، اور دونوں میں سے کسی کو اس کا احساس تک نہیں، اور یہ کہ سلطان، اس خیالی مخلوق کو آنکتے ہوئے، ہمیں ہم سے بہتر طور پر جاننے لگا ہے۔

جب ہم اس کے خوابوں کی تعبیر کر رہے ہوتے، یا نئے ہتھیار سے متعلق گفتگو — اور اس وقت اس پر سر مارنے کے لیے ہمارے پاس صرف ہمارے خواب ہی تھے — حاکم یک بہ یک رک جاتا اور، ہم میں سے کسی ایک کی طرف رخ کر کے کہتا، ''نہیں، یہ تو اس کا خیال ہے، تمھارا نہیں۔'' اور بعض اوقات وہ ہمارے افعال میں تمیز کرتا: ''اب تم بالکل اس کی طرح ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہے ہو، اپنے طور پر دیکھو!'' میں حیرت کے مارے ہنس پڑتا تو وہ اپنی بات جاری رکھتا: ''ہاں، یہ بہتر ہے، شاباش۔ کیا تم دونوں نے کبھی خود کو ساتھ ساتھ آئینے میں نہیں دیکھا؟'' ایک موقعے پر اس نے حکم دیا کہ وہ تمام رسائل، bestiaries، اور تقاویم جو ہم نے اس کے واسطے سالوں تک تألیف کیے تھے باہر نکالی جائیں، اور بولا کہ جب پہلی مرتبہ اس نے انھیں پڑھا تھا، تو ایک کے بعد ایک صفحے الٹتے ہوئے اس نے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہم میں سے کس نے کون سا حصہ لکھا ہے، حتیٰ کہ کون سا حصہ ایک نے خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن یہ وہ بہروپیا تھا جسے وہ اس وقت طلب کرتا جب ہم اس کی حاضری دے رہے ہوتے جو خوجہ کو واقعی طیش دلا دیتا، اور مجھے لبھاتا جبکہ ساتھ ہی ساتھ مجھے حواس باختہ بھی کر دیتا۔

یہ شخص نہ چہرے مہرے اور نہ ہیئت میں ہم سے مشابہ تھا، وہ ٹھگنا اور فربہ تھا، اور اس کا لباس بالکل مختلف تھا، لیکن جب اس نے بولنا شروع کیا تو مجھے دھچکا لگا: لگتا تھا جیسے وہ نہیں، بلکہ خوجہ بول رہا ہو۔ خوجہ ہی کی طرح، وہ حاکم کے کان کی طرف جھکتا گویا کوئی راز سرگوشی میں بتا رہا ہو، خوجہ ہی کی طرح، دقیق نکتے بیان کرتے وقت اس کی آواز میں مصنوعی، متفکرانہ گمبھیرتا کا رنگ آ جاتا، اور اچانک، بالکل خوجہ کی طرح، جو کچھ بیان کر رہا ہوتا اس کے جوش میں بہہ جاتا، شوق کی سرشاری سے اپنے ہاتھ اور لہراتا تاکہ اپنے ہم سخن کو قائل کر دے اور خود حیرت و تحسین سے بے دم ہو جائے؛ لیکن ہر چند کہ وہ خوجہ کے لہجے ہی میں بات کر رہا تھا، اس نے وہ منصوبے بیان نہیں کیے جن کا تعلق ستاروں یا ناقابل یقین

ہتھیاروں سے تھا، اس نے تو صرف ان پکوانوں کا ہی شمار کیا جو اس نے محل کے باورچی خانے میں پکانے سیکھے تھے اور وہ اجزا اور مسالے جو انھیں تیار کرنے کے لیے ضروری تھے۔ اِدھر سلطان مسکراتا رہا، اُدھر اس نقال نے اپنا بہروپ جاری رکھا، یہی کہ ایک ایک کر کے استنبول اور حلب کے درمیان پائی جانے والی کارواں سرایوں کو گنا دے، جس سے خوجہ کا چہرہ الٹ پلٹ کر رہ گیا۔ پھر سلطان نے اس بھانڈ سے کہا کہ میری نقل اتارے۔ وہ آدمی جو حواس باختگی سے منھ پھاڑے مجھے گھور رہا تھا وہ میں تھا۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ جب حاکم نے اس سے کہا کسی ایسے شخص کی نقل اتارے جو نصف خوجہ ہو اور نصف میں، تو میں بالکل ہی سحر زدہ رہ گیا۔ اس آدمی کی حرکات کا مشاہدہ کرتے ہوئے، بے اختیارانہ، بالکل سلطان کی طرح، میرا بھی یہ کہنے کو جی چاہا: ''یہ میں ہوں، اور یہ خوجہ ہے،'' لیکن یہ تو خود بھانڈ نے باری باری ہم دونوں کی طرف اپنی انگلی کے اشارے سے کیا۔ سلطان نے نقال کی مدح وستائش کر کے اسے رخصت کرنے کے بعد، ہم نے جو دیکھا تھا اس پر غور و خوض کرنے کا حکم دیا۔

اس کا کیا مطلب تھا؟ اس شام جب میں نے خوجہ سے ذکر کیا کہ سلطان اس آدمی سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے جس کا نقشہ وہ میرے سامنے برسوں سے کھینچتا رہا ہے، اور کہا کہ جس سمت میں خوجہ اسے لے جانا چاہتا تھا سلطان نے وہ سمت پالی ہے، تو خوجہ ایک بار پھر طیش میں آ گیا۔ اس بار، میں نے محسوس کیا، اس کے پاس اس کا جواز تھا: نقال کے فن کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خوجہ نے کہا اب وہ دوبارہ محل میں قدم نہیں رکھنے کا، الّا یہ کہ مجبور کر دیا جائے۔ اس کی بالکل یہ نیت نہیں تھی، اب جبکہ وہ موقع جس کا وہ برسوں سے انتظار کرتا رہا ہے آخر کار اس کے ہاتھ آ گیا ہے، کہ ان الوؤں کے ساتھ وقت برباد کر کے مزید اپنی اہانت کرائے۔ اور چونکہ مجھے سلطان کی سرگرمیوں کا پتا ہے اور بھانڈ بننے کا یارا بھی رکھتا ہوں، اس کے بجائے محل میں ہی جاؤں۔

جب میں نے حاکم سے کہا کہ خوجہ علیل ہے، تو اسے یقین نہیں آیا۔ ''اسے ہتھیار پر کام کرنے دو،'' وہ بولا۔ چنانچہ ان چار سالوں میں جب خوجہ ہتھیار کے منصوبے اور اس کی تکمیل پر کام کرتا رہا، میں محل جاتا رہا اور وہ گھر میں اپنے خوابوں کے ساتھ رہا، جیسا کہ میں رہا کرتا تھا۔

ان چار سالوں میں میں نے سیکھا کہ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہیے، محض اسے جھیلنا نہیں۔ جن لوگوں نے سلطان کو میری تعظیم کرتے ہوئے دیکھا، جیسے خوجہ کی کیا کرتا تھا، تو جلد ہی محل میں آئے

دن ہونے والی تقاریب اور جشنوں میں مجھے مدعو کرنے لگے۔ کسی دن ایک وزیر کی بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے، اگلے دن حاکم کے یہاں ایک اور ولادت، اس کے بیٹوں کے ختنے کے جشن، ایک اور دن ہنگری کے کسی قلعے پر دوبارہ قبضہ کرنے کی خوشی، پھر شہزادے کے مکتب جانے کے پہلے دن کی رسوم اور تقاریب، اور رمضان اور دوسرے تہواروں کی خوشیاں۔ جلد ہی مرغن گوشت اور پلاؤ ٹھونسنے، اور شیروں، شتر مرغوں، اور جل پریوں کی شکل میں بنی شکر کی مٹھائیوں اور گری دار میووں کو جو دنوں کے لیے کافی ہوتے، ہڑپ کرنے سے میرا جسم پھول گیا۔ میرے وقت کا زیادہ حصہ کھیل تماشے دیکھنے میں گزرتا: پہلوان، جن کی جلد تیل سے چمکتی، جو جب تک بے ہوش نہ ہو جاتے زور آزمائی کرتے، یا مسجدوں کے میناروں کے درمیان بلندی پر تنے ہوئے تاروں پر چلنے والے نٹ اپنی کمر پر اٹھائے ہوئے ڈنڈوں کو ہوا میں اچھال اچھال کر لپکنے کا کرتب دکھاتے، نعلوں کی کیلوں کو اپنے دانت سے چبا کر پیس ڈالتے، اور اپنے جسم کو چاقوؤں اور سیخوں سے گودتے، یا ہاتھ کی صفائی دکھانے والے جو اپنی پوشاک میں سے سانپ، فاختائیں، اور بندر برآمد کرتے، ہمارے ہاتھوں میں کے قہوے کے فنجان اور ہماری جیبوں میں کے پیسے پلک جھپکتے میں غائب کر دیتے، یا نیم شفاف پردے کے پیچھے سے دکھائے جانے والے کاراگوز اور حاجیوت نامی پتلیوں کی پرچھائیوں کے تماشے جن کی فحشیات کا میں متوالا تھا۔ رات کے وقت، اگر کوئی آتش بازی کا تماشا نہ ہو رہا ہوتا، میں اپنے نت نئے دوستوں کے ساتھ، جن میں سے بیشتر سے اسی دن ملاقات ہوئی ہوتی، ان محلات یا حویلیوں میں سے کسی میں جاتا جہاں سبھی جاتے تھے اور راکی یا شراب پینے اور گھنٹوں تک موسیقی سننے کے بعد میں حسین رقاص لڑکیوں کے ساتھ جو غنودہ غزالوں کی ادائیں دکھاتیں، خوش رو لڑکوں کے ساتھ جو پانی پر چلتے، پرسوز گویّوں کے ساتھ جو حساس اور پرمسرت گانے گاتے، جام ٹکرا ٹکرا کر لطف اندوز ہوتا۔

میں اکثر سفیروں کی حویلیوں میں جاتا جو میرے بارے میں بے حد متجسس ہوتے، اور اپنے دلآویز بازو لہراتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کا محاکاتی رقص دیکھنے کے بعد، یا وینس سے بلائے گئے آرکسٹرا کی تازہ ترین پُر زعم خرافات سننے کے بعد، میں اپنی بتدریج بڑھتی ہوئی شہرت کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوتا۔ سفارت خانوں میں مجتمع یورپی مجھ سے ان دلدوز جوکھوں کی بابت پوچھتے جن سے میں گزرا تھا، اس پر حیرت کرتے کہ میں نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں، کیسے یہ سب جھیلا ہے، اور ان تمام باتوں کے

باوجود آخر کیسے اب بھی زندگی گزار رہا ہوں۔ میں یہ مخفی رکھتا کہ اپنی زندگی چہار دیواری میں اونگھتے ہوئے احمقانہ کتابیں لکھتے گزار رہا ہوں، اور اس انوکھی سرزمین کے بارے میں جو انھیں اس قدر بھاتی تھی وہ ناقابلِ یقین کہانیاں سنا دیتا جو میں نے فی البدیہہ گھڑنا سیکھ لیا تھا، جیسا کہ میں سلطان کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ صرف نوجوان لڑکیاں ہی نہیں، جو قبل از ازدواج اپنے باپوں کے سامنے ظاہر ہو رہی ہوتیں، اور سفیروں کی بیویاں جو مجھے پر چا رہی ہوتیں، بلکہ وہ تمام باوقار سفیر اور عہدے دار بھی میری گھڑی ہوئی مذہب اور تشدد کی خونیں کہانیوں اور عشق بازیوں اور حرم کی سازشوں کو تحسین و اشتیاق سے سنتے۔ اگر وہ زیادہ اصرار کرتے تو میں ایک دو ریاستی راز سرگوشیوں میں بتا دیتا یا سلطان کی عجیب و غریب عادات کا ذکر کر دیتا جن کے بارے میں سب لاعلم ہوتے اور جو وہیں کھڑے کھڑے میں نے تراشی ہوتیں۔ جب وہ اور زیادہ معلوم کرنا چاہتے، تو میں اس سکوت میں پناہ لیتا جو ان الوؤں کے تجسس کو اور بھڑکا دیتا جن کی تقلید خوجہ ہم سے کرانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن مجھے علم تھا کہ وہ باہم یہ کانا پھونسیاں کر رہے ہوتے کہ ہو نہ ہو میں کسی بہت بڑے اور پراسرار منصوبے میں ملوث ہوں جو سائنس پر کامل دست گاہ کا متقاضی ہے، کسی بعید از قیاس ہتھیار کا خاکہ جسے بے اندازہ رقم کی حاجت ہے۔

جب میں شام کے وقت ان حویلیوں، ان محلات سے لوٹتا، میرا ذہن اُن دیکھے ہوئے دلآویز جسموں کے پیکروں سے بھرا ہوا، اور ان تیز سیالوں کے بخارات سے جو میں نے چڑھائے ہوتے دھندلایا ہوا، تو خوجہ کو ہماری بیس سالہ پرانی میز کے پاس بیٹھا ہوا پاتا۔ اس نے خود کو اپنے کام میں اتنی شدت سے غرق کر دیا تھا کہ یہ اس سے پہلے میں نے اس میں کبھی نہیں دیکھی تھی، میز ایسے نمونوں سے بھری ہوتی جو میری سمجھ سے بالا تھے، خاکے، اوراق جو شدید مایوسی کے عالم میں گھسیٹی ہوئی تحریروں سے پُر ہوتے۔ وہ مجھ سے سارا دن جو دیکھا یا کیا ہوتا بیان کرنے کے لیے کہتا، لیکن جلد ہی وہ ان اشغال سے اکتا جاتا جو اسے شرمناک اور احمقانہ معلوم ہوتے، چنانچہ میری بات کاٹ کر اپنے منصوبے کو بیان کرنے لگتا، جس میں وہ ''ہم'' اور ''اُن'' کا ذکر کرتا۔

وہ پھر دہراتا کہ ہر چیز کا رشتہ ہمارے اذہان کے داخلی منظر سے ہے، اس نے اپنے تمام منصوبوں کی بنیاد اسی مفروضے پر رکھی ہے، اس نے بڑے جوش کے ساتھ کباڑ سے بھری خانے دار الماری کے، جسے ہم دماغ کہتے ہیں، توازن یا انتشار کی بابت گفتگو کی، لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ

Scanned with CamScanner

یہ کس طرح اس ہتھیار کو بنانے کا نیا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکے گا جس سے اس نے اپنی تمام امیدیں، ہماری تمام امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ مجھے شک تھا کہ کوئی بھی ــــ بہ شمول اس کے، میرے سابقہ خیال کے برخلاف ــــ اس کی تفہیم کے قابل ہو سکے گا۔ اس نے اعلان کیا کہ ایک دن کوئی ہمارے سروں کو کھول کر اس کے ان تمام خیالات کو سچا ثابت کر دکھائے گا۔ اس نے ایک عظیم صداقت کا ذکر کیا جس کا ادراک اس نے طاعون کے دنوں میں اُس وقت کیا تھا جب ہم مل کر آئینے میں اپنے پر غور و خوض کر رہے تھے: وہ سب اب اس کے ذہن میں واضح ہو گیا تھا، تم نے دیکھا، ہتھیار کی تخلیق صداقت کے اس لمحے میں ہوئی تھی! پھر وہ اپنی لرزتی انگلیوں کے سروں کے اشارے سے مجھے ــــ مجھے جو بلا سمجھے بوجھے سخت متاثر ہوا تھا ــــ کاغذ پر ایک عجیب اوٹ پٹانگ، مبہم اور غیر یقینی ہیئت دکھاتا۔

یہ ہیئت، جو ہر بار دکھائے جانے پر مجھے قدرے زیادہ اجاگر نظر آتی، کسی چیز کی یاد دلاتی محسوس ہوتی۔ اس سیاہ دھبے کو دیکھتے ہوئے جسے میں تصویر کا ''شیطان'' کہوں گا، میں اچانک یہ کہنے ہی والا ہوتا کہ یہ مجھے کس چیز کی یاد دلاتا ہے، لیکن ایک لحاتی تردد، یا اس سوچ کے باعث کہ میرا ذہن میرے ساتھ بازی گری کر رہا ہے، خاموش رہتا۔ ان چار سالوں کی مدت میں میں کبھی واضح طور پر اس ہیئت کو نہیں سمجھ سکا جو اس نے جانے کتنے صفحوں پر بکھیر رکھی تھی، اس کی ہر نئی نشوونما میں اس کے نقوش کو پہلے سے نسبتاً زیادہ وضاحت سے اجاگر کرتے ہوئے، اور جسے، سالہا سال کی جمع شدہ پونجی اور کوشش کے صرف کے بعد، وہ آخر کار زندگی بخش سکا تھا۔ بعض اوقات میں اسے ہماری روزمرہ کی زندگی کی اشیا سے تشبیہ دیتا، بعض اوقات ہمارے خوابوں میں نظر آنے والے پیکروں سے، ایک دو بار ان چیزوں سے بھی جو گزرے وقتوں میں ایک دوسرے سے اپنی یادوں کو بیان کرتے وقت نظر آتیں یا جن کے بارے میں ہم گفتگو کرتے، لیکن میں اپنے ذہن سے گزرنے والے ان پیکروں کی وضاحت کے لیے آخری قدم نہ اٹھا سکا، چنانچہ میں اپنے خیالوں کی ابتری کے آگے سپر انداز ہو کر بے سود اس کا انتظار کرنے لگتا کہ ہتھیار خود اپنے اسرار کی پردہ کشائی کرے گا۔ چار سال بعد بھی، جب وہ چھوٹا سا دھبا ایک اچنبھا مخلوق میں تبدیل ہو گیا، ایک عظیم مسجد کی طرح دراز قامت، ایک ہول دلانے والا آسیب جس کے تذکرے سے پورا استنبول ہمہمار رہا تھا اور جسے خوجہ بچ بچ کی جنگی مشین کے نام سے پکارتا، اور جب ہر کس و ناکس اسے جس تس چیز سے مشابہ قرار دے رہا تھا، میں ہنوز جو کچھ خوجہ نے مجھ سے ماضی میں کہا تھا کہ ہتھیار

کس طرح مستقبل میں ظفرمند ہوگا اس کی تفصیل میں گم تھا۔

ایک ایسے شخص کی طرح جو بیدار ہو رہا ہو اور ایک خواب کو یاد کرنے کی جدوجہد کر رہا ہو جسے حافظہ بڑی سختی سے بھلا دینے کا کوشاں ہو، میں محل پہنچنے پر یہ روشن اور دہشت ناک تفاصیل سلطان کے لیے دہرانے کی کوشش کرتا۔ میں ان پہیوں کا نقشہ کھینچتا، منجنیق، گنبد، بارود اور مشینی بیرم کا جن کی خدا جانے کتنی بار خوجہ نے میرے لیے زبانی تصویر کشی کی تھی۔ لفظ میرے نہیں ہوتے تھے، اور اگرچہ میرا بیان خوجہ کے خروش سے عاری ہوتا، تاہم میں دیکھتا کہ حاکم پر ان کا اثر ہو رہا ہے۔ اور میں بھی اس بات سے متاثر ہوے بغیر نہ رہتا کہ لفاظی کے اس مبہم طومار، خوجہ کی کامیابی اور نجات کی جوشیلی شاعری کی میری ان گھڑ ادائیگی سے اس آدمی میں، جسے میں سنجیدہ دماغ سمجھتا ہوں، امید کرنے کی تحریک پیدا ہو رہی ہے۔ حاکم کہتا کہ خوجہ، جو گھر بیٹھا تھا، میں ہوں۔ اس کی یہ دماغی بازیچہ گری میرے ذہن کو بڑے مکمل طور پر پراگندہ کر دیتی لیکن یہ اب مجھے چونکاتی نہیں تھی۔ جب وہ کہتا کہ میں خوجہ ہوں، تو میں اس منطق کو جاری رکھنے میں اس کی پیروی نہ ہی کرنے کو بہتر گردانتا، کیونکہ کوئی دم جاتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ بھی کرے گا کہ یہ ساری چیزیں میں نے ہی خوجہ کو سکھائی ہیں —— وہ کاہل الوجود میں نہیں جواب ہوں، بلکہ وہ میں جس نے زمانہ ہوا خوجہ کی کایاپلٹ کر رکھ دی تھی۔ اے کاش ہم صرف تفریحات کی باتیں کریں، جانوروں کی، ماضی کے تہواروں کی، یا تجار کے جلوس کی تیاریوں کی، میں نے سوچا۔ بعد میں سلطان نے کہا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہتھیار کے اس منصوبے کے عقب میں میں ہی ہوں۔

اور یہی وہ چیز تھی جو مجھے سب سے زیادہ خوفزدہ کر دیتی۔ برسوں سے خوجہ عوام میں نہیں دیکھا گیا ہے، وہ تقریباً بھلا دیا گیا ہے، یہ میں ہی ہوں جو محلات میں، شہر میں، اتنی کثرت سے حاکم کے پہلو میں نظر آتا ہے، اور اب لوگ مجھ سے بری طرح جلنے لگے ہیں! وہ میرے خلاف اپنے دانت کچکچا رہے ہیں، میں جو کافر ہوں، صرف اس لیے نہیں کہ اتنے بہت سے بھیڑوں کے گلوں، زیتون کے جھنڈوں، کارواں سرایوں کی آمدنی اس ہتھیار کے مبہم منصوبے میں، جس کے بارے میں وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ لاف گزاف کر رہے ہیں، پھنسی ہوئی ہے، صرف اس لیے نہیں کہ میں سلطان کا اتنا مقرّب ہوں، بلکہ اس لیے بھی کہ اس ہتھیار پر کام کر کے ہم دوسروں کے کاموں میں ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ جب میں ان کی بدگوئی کے خلاف اپنے کان بند کرنے سے عاجز رہتا تو خوجہ یا سلطان سے اپنے خدشات کا ذکر کر دیتا۔

Scanned with CamScanner

لیکن وہ کوئی ردعمل ظاہر نہ کرتے۔ خوجہ نے خود کو مکمل طور پر اپنے کام میں غرق کر لیا تھا۔ بوڑھوں کی طرح جو اپنے شباب کے دنوں کے جوش اور ولولے کی تمنا کرتے ہیں، میں بھی اس کے غصے کی آرزو کرتا۔ ان آخری ماہ جن میں اس نے کاغذ پر پھیلے ہوئے اس سیاہ اور مبہم دھبے کی تفاصیل کے ساتھ پرورش کی اور ایک مکروہ عفریت ڈھالنے کے سانچے کے خاکوں میں اس کی قلب ماہیت پر، ایسے سانچوں اور اتنے وزنی لوہے کو ڈھالنے پر جس کو گزند پہنچانے میں کوئی توپ کامیاب نہ ہو سکے ناقابل یقین رقم صرف کی، اس نے اس شرانگیز غپ شپ کو سننے کی زحمت بھی گوارا نہ کی جس سے میں نے اسے آگاہ کیا؛ اس نے صرف سفیروں کی حویلیوں میں دلچسپی کا اظہار کیا جہاں اس کے کام کے چرچے تھے: یہ سفیر کس قسم کے آدمی تھے، ان کا کیا خیال تھا، کیا اس ہتھیار کی بابت ان کی کوئی رائے تھی؟ اور سب سے زیادہ اہم: سلطان ان ملکوں میں ریاست کی نمائندگی کے واسطے وفد بھیج کر سفارت خانوں کے قیام کی بابت کبھی کیوں نہیں سوچتا؟ مجھے احساس ہوا کہ وہ یہ عہدہ اپنے واسطے چاہتا تھا، یہاں کے احمقوں سے فرار ہو کر ان لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اس خواہش کا کبھی برملا اظہار نہیں کیا، ایسے دنوں میں بھی نہیں جن میں وہ اپنے خاکوں کو کبھی بھی عملی جامہ پہنانے سے مایوس ہو جاتا، مثلاً اس وقت جب وہ لوہا جو اس نے ڈھالا تھا چٹخ گیا ہوتا، یا جب وہ ڈرتا کہ جلد ہی پیسہ ختم ہو جائے گا۔ بس ایک دو بار ہی اس کے منھ سے نکل گیا کہ وہ ''ان کے'' اہل سائنس سے تعلقات قائم کرنے کا خواہشمند ہے: شاید وہی اس صداقت کو سمجھ سکیں جو اس نے ہمارے اندرونِ دماغ کی بابت دریافت کی ہے: وہ وینس، فلانڈرز، یا جو کوئی بھی دور دراز کا ملک اس لمحے اسے یاد آیا اس کے اربابِ علم سے مراسلت کرنا چاہتا ہے۔ ان میں کے بہترین کون سے ہیں، کہاں رہتے ہیں، ان سے مراسلت کی کیا صورت نکلے، کیا میں سفیروں سے یہ معلومات حاصل کر سکتا ہوں؟ میں ان دنوں میں ہتھیار سے، جو انتہائے کار شرمندۂ تعبیر ہونے ہی والا تھا، بہت کم دلچسپی لیتا تھا اور خود کو عیش کوشی کے حوالے کیے ہوئے تھا، اس کی ان امیدوں کو، ان کی گرفتہ خاطری کے شائبوں کے باوصف جو ہمارے رقیبوں کے دل کو لبھانے کا باعث ہوتے، فراموش کرتے ہوئے۔

سلطان بھی ہمارے دشمنوں کی افواہوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ان دنوں میں جب خوجہ، جو ہتھیار کو آزمانے کے لیے تیار تھا، ایسے بہادر آدمیوں کا متلاشی تھا جو دھات کے اس ہیبت ناک انبار میں

Scanned with CamScanner

داخل ہو سکیں اور زنگ خوردہ لوہے کی دم گھونٹتی بساند میں اُڑن پہیوں کو گھما سکیں، سلطان نے ان افواہوں کی بابت میری شکایت کو سننے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔ اس نے، ہمیشہ کی طرح، مجھ سے کہا کہ خوجہ کی کہی ہوئی باتیں دہراؤں۔ اسے اس پر یقین تھا، وہ ہر چیز سے مطمئن تھا، اس پر اعتماد کرنے پر اسے ذرا بھی پچھتاوا نہ تھا: اور ان تمام باتوں کے لیے وہ میرا احسان مند تھا۔ اور ہمیشہ ہی اس وجہ سے: کیونکہ میں نے ہی ہر چیز خوجہ کو سکھائی تھی۔ خوجہ ہی کی طرح، وہ بھی ہمارے سروں کے اندرون کی بابت گفتگو کرتا؛ اور پھر وہ دوسرا سوال اٹھاتا جو اس کی اس دلچسپی سے مطابقت رکھتا تھا؛ جیسا کہ خوجہ نے خود کسی زمانے میں کیا تھا، سلطان مجھ سے پوچھتا کہ وہ اس ملک میں کس طرح رہتے ہیں، میرے سابقہ وطن میں۔

میں خوابوں سے اس کی تواضع کرتا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ کہانیاں، جن میں سے بیشتر پر اب میں خود یقین کرنے لگا ہوں کیونکہ اتنی بار انھیں دہرا چکا ہوں، وہ چیزیں تھیں جن کا تجربہ واقعی مجھے اپنی جوانی میں ہوا تھا یا یہ وہ مکاشفے تھے جو میرے قلم سے جب بھی میز پر اپنی کتاب لکھنے کے لیے بیٹھتا رواں ہو جاتے؛ بعض اوقات میں دو ایک کذب بیانیاں جو ذہن میں در آتیں ان کی آمیزش بھی کر دیتا تھا۔ میرے پاس کچھ حکایتیں تھیں جو بار بار دہرائے جانے کے سبب خاصی پھیل گئی تھیں، چونکہ حاکم نے اس تفصیل میں کہ لوگ جو لباس زیب تن کرتے تھے اس میں بٹنوں کی بھرمار ہوتی تھی دلچسپی کا اظہار کیا تھا، میں حتماً اسے دہراتا اور ایسی کہانیاں سناتا جن کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ ان کا تعلق میری یادوں سے تھا یا میرے خوابوں سے۔ لیکن ایسی چیزیں بھی تھیں جنھیں پچیس سال گزرنے کے بعد بھی میں ہنوز نہیں بھولا تھا، چیزیں جو حقیقی تھیں: وہ گفتگو جو میرے اور میرے والدین، اور بھائی بہنوں کے درمیان لیموں کے درختوں کے نیچے ناشتے کی میز کے گرد ہوئی تھی! یہ وہ تفاصیل تھیں جن سے سلطان کو کم سے کم دلچسپی تھی۔ اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ بنیادی طور پر ہر زندگی دوسری زندگی کی طرح ہی ہوتی ہے۔ کسی وجہ سے مجھے اس بات نے خوفزدہ کر دیا: سلطان کے چہرے پر ایک شیطانی تاثر تھا جو پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا، اور میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس سے اس کی کیا مراد ہے۔ جب میں اس کے چہرے کی طرف اندیشے سے دیکھ رہا تھا، مجھ میں یہ کہنے کی کہ ''میں میں ہوں'' ایک لہر سی اٹھی۔ یہ گویا یوں تھا، کہ اگر مجھے یہ لایعنی فقرہ کہنے کی جرأت ہو سکے تو میں افواہ پردازوں کے وہ سارے حربے مٹی میں ملا دوں گا جن کے ذریعے وہ میری کسی دوسرے میں کایا کلپ کرنے کی ساز باز کر رہے تھے، وہ دوسرا جس

Scanned with CamScanner

کا کردار خوجہ اور سلطان ادا کر رہے تھے، اور اپنی ذات میں پھر سے نہایت آسودہ خاطر رہ سکوں گا۔ لیکن ان لوگوں کی طرح جو کسی غیر یقینی بات کے محض ذکر ہی سے کوسوں دور بھاگتے ہیں کہ کہیں ان کی سلامتی خطرے میں نہ پڑ جائے، میں مارے خوف کے خاموش رہتا۔

یہ موسم بہار میں ہوا، ان دنوں میں جب خوجہ نے ہتھیار پر کام ختم کر لیا تھا لیکن اس کی آزمائش کرنے سے اس لیے قاصر رہا تھا کہ حسبِ ضرورت آدمیوں کی جماعت اکھٹی نہیں کر سکا تھا۔ اس کے فوراً بعد، ہمیں اس بات پر اچنبھا ہوا کہ حاکم فوج کے ساتھ پولینڈ کی مہم پر چلا گیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ یہ حرف آخر ہتھیار کیوں نہیں لے گیا تھا، مجھے کیوں نہیں لے گیا تھا، کیا اسے ہم پر اعتماد نہیں تھا؟ ان سبھوں کی طرح جنھیں استنبول ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا، ہم نے بھی یہی خیال کیا کہ سلطان جنگ پر نہیں بلکہ شکار کھیلنے گیا ہے۔ خوجہ اس بات پر خوش تھا کہ ایک اور سال اس کے ہاتھ آ گیا ہے؛ چونکہ میرے اشغال اور تفریح کے لیے کچھ باقی نہ رہا تھا، ہم دونوں ساتھ ساتھ ہتھیار پر کام میں جٹ گئے۔

مشین کو چلانے کے لیے آدمیوں کی بھرتی بڑے جوکھم کا کام ثابت ہوئی۔ کوئی بھی اس ہیبت ناک، پراسرار گاڑی کے اندر جانے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ خوجہ نے یہ بات پھیلا دی تھی کہ وہ اچھا معاوضہ دے گا، ہم نے ڈھنڈورچیوں کو شہر بھیجا، جہاز سازی کے کارخانوں اور توپوں کی ڈھلائی کے کارخانوں میں بھیجا، قہوہ خانوں کے نکموں میں مطلوبہ آدمیوں کو تلاش کیا، اور بے گھروں اور مہم جویوں میں۔ بیشتر آدمی جو ہم نے فراہم کیے، اگر وہ اپنے خوف پر غالب آ بھی گئے اور لوہے کے انبار کے اندر داخل ہو بھی گئے، جلد ہی رسا تڑا کر بھاگ نکلے، کہ ان میں گرمی میں تپتے ہوئے اس عجیب الخلقت کیڑے کی تنگ جگہ میں پھنسے پھنسے اڑن پہیوں کو چلانے کا یارا نہ تھا۔ گرمیوں کے آخر آخر میں جب ہم اس گاڑی کو چلانے کے قابل ہوئے، سالہا سال سے منصوبے کے واسطے جمع شدہ پونجی ختم ہو گئی۔ متجسس لوگوں کی ٹپٹپائی اور خوفزدہ نگاہوں کے سامنے ہتھیار ان گھڑ پن سے کلبلایا، اور فتح کے نعروں کے درمیان دائیں بائیں حرکت کی جیسے کسی خیالی قلعے پر حملہ آور ہو رہا ہو، اپنے گولے برسائے، پھر ساکت ہو گیا۔

ہمارے گاؤں اور زیتون کے باغوں سے پیسہ متواتر آتا رہا، لیکن ہم نے جو جماعت اکٹھی کی تھی اسے قائم رکھنے کے مصارف بے حد گراں ثابت ہوئے اور خوجہ کارندوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا۔

سردیاں انتظار میں گزر گئیں۔ جنگی مہم سے واپس ہوتے ہوئے حاکم اپنے محبوب ایدرنہ میں ٹھہر

گیا؛ کسی نے ہمیں طلب نہ کیا، ہم اکیلے ہی رہ گئے۔ چونکہ صبح کے وقت محل میں کوئی ایسا نہ تھا جس کا دل ہم اپنی کہانیوں سے بہلاتے، اور نہ شام کے وقت حویلیوں میں کوئی ایسا جس سے میں لطف اندوز ہو سکوں، ہمارے لیے کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے وینس کے ایک مصور سے اپنی پورٹریٹ بنوانا شروع کیا اور عود کی موسیقی سیکھنے کے لیے سبق لینا؛ خوجہ جب دیکھو قدیم دیواروں کے پاس نکلے دبی اپنے ہتھیار کے دیدار کے واسطے بھاگتا جس کی حفاظت کے لیے ایک چوکیدار تعینات کر دیا گیا تھا۔ اس میں جہاں تہاں اضافہ کرنے سے وہ خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا، لیکن جلد ہی اس سے بھی اکتا گیا۔ آخری سردیوں کی راتوں میں جو ہم نے ساتھ گزاریں، اس نے نہ ہتھیار کا اور نہ اس سے متعلق اپنے منصوبے کا کوئی ذکر کیا۔ ایک غفلت سی اس پر اتر آئی تھی، لیکن اس لیے نہیں کہ اس کا جذبہ سرد پڑ گیا تھا — اس کی یہ حالت دراصل اس لیے ہوئی تھی کہ میں اسے مزید تحریک نہیں دلا رہا تھا۔

رات کو ہم اپنا سارا وقت انتظار میں گزارتے، ہوا یا برفباری کے ختم ہونے کے انتظار میں، رات گئے سڑک پر گزرتے ہوئے پھیری والوں کی سودا بیچنے کے لیے آخری پکار کے انتظار میں، آگ کے سرد پڑنے کے انتظار میں تاکہ چولھے میں اور لکڑی جھونک سکیں۔ سردیوں کی ایک ایسی ہی رات میں جس کے دوران ہم بہت کم بولے تھے، اکثر خود اپنے خیالات کے دھارے میں بہتے چلے گئے تھے، خوجہ نے اچانک کہا کہ میں بہت زیادہ بدل گیا ہوں، کہ میں آخرکار ایک بالکل ہی مختلف آدمی بن گیا ہوں۔ میرے شکم میں سوزش سی ہوئی، مجھے پسینہ آ گیا؛ میں اس کی مخالفت کرنا چاہتا تھا، کہنا چاہتا تھا کہ وہ غلطی پر ہے، کہ میں ویسا ہی ہوں جیسا ہمیشہ رہا ہوں، کہ ہم ایک دوسرے جیسے ہیں، کہ اسے مجھ پر ویسی ہی توجہ دینی چاہیے جیسی پہلے دیتا تھا، کہ اب بھی ہمارے پاس گفتگو کے لیے بہت، بہت سی باتیں ہیں، لیکن وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا؛ میری نگاہیں میری اس پورٹریٹ پر جا پڑیں جو اسی صبح میں گھر لایا تھا اور ایک دیوار سے ٹکا دی تھی۔ میں بدل گیا تھا: دعوتوں میں خوب ٹھونس کر کھانے کی وجہ سے فربہ ہو گیا تھا، ٹھوڑی کے نیچے کی کھال لٹک آئی تھی، گوشت ڈھیلا پڑ گیا تھا، حرکات میں سستی آ گئی تھی؛ بدتر یہ کہ میرا چہرہ بالکل مختلف ہو گیا تھا؛ شراب و کباب کی ان پرشور محفلوں میں پینے پلانے اور ہمبستری کرنے سے میرے ہونٹوں کے گوشوں میں ایک فحش سا تاثر سمٹ آیا تھا، وقت بے وقت سونے، نشے میں مدہوش ہو جانے سے میری آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں، اور ان احمقوں کی طرح جو اپنی زندگی، دنیا اور اپنے آپ سے

مطمئن ہوتے ہیں، میری نگاہ میں ایک ان گھڑی بچتی آ گئی تھی، لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں اپنی نئی حالت سے آسودہ ہوں: میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بعد میں، اس وقت تک جب ہمیں پتا چلا کہ سلطان نے ہمیں اور ہمارے ہتھیار کو جنگی مہم کے لیے ایدرنہ بلا بھیجا ہے، مجھے بار بار ایک خواب آتا: ہم وینس میں ایک نقاب پوش رقص کی محفل میں ہیں جو اپنی افراتفری میں استنبول کی تقاریب کی یاد تازہ کر رہی ہے: جب ''طوائفوں'' نے اپنے نقاب اتارے تو میں نے جمگھٹے میں اپنی ماں اور منگیتر کو پہچان لیا، اور میں نے بھی اپنا نقاب اس امید میں علیحدہ کر دیا کہ وہ بھی مجھے پہچان لیں، لیکن کسی وجہ سے انھیں معلوم نہ ہو سکا کہ یہ میں ہوں، وہ اپنے نقابوں سے میرے عقب میں کسی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں؛ جب میں نے مڑ کر دیکھا، تو وہ شخص جو جانتا ہوگا کہ میں میں ہوں، خوجہ نکلا۔ پھر جب میں اس کے قریب گیا، اس امید میں کہ وہ مجھے پہچانے گا، تو وہ شخص جو خوجہ تھا، اس نے بغیر کچھ کہے اپنا نقاب اتار دیا اور اس کے پیچھے سے، میرے اندر احساس جرم کی ایک خوفزدہ کرنے والی ٹیس سی اٹھی جس نے مجھے خواب سے بیدار کر دیا، میری جوانی کا پیکر نمودار ہوا۔

۱۰

گرما کے آغاز میں خوجہ یہ اطلاع ملتے ہی کہ سلطان ہمارا اور ہتھیار کا ایدرنہ میں متوقع ہے آخرکار میدانِ عمل میں کود پڑا۔ ٹھیک تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے ہر چیز کو تیار رکھا تھا، سردیوں بھر ان لوگوں کی جماعت سے جو ہتھیار کو چلانے پر مامور تھے رابطہ قائم رکھا تھا۔ تین دن کے اندر اندر ہم مہم کے لیے تیار ہو گئے۔ آخری شب اس نے کچھ اس طرح کاٹی گویا ہم نئے مکان میں منتقل ہو رہے ہوں، پھٹی جلدوں والی اپنی پرانی کتابوں، رسائل، زرد پڑتے ہوئے اولین مسودات، اپنی ذاتی چیزوں وغیرہ کو الٹتا پلٹتا رہا۔ اس نے اپنی زنگ آلود نماز کی گھڑی کو کام کے قابل بنایا، فلکیات کے آلات کی جھاڑ پونچھ کی۔ فجر تک وہ جاگتا رہا اور اس اثنا میں پچیس سالوں کے کتابوں کے کچے مسودوں، نمونوں اور ہتھیاروں کے خاکوں کا معائنہ کرتا رہا۔ سورج نکلنے کے وقت میں نے دیکھا وہ اس چھوٹی سی نوٹ بک کے خستہ اور زرد شدہ ورق الٹ رہا ہے جو میں نے ہماری اولین آتش بازی کے مظاہرے سے متعلق تجربات کے مشاہدوں سے پُر کیے تھے۔ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا: کیا یہ چیزیں ہم اپنے ساتھ لے چلیں؟ کیا یہ

Scanned with CamScanner

کار آمد ہوں گی، کیا خیال ہے؟ جب اس نے دیکھا کہ میں اسے خالی خالی نظروں سے تک رہا ہوں، تو ان چیزوں کو نہایت بے کیفی کے عالم میں ایک طرف ڈال دیا۔

خیر، جو کچھ بھی سہی، اَیدرنہ کے اس دس روزہ سفر میں ہم نے خود کو ایک دوسرے سے قریب محسوس کیا، پرانے زمانے کی قربت سے کم ہی سہی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خوجہ پر امید تھا؛ ہمارا ہتھیار، جسے لوگ باگ عجیب الخلقت، کیڑا، شیطان، تیر انداز کچھوا، رواں دواں بُرج، لوہے کا ڈھیر، سرخ مرغ، پہیے دار پتیلا، دیو، یک چشم دیو، راکشس، سؤر، خانہ بدوش، نیل چشم اول جلول کے نام سے پکارتے، سڑک پر آہستہ آہستہ روانہ ہوا، چیخوں اور کراہوں کے ہیبت ناک، بے ہنگم شور کے درمیان، ہر دیکھنے والے میں بعینہ وہی دہشت طاری کرتا ہوا جو خوجہ کا مقتضیٰ تھی، اور اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا جس کا وہ متوقع نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل خوشی سے کھل گیا کہ متجسّین آس پاس کے دیہاتوں سے نکل کر سڑک کے سہارے سہارے پہاڑیوں پر قطار بنائے جمع ہو گئے ہیں، گردنیں لمبی کر کے اس مشین کے دیدار کی کوشش کر رہے ہیں جس کے قریب آتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ رات کے وقت، جس کے سکوت کا اندازہ جھینگروں سے ہو رہا تھا، جب ہمارے آدمی سارا دن خون پسینہ بہانے کے بعد اپنے خیموں میں لمبی تانے سو رہے ہوتے، خوجہ اس تباہی کا میرے لیے نقشہ کھینچتا جو اس کا سرخ مرغ ہمارے دشمنوں پر لانے والا تھا۔ ٹھیک ہے، وہ اتنے جوش کا اظہار نہیں کر رہا تھا جتنا پہلے کیا کرتا تھا، اور میری ہی طرح اس بات سے پریشان تھا کہ ہتھیار کی بابت سلطان کے حلقے اور افواج کا کیا ردعمل ہوگا، اور حملے کی ترتیب میں اسے کیا مقام دیا جائے گا، ان تمام باتوں کے باوجود وہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ ہمارے ''آخری موقعے'' کی بات کرنے کا اہل تھا، کس طرح ہم نے سیلاب کا رخ اپنے حق میں موڑ دیا ہے، اور اس سے بھی اہم یہ کہ ''ان کے اور ہمارے'' بارے میں بات کرنے کا اہل تھا جن کی بابت اس کے مالیخولیا میں ذرا کمی نہیں آئی تھی۔

ہتھیار اَیدرنہ میں دھوم دھام سے داخل ہوا، جس کا صرف حاکم اور مصاحبین میں سے چند بے شرم خوشامدیوں نے ہی کسی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سلطان نے خوجہ کی کسی دیرینہ دوست کی طرح پذیرائی کی، جنگ چھڑ جانے کے امکان کی افواہیں گرم تھیں، لیکن تیاری اور عجلت کم کم؛ وہ اپنے ایام ایک دوسرے کی قربت میں گزارنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا؛ جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو

Scanned with CamScanner

کر اطراف کے تاریک جنگل میں پرندوں کی چہچہاہٹ سننے کے لیے جاتے، یا مینڈکوں کے مشاہدے کے لیے کشتی میں تجہ اور مےرِچ دریاؤں کے بہاؤ کے رخ، یا عقابوں سے لڑائی میں زخمی ہونے والے سارسوں کو تھپتھپانے جو مسجدِ سلیمیہ کے صحن میں کراہ رہے ہوتے، یا ایک بار پھر ہتھیار کو تدبیراتی نقل و حرکت کرتے دیکھنے کے لیے، تو میں ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خاصی کوفت ہوتی کہ ان کے تبادلۂ خیالات میں شریک ہونے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا، کوئی ایسی بات نہ تھی جو میں ان سے خلوص کے ساتھ کہہ سکوں یا جسے وہ دلچسپ پا سکیں۔ شاید میں ان کی قربت پر جلن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ آخر کار میں ان تمام باتوں سے بیزار ہو گیا ہوں۔ خوجہ اب بھی وہی پرانی شاعری بگھار رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور صدمہ ہوتا کہ حاکم کس طرح فتح کی اس من گھڑت بوسیدہ کہانی سے اب بھی فریب کھانے پر آمادہ ہے، ''ان کی'' برتری کی کہانی، اس پر کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود کو خوابِ گراں سے بیدار کریں اور عمل پیرا ہوں، مستقبل اور ہمارے دماغوں کے اسرار کی کہانی۔

ایک دن، ایسی گرمیوں کے وسط میں جو افواہوں سے اُبلی پڑ رہی تھی، خوجہ نے کہا کہ اسے ایک مضبوط ساتھی کی ضرورت ہے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ ہم تیز رفتاری سے اَیدرنہ سے گزرے، خانہ بدوشوں اور یہودیوں کے محلوں سے ہوتے ہوئے، چند خاکستری سڑکوں سے جن پر میں پہلے بھی سرگشت کر چکا تھا اور دل گرفتگی کے اسی احساس سے مغلوب ہوا تھا جس سے اب پھر ہو رہا تھا، اور نادار مسلمانوں کے گھروندوں سے جن میں سے بیشتر ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آ رہے تھے۔ انجام کار، جب مجھے احساس ہوا کہ عشق پیچاں سے اَٹے ہوئے گھر جو میں نے اپنے بائیں طرف دیکھے تھے اب میرے دائیں طرف آ گئے ہیں، تو سمجھ گیا کہ ہم لوٹ رہے ہیں؛ میں نے پوچھا اور جواب ملا کہ ہم قِل دمہ علاقے میں ہیں۔ خوجہ نے ناگہانی ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سبز آنکھوں والے ایک ہشت سالہ بچے نے دروازہ کھولا۔ ''شیر،'' خوجہ نے اس سے کہا، ''شیر سلطان کے محل سے بھاگ نکلے ہیں، اور ہم انھیں تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے بچے کو دھکا دے کر ایک طرف کیا اور مجھے اپنے پیچھے لیے لیے اندر داخل ہو گیا۔ ہم اندرونِ خانہ کی نیم تاریکی سے، جس میں برادے اور صابن کی بو پھیلی ہوئی تھی، بہ عجلت گزرتے ہوئے چرچراتی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کی ایک طویل راہداری میں آئے؛ خوجہ اس سے پھوٹتے ہوئے دروازے کھولنے لگا۔ پہلے کمرے میں ایک بوڑھا آدمی پڑا اونگھ رہا تھا، اس کا دانتوں

Scanned with CamScanner

سے خالی منھ پھٹا اس کھلا تھا، اور دو کھلکھلا کر ہنستے ہوے بچے تھے جو اس کی ڈاڑھی کی طرف پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے اور جنھوں نے دروازہ کھلتا دیکھ کر قلانچ بھری۔ خوجہ نے وہ دروازہ بند کیا اور ایک دوسرا دروازہ کھولا؛ اندر رضائی گدوں اور ان کے لوازمات کا انبار لگا تھا۔ وہ بچہ جس نے سڑک کی طرف والا دروازہ کھولا تھا، اس نے تیسرے کمرے کے دروازے کا قبضہ لپک کر خوجہ سے پہلے ہی پکڑ لیا اور بولا، ''یہاں کوئی شیر و یر نہیں ہیں، صرف میری ماں اور چچی ہیں؛'' لیکن خوجہ نے بہر کیف دو عورتوں پر دروازہ کھول ہی دیا جو ہماری طرف پیٹھ کیے مدھم روشنی میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ چوتھے کمرے میں ایک شخص جو رضائی میں ٹانکے لگا رہا تھا اور ڈاڑھی نہ ہونے کے سبب مجھ سے زیادہ مشابہ تھا، خوجہ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ ''پاگل آدمی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''ہم سے کیا لینے آئے ہو؟'' ''سیمرا کہاں ہے؟'' خوجہ نے پوچھا۔ ''وہ دس سال ہوے استنبول چلی گئی تھی؛'' آدمی نے جواب دیا۔ ''سنا ہے کہ طاعون میں مر گئی۔ تم بھی کیوں نہیں ٹھکانے لگ گئے؟'' بغیر ایک لفظ کہے خوجہ سیڑھیاں اتر کے گھر سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے خود بھی نکلتے ہوے میں نے عقب میں ایک بچے کو چلاتے اور ایک عورت کو جواب دیتے ہوے سنا: ''شیر یہاں تھے، اماں!'' ''نہیں بیٹے، تمھارے چچا اور ان کے بھائی!''

شاید اس لیے کہ میں ماضی کو بھلا دینے پر قادر نہیں تھا، یا شاید اپنی نئی زندگی اور اس کتاب کو قلمبند کرنے کی تیاری کر رہا تھا جسے آپ ہنوز بڑے صبر و تحمل سے پڑھ رہے ہیں، دو ہفتے بعد فجر کے وقت میں ٹھیک اسی جگہ لوٹا، پہلے پہلے، اولین روشنی میں صاف دکھائی نہ دینے کے سبب، مجھے گھر تلاش کرنے میں دقت ہوئی؛ اور جب تلاش کر لیا تو اس راستے سے واپس ہوا جس کے بارے میں میرا گمان تھا کہ یہ مسجدِ بایزید کے شفاخانے تک جلد از جلد پہنچنے کے لیے کوتاہ ترین راہ ہوگا۔ شاید اس لیے کہ یہ سوچنے میں مجھ سے غلطی ہوئی تھی کہ خوجہ اور اس کی ماں نے تیز ترین راستہ اختیار کیا ہوگا، مجھے سفیدوں کے سائے میں پھیلی ہوئی وہ مختصر گزرگاہ نہیں ملی جو پل کی طرف جاتی تھی؛ تاہم مجھے ایک سڑک ضرور ملی جس کے کنارے سفیدوں کی قطار لگی تھی، لیکن اس کے نزدیک کوئی ندی وری نہیں تھی جہاں برسوں پہلے وہ سستانے بیٹھتے ہوں اور حلوہ کھاتے ہوں۔ اور شفاخانے میں ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں تھا جن کا میں نے تصور کیا تھا، وہ اب کیچڑ زدہ نہیں تھا بلکہ بے حد صاف و شفاف، بہتے پانی کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، نہ ہی رنگ برنگی بوتلیں تھیں۔ جب میں نے ایک زنجیر بکف مریض کو دیکھا تو ایک ڈاکٹر سے

اس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا: یہ محبت میں مبتلا ہو گیا تھا، دماغ چل گیا ہے، اور بھی پاگلوں کی طرح یقین کرتا ہے کہ وہ کوئی اور ہے؛ وہ مجھے اور بھی بتاتا، لیکن میں وہاں سے چل دیا۔

فوج کشی شروع کرنے کا فیصلہ، جس کے بارے میں ہمارا خیال تھا کبھی ہوگا ہی نہیں، گرما کے ختم پر ہو ہی گیا، ایک ایسے دن جب اس کی کم سے کم توقع کی جا سکتی تھی: پولینڈ والوں نے، جو گزشتہ سال کی شکست اور اس کے جلو میں آنے والے بھاری ٹیکس قبول کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں تھے، یہ پیغام بھجوایا: ''ٹیکس لینا ہے تو خود آ کر اپنی تلواروں کے ذریعے لو۔'' ابھی حملے کی ترتیب کا نقشہ بن ہی رہا تھا، فوج میں کسی فردِ واحد نے بھی ہتھیار کو صف آرائی میں شامل کرنے کا خیال تک نہیں کیا، اور خوجہ اگلے چند دن طیش سے بھرتا رہا؛ کوئی بھی اس کو بیدہ لوہے کے انبار کے برابر برابر رن میں نہیں جانا چاہتا تھا؛ کسی کو بھی اس لحیم شحیم کیتلی سے کسی فائدے کی توقع نہیں تھی؛ بدتر یہ کہ ان کے خیال میں یہ ایک شگونِ بد تھا۔

مقررہ کوچ سے ایک دن پہلے، جب خوجہ مہم کی فالیں نکال رہا تھا، ہم نے سنا کہ ہمارے دشمن افواہیں پھیلا رہے ہیں اور یہ کھلے بندوں کہا جا رہا ہے کہ ہتھیار اتنی ہی آسانی سے بدبختی لا سکتا ہے جتنی آسانی سے فتح و کامرانی۔ جب خوجہ نے کہا لوگوں کے خیال میں اس بدبختی کا ذمہ دار میں ہوں نہ کہ وہ، تو مارے دہشت کے میری سٹی گم ہو گئی۔ سلطان نے اعلان کیا کہ اسے خوجہ اور ہتھیار پر اعتماد ہے، اور مزید بحثا بحثی سے گریز کرنے کے لیے حکم دیا کہ معرکہ آرائی کے دوران ہتھیار براہ راست اس کے ساتھ ہوگا، خود اس کی قیادت والے دستے کے ساتھ۔ ستمبر کے آغاز میں، ایک گرم دن، ہم نے ایدرنہ سے کوچ کیا۔

سب کا یہی خیال تھا کہ فوج کشی کے موسم میں یہ مہم کافی تاخیر سے نکلی ہے، لیکن اس معاملے پر بہت زیادہ حجت نہیں کی گئی: مجھے بس اب یہی معلوم ہو رہا تھا کہ فوجی مہم کے دوران سپاہ نامبارک شگونوں سے بھی اتنے ہی خائف ہوتے ہیں جتنے غنیم سے، بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس خوف سے بھی اتنے ہی برسرِ پیکار تھے۔ پہلی رات، خوشحال دیہاتوں سے ہو کر ہمارے ہتھیاروں کے بوجھ سے کراہتے ہوئے پلوں پر سے شمال کی طرف جاتے ہوئے، سلطان کے خیمے میں حاضری دینے کے بلاوے سے ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ اپنے سپاہ کی طرح، حاکم بھی ناگہانی بچوں جیسا ہو گیا تھا، اس کا انداز ایک ایسے لڑکے جیسا تھا جو کسی نئے کھیل کی ابتدا پر اشتیاق اور ولولہ محسوس کر رہا ہو، اور خوجہ سے پوچھتا، جیسے اس کے لشکری پوچھتے، کہ شگونوں کی وہ کیا تعبیر کرتا ہے: غروبِ آفتاب سے قبل کا سرخ بادل، بہت

Scanned with CamScanner

نیچے نیچے اڑتے ہوے باز، کسی گاؤں کے مکان کی شکستہ چمنی، جنوب کی طرف پرواز کرتے ہوے سارس، ان کا کیا مطلب نکلتا ہے؟ ظاہر ہے، خوجہ نے ان سب کی بڑی خوش آئند تعبیر ہی کی۔

لیکن ظاہر ہے ہمارا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا؛ ہم دونوں کو بس اب ہی معلوم ہو رہا تھا کہ دورانِ سفر حاکم رات کے وقت خاص طور پر عجیب وغریب، ڈراؤنی کہانیاں سننا پسند کرتا ہے۔ خوجہ نے ہماری اس کتاب کی جذباتی شاعری سے جو مجھے سب سے زیادہ مرغوب تھی، وہی جو ہم نے سالوں پہلے سلطان کو پیش کی تھی، بھیانک پیکر نکال کر حاضر کیے — بھیانک پیکر جن میں لاشوں، خونیں لڑائیوں، شکستوں، غداری اور مصائب کا ہجوم تھا — لیکن اس نے حاکم کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی فتح کے شعلے کی طرف قیادت کی جو اس تصویر کے ایک کونے میں درخشاں تھا: ہمیں چاہیے کہ اس شعلے کو اپنی ذہانت کی دھونکنی سے ہوا دیں، ''ان کی اور ہماری،'' اور اپنے دماغوں میں پوشیدہ سچائیوں کو شرمندۂ تعبیر کریں اور ان تمام چیزوں کو جو خوجہ مجھ سے برسوں کہتا رہا تھا، جنھیں اب میں بھول جانا چاہتا تھا — ہمیں خود کو اپنی خوابیدہ حالت سے جس قدر جلد ہو سکے بیدار کرنا چاہیے! میں ان تلخ قصوں سے اکتانے لگا تھا، لیکن ہر شب خوجہ ان کی ظلمت کو کچھ اور بڑھا دیتا، ان کی بدصورتی کو، ان کی خباثت کو، شاید اس لیے کہ اس کے نزدیک اب خود حاکم کی طبیعت بھی ان کہانیوں سے سیر ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر دیکھا کہ خوجہ کے ہمارے اندرونِ دماغ کا ذکر کرتے ہی سلطان لذت سے کپکپانے لگا ہے۔

ہمارے کوچ کے بعد والے ہفتے شکار کے دورے شروع ہوے۔ ایک جماعت جو لشکر کے ساتھ خاص اس مقصد سے آئی تھی، آگے جاتی، علاقے کا گشت لگاتی، زرعی زمین سے گزرتی اور گاؤں والوں، حاکم، ہم سب کو جگاتی، شکاری مارچ سے کٹ کر کسی جنگل کی طرف جو اپنے غزالوں کے لیے مشہور ہوتا گھوڑوں کو ایڑ لگاتے، پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چڑھتے جہاں جنگلی خوک دوڑتے پھرتے، یا کسی بن میں جو لومڑیوں اور خرگوشوں سے پٹا ہوتا۔ ان چھوٹی موٹی تفریحی کلیلوں کے بعد، جو گھنٹوں جاری رہتیں، ہم بڑے دھوم دھڑکے سے واپس آکر مارچ میں شامل ہو جاتے جیسے کسی لڑائی سے فتحیاب لوٹ رہے ہوں، اور جب فوج حاکم کو سلامی دیتی، ہم عین اس کے عقب میں ایستادہ نظارہ کرتے۔ خوجہ ان تکلفاتی رسوم کو تنفر اور برافروختگی سے برداشت کرتا، لیکن میں ان کا متوالا تھا؛ مجھے شام کو سلطان سے مارچ، دیہات جن سے ہو کر لشکر گزرا تھا یا شہروں کی حالت اور غنیم کے تازہ ترین حالات سے زیادہ شکار

کے بارے میں گفتگو کرنے میں مزہ آتا۔ پھر خوجہ، اس بک بک سے طیش میں آ کر جسے وہ نہایت احمقانہ اور واہیات سمجھتا تھا، اپنی کہانیاں اور پیش گوئیاں شروع کر دیتا جو ہر گزرتی رات کے ساتھ اپنے تشدد میں فزوں تر ہوتی جاتیں۔ حاکم کے حلقے کے دوسرے لوگوں کی طرح اب خود مجھے بھی یہ دیکھ کر تکلیف ہونے لگی تھی کہ وہ ان قصوں پر اعتبار کرنے لگا ہے جن کا مقصد صرف دہشت پھیلانا تھا، ہمارے دماغ کے تاریک گوشوں کے بارے میں ان عفریتی کہانیوں پر۔

لیکن آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا! مجھے تو ابھی اس سے کہیں بدتر کا مشاہدہ کرنا تھا! ہم پھر شکار کر رہے تھے: ایک قریبی گاؤں خالی کرالیا گیا تھا، مقامی لوگوں کو سارے جنگل میں بکھیر دیا گیا تھا، تاکہ ٹین کے برتن بجا بجا کر اس شور وغوغا سے خوکوں اور ہرنوں کو ہنکا کر اس مقام پر لے آئیں جہاں ہم اپنے ہتھیاروں اور گھوڑوں سمیت ان کی گھات میں بیٹھے تھے۔ دوپہر کی گرمی سے پیدا ہونے والی تھکن اور بے آرامی سے نجات دلانے کے لیے، حاکم نے خوجہ کو حکم دیا کہ وہ اسے وہ کہانیاں سنائے جو رات کے وقت اسے لرزہ براندام کر دیتی ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے، اور دور سے آنے والے ٹین کے برتنوں کا شور بمشکل سنائی دے رہا تھا کہ ایک عیسائی گاؤں کے سامنے آتے ہی وہاں ٹھہر گئے۔ ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ سلطان اور خوجہ ایک خالی مکان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور ایک چرخ بڈھے کو جو دروازے سے سر نکال رہا تھا آگے آنے کے لیے بہلا پھسلا رہے ہیں۔ کچھ دیر پہلے وہ ''ان کی'' اور ان کے دماغوں کے اندرون کی بابت باتیں کر رہے تھے اور اب، ان کے چہروں کے فسوں کو اور خوجہ کو ترجمان کے ذریعے بوڑھے سے کچھ پوچھتے دیکھ کر، میں قریب آیا، جو ہونے والا تھا اس کے اندیشے سے خائف۔ خوجہ بڈھے سے سوال کر رہا تھا اور اس سے بغیر سوچے فوری جواب دینے کا مطالبہ بھی: اس کا بڑے سے بڑا جرم کیا تھا، بدترین چیز جس کا اس نے زندگی میں ارتکاب کیا تھا؟ گاؤں والا، سلاوی لہجے میں، جس کا ترجمہ کرنے میں ترجمان کو خاصی دقت ہوئی، بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑایا کہ وہ ایک نردوش، معصوم بوڑھا آدمی ہے: لیکن خوجہ خاصی شدت سے اس پر اڑا رہا کہ وہ ہمیں اپنے بارے میں بتائے۔ صرف اسی وقت جب بڈھے نے دیکھا کہ حاکم اس کی طرف متوجہ ہے، اس نے اعتراف کیا کہ اس نے گناہ کیا ہے: ہاں، وہ مجرم ہے، دوسرے گاؤں والوں کی طرح اسے بھی اپنے مکان سے باہر نکل آنا چاہیے تھا، اپنے بہن بھائیوں کی طرح اسے بھی لازم تھا کہ شکار میں شامل ہو کر جانوروں کا

تعاقب کرتا، لیکن وہ بیمار ہے، اس کے پاس جواز موجود ہے، وہ تندرست نہیں کہ سارا دن جنگل میں دوڑتا پھرے، اور جب اس نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا، عذر خواہی کے طور پر، خوجہ آپے سے باہر ہوگیا اور برسا کہ وہ اس کی حقیقی معصیتوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے، اس کے بارے میں نہیں۔ بہرکیف، ترجمان کے متعدد بار دہرانے کے باوجود، سوال بڈھے کی سمجھ میں نہیں آیا، بس غمگینی سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر دباتا رہا، دنگ کہ اور کیا کہے۔ وہ بڈھے کو پکڑ کر لے گئے۔ اگلے دن جب ایک اور آدمی کو پکڑ لائے اور اس نے بھی یہی سب کہا، تو خوجہ غصے سے لال بھبھوکا ہوگیا۔ اس نے اس دوسرے گاؤں والے سے میرے بچپن کی تقصیروں کا ذکر کیا، جھوٹ جو میں نے اپنے بھائی بہنوں کے مقابلے میں زیادہ چاہے جانے کے لیے گھڑے تھے، یونیورسٹی کی طالبِ علمی کے زمانے کی جنسی لغزشیں جو مجھ سے سرزد ہوئی تھیں، گویا فسق و فجور کی مثالیں دے کر وہ کسی بے نام گنہگار کی فردِ جرم سے گاؤں والے کو تحریک دلانا چاہتا ہو۔ جبکہ میں کھڑا سنتا رہا، تنفر اور ندامت سے ان دنوں کو یاد کرتا رہا جو ہم نے طاعون کے زمانے میں ساتھ گزارے تھے لیکن جن کی بازخوانی اب، یہ کتاب لکھتے وقت، میں نہایت آرزومندی سے کر رہا ہوں۔ جب آخری گاؤں والے کو، جو ایک اپاہج تھا، باہر لائے، تو اس نے سرگوشی میں اعتراف کیا کہ اس نے دریا میں نہاتی ہوئی عورتوں کا چھپ کر نظارہ کیا ہے، تو کہیں جا کر خوجہ کا جلال کسی قدر فرو ہوا۔ ہاں، تم نے دیکھا، جب ان کا سامنا ان کے گناہوں سے کرایا جاتا ہے تو ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے، وہ ان سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں؛ لیکن ہم، جواب قیاساً یہ جان گئے ہیں کہ ہمارے دماغوں کے گوشوں میں کیا کچھ پیش آتا ہے، وغیرہ، وغیرہ۔ میں یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ سلطان متاثر نہیں ہوا ہے۔

لیکن اس کی دلچسپی چمک گئی تھی؛ دو دن بعد، ہرن کے شکار کی ایک اور مہم کے دوران اس نے اس ناٹک کی تکرار پر اپنی آنکھیں بند کر لیں، شاید اس لیے کہ اس میں خوجہ کے اصرار کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ ہو، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس بازپرس سے میرے اندازے سے کہیں زیادہ لطف اٹھایا ہو۔ اب ہم ڈینیوب پار کر چکے تھے؛ ایک بار پھر ہم ایک عیسائی گاؤں میں تھے۔ جہاں تک ان سوالوں کا تعلق ہے جو خوجہ نے گاؤں والوں پر داغے، تو ان میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے میرے لیے طاعون کی راتوں کی اس جارحیت کی یاد کو تازہ کر دیا جب میں اس سے اس کے گناہوں کو لکھوانے میں کامیاب ہو جاتا، اور پہلے پہل تو میں گاؤں والوں کے جواب سننے کا بھی روادار نہیں تھا، جو سوالوں اور

سوال کرنے والوں دونوں سے بری طرح ہراساں تھے، یہ گمنام قاضی جس کا سلطان در پردہ حامی تھا۔ میں ایک عجیب سی مالش سے مغلوب ہوگیا: خوجہ سے زیادہ پُرتقصیر میں نے سلطان کو گردانا، جو یا تو خوجہ کے فریب میں آ گیا تھا یا اس شیطانی کھیل کی کشش سے خود کو باز رکھنے کا نااہل تھا۔ لیکن خود مجھے بھی اس کشش کی گرفت میں آجانے میں دیر نہیں لگی: سننے میں آدمی کا کچھ نہیں جاتا، میں نے سوچا، اور ان سے قریب ہوگیا۔ زیادہ تر معاصی اور بدکاریاں، جن کا اظہار اب بڑی نفیس زبان میں ہوتا جو میرے کانوں کو بہت بھاتی، ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی تھیں: سیدھے سادے دروغ، چھوٹے موٹے فریب: ایک دو واقعتاً غلیظ چارسوبیسیاں، دو ایک جنسی بے وفائیاں: زیادہ سے زیادہ، چندادنیٰ سی چوریاں۔

شام کو خوجہ نے کہا کہ گاؤں والوں نے ہر بات فاش نہیں کی ہے، وہ سچ کو چھپائے ہوئے ہیں: اپنی تحریروں میں میں اس سے کہیں آگے نکل گیا تھا: وہ ضرور کہیں زیادہ گھناؤنے، کہیں زیادہ حقیقی گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے جو انھیں ہم سے الگ کرتے ہیں۔ سلطان کو قائل کرنے کے لیے، ان سچائیوں تک رسائی کے لیے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ''وہ'' اور، بنابریں، ''ہم'' کس قسم کی مخلوق ہیں، اگر ضرورت پڑی تو وہ تشدد کا استعمال کرے گا۔

یہ کراہت آمیز جارحیت ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ زہریلی اور بے مقصد ہوتی گئی۔ شروع میں ہر چیز بے حد سادہ تھی: ہم کھیل میں مگن بچوں کی طرح تھے، جو کھیل کے درمیانی وقفوں میں پھکڑ تاہم بے ضرر سا مذاق کر رہے ہوں: بازپرس کی ہر ساعت ایک ڈرامے کے مختلف ایکٹوں کے درمیان والے مختصر، ہلکے پھلکے طنزیہ چٹکلوں کی طرح تھی جن میں ہم اپنی پرلطف طویل شکاری مہمات سے ستا رہے ہوتے: لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ ان رسومات میں تبدیل ہوگئیں جنھوں نے ہماری ساری قوتِ ارادی کو نچوڑ لیا، ہمارے صبر، ہماری دلیری کو، لیکن جن سے، خدا جانے کیوں، ہم دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ میں دیکھتا کہ خوجہ کے سوالات اور اس کے ناقابلِ فہم طیش سے گاؤں کے لوگ کس طرح دہشت سے دم بخود رہ جاتے: اگر ان کی سمجھ میں آجاتا کہ کیا پوچھا جا رہا ہے تو شاید وہ تعمیل کر سکتے: میں نے پوپلے منھ والے تھکے ماندے بوڑھوں کو دیکھا کہ گاؤں کے چوراہے کی طرف ریوڑ کی طرح ہنکائے جا رہے ہیں: قبل اس کے کہ وہ ہکلا ہکلا کر اپنی، حقیقی یا فرضی، بدکاریوں کا اعتراف کریں، وہ اپنے آس پاس والوں سے مدد کی بھیک مانگتے، ہم سے بھی، ایسی نگاہوں سے جن میں امید کا شائبہ

Scanned with CamScanner

بھی نہ ہوتا؛ میں نے نوجوانوں کو دیکھا کہ رگیدے جا رہے ہیں، پچھاڑے جا رہے ہیں اور دوبارہ کھڑے ہو جانے پر مجبور کیے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے اعترافات اور معاصی اطمینان بخش نہیں پائے گئے تھے: مجھے یاد رہے گا کہ کس طرح خوجہ نے جو میں نے میز پر بیٹھ کر قلمبند کیا تھا اسے پڑھتے ہوئے کہا تھا، ''بدمعاش،'' اور میری پیٹھ پر گھونسا مارا تھا، بڑبڑاتے اور اس پریشانی کے مارے پاگل ہوتے ہوئے کہ یہ اس کی سمجھ سے باہر ہے کہ میں ایسا کیسے ہو سکتا ہوں۔ لیکن اب وہ جس چیز کا متلاشی تھا اس کو بہتر طور پر جانتا بھی تھا، ان نتائج کو جن تک پہنچنا چاہتا تھا، اگرچہ بے کم و کاست نہ بھی سہی۔ اس نے دوسرے ذرائع بھی استعمال کیے: بیس مرتبہ وہ گاؤں والے کو بیچ میں ٹوک کر اصرار کرتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؛ بعد ازاں ہمارے آدمی خطاوار کا بھرکس نکال دیتے۔ دوسرے موقعوں پر وہ آدمی کی بات کاٹتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ اس کے ایک رفیق نے اس کی تردید کی ہے۔ کچھ دیر تک وہ انھیں دو دو کر کے آگے بلاتا رہا۔ جب دیکھا کہ اعترافات اوپری ہیں، اور گاؤں والے ایک دوسرے کے سامنے شرمندہ ہو رہے ہیں، اس کے باوجود کہ ہمارے آدمیوں نے بڑی مقصدیت سے ان کے ساتھ تشدد کا استعمال کیا ہے، تو وہ طیش میں آ جاتا۔

بے رحم موسلا دھار بارشیں شروع ہونے کے وقت تک میں بھی جو ہو رہا تھا اس کا تقریباً خوگر ہو چکا تھا۔ مجھے گاؤں والے یاد ہیں جنھوں نے بہت کم کہا، اور بہت زیادہ کہنے کی جنھیں کم تر خواہش تھی، کہ انھیں بے سود زدوکوب کیا جا رہا ہے، ایک گاؤں کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے چوک میں ساعت بعد ساعت بھیگتے کھڑے رہنے اور انتظار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ وقت کے گزران کے ساتھ شکار کی کششیں محو ہونے لگیں اور ہماری مہمات قبل از وقت ختم کر دی گئیں۔ کبھی کبھار ہم ایک آدھ غمگیں چشم غزال یا فربہ جنگلی خوک مارتے، جس سے سلطان رنجیدہ ہو جاتا، لیکن اب ہماری توجہ شکار کی تفصیلات پر نہیں بلکہ ان احتسابوں پر لگی ہوئی تھی جن کی تیاریاں، شکار کی تیاریوں کی طرح، بہت پہلے ہی شروع ہو چکی ہوتیں۔ رات کے وقت، گویا دن بھر جو کرتا رہا ہے اس پر خود کو مجرم محسوس کر رہا ہو، خوجہ اپنے جذبات کا مجھ سے برملا اظہار کرتا۔ وہ خود بھی جو کچھ ہو رہا تھا اس سے، تشدد سے پریشان ہے، لیکن وہ کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے، وہ کچھ جو ہم سب کے لیے سودمند ہوگا: وہ اس کا مظاہرہ سلطان کے لیے بھی کرنا چاہتا ہے؛ اس کے علاوہ یہ کہ گاؤں والے آخر کیوں سچ کی پردہ پوشی کر رہے ہیں؟ بعد میں اس نے

Scanned with CamScanner

کہا کہ مقابلے کے لیے ہمیں یہی تجربے کسی مسلمان گاؤں میں بھی کرنے چاہئیں؛ لیکن اس سے وہ نتائج حاصل نہیں ہوے جن کی اسے آس تھی: اگرچہ اس نے ان کی باز پرس میں کم تر جبر سے کام لیا، انھوں نے کم و بیش ویسے ہی اعترافات کیے جو ان کے عیسائی ہمسایوں نے کیے تھے۔ یہ ان منحوس دنوں میں کا ایک دن تھا جب بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی ہے، خوجہ چند لفظ بڑبڑایا جن سے مراد تھی کہ یہ لوگ سچے مسلمان نہیں ہیں، لیکن جب شام کو دن کے واقعات پر بحث ہوئی تو میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ اسے احساس ہو گیا ہے کہ یہ صداقت سلطان کی توجہ سے بھی مستور نہیں رہی ہے۔

اس دریافت نے خوجہ کی برہمی کو اَور ہوا دی اور اسے اَور زیادہ تشدد کے استعمال پر مجبور کیا، اتنا تشدد کہ اگرچہ سلطان اس کے مشاہدے کا متحمل نہیں تھا تاہم اس کا مریضانہ تجسس سے اتباع کرتا رہا۔ جوں جوں ہم اور زیادہ شمال کی طرف بڑھتے گئے ایک بار پھر ایک جنگلی علاقے سے دوچار ہوے جہاں گاؤں والے سلاوی کی ایک بولی بول رہے تھے: ایک قدیم وضع کے چھوٹے سے گاؤں میں ہم نے خوجہ کو خود اپنی مٹھیوں سے ایک خوبرو نوجوان کو زدوکوب کرتے دیکھا جو صرف ایک بچکانہ سے جھوٹ سے زیادہ کچھ یاد نہیں کر سکا تھا۔ خوجہ نے قسم کھائی کہ دوبارہ ایسا کبھی نہیں کرے گا؛ شام پڑتے پڑتے وہ احساسِ جرم سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ یہ مجھے ضرورت سے زیادہ لگا۔ ایک اور موقعے پر، جب ایک گدلا سا مینھ برس رہا تھا، میں نے ایک گاؤں کی عورتوں کو دور سے ان کے مردوں پر جو گزر رہی تھی اس پر آنسو بہاتے ہوے دیکھا۔ ہمارے سپاہی تک، جو اپنے کام میں ماہر ہو گئے تھے، جو ہو رہا تھا اس سے بیزار ہو گئے تھے: بعض اوقات وہ ہم سے پہلے ہی اعتراف کروانے کے لیے اگلے آدمی کا انتخاب کر کے اسے آگے لاتے، اور خوجہ کے بجاے، جو اپنے غیظ و غضب کے باعث واماندہ نظر آنے لگا تھا، ہمارا ترجمان خود ہی اولین باز پرس کرتا۔ یہ نہیں کہ ہمارا سابقہ دلچسپ مصیبت زدوں سے کبھی پڑتا ہی نہ ہو جو اپنی معصیتوں کا بڑا طولانی ذکر کرتے ہوں، جیسے اپنے قلب کی گہرائیوں میں زمانوں سے باز پرس کے ایسے ہی کسی دن کے منتظر ہوں، جو یا تو ہمارے جبر و تعدّی کے قصوں سے، جو ہم نے سنا تھا گاؤں گاؤں پھیل کر ایک افسانوی روایت بن گئے تھے، یا کسی عدلِ مطلق کے عفریت سے جس کے اسرار تک ان کی رسائی ممکن نہ تھی، دہشت زدہ، عقل دنگ ہو گئے تھے؛ لیکن اب خوجہ کو زن و شو کی جنسی بےوفائیوں میں، اور مفلس و نادار دیہاتیوں کی اپنے متمول ہمسایوں سے رقابت میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ مسلسل یہی

Scanned with CamScanner

تکرار کرتا کہ ایک عمیق سچائی موجود ہے، لیکن کبھی کبھارا سے شک ہوتا، جیسا کہ ہمیں ہوتا، کہ ہم کبھی اسے دریافت کرسکیں گے۔ یاکم ازکم اسے ہمارے شک کا احساس ہوجاتا اور وہ غصے سے بھڑک اٹھتا، لیکن سلطان اور ہم یہی خیال کرتے کہ ہار ماننے کی اس کی کوئی نیت نہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہم راضی برضا تماشائی بن گئے، جو عنان کو اس کے قابو میں دیکھنے ہی پر قناعت کرتے۔ ایک مرتبہ، ناگہانی شدید بارش سے ایک چھت کے چھجے کے نیچے پناہ لے کر، اس منظر سے ہماری امید بندھی کہ خوجہ اپنی کھال تک پانی میں شرابور ایک نوجوان پر سوالات کی بوچھار کیے جارہا ہے جو اپنے سوتیلے باپ اور بہن بھائیوں سے اپنی ماں سے بدسلوکی کرنے پر نفرت کرتا تھا؛ لیکن بعد میں شام کو اس نے یہ دفتر یہ کہہ کر بند کر دیا کہ یہ بھی ایک عام سا نوجوان ہے جو یاد رکھنے کے قابل نہیں۔

ہم شمال اور اس سے بھی زیادہ شمال کی طرف بڑھتے رہے: مارچ، اونچے پہاڑوں سے بل کھاتی ہوئی، کچھوے کی رفتار سے تاریک جنگلوں کے کیچڑ آلود راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی۔ سفیدے اور زان سے اَٹے ہوئے بنوں سے آتی ہوئی ٹھنڈی اور تاریک ہوا مجھے بڑی فرحت بخش معلوم ہوئی، کہرائی خموشیاں جو شکوک کو ابھارتیں، ہر چیز دھندلی دھندلی سی۔ اگرچہ کسی نے نام نہیں لیا، میرا خیال ہے، ہم کارپاتھین پہاڑوں کی ترائی میں پہنچ گئے تھے، جو میں نے اپنے بچپن میں اپنے باپ کے پاس کے ایک نقشے میں دیکھے تھے، وہ جسے واجبی صلاحیت کے کسی آرٹسٹ نے بنایا تھا اور جس نے اسے ہرنوں اور گوتھک طرز کے قلعہ نما محلوں سے مزین کیا تھا۔ بارش کی وجہ سے خوجہ کو سردی لگ گئی تھی اور وہ بیمار پڑا تھا، ہم پھر بھی ہر صبح جنگل میں جاتے، مارچ سے کٹ کر جو ایک راستے پر رینگ رہی تھی جو یوں بل کھاتا گویا کبھی انتہا تک پہنچنے کو ملتوی کرنا چاہتا ہو۔ لگتا تھا اب ہم شکاری مہمات کو بھول بھال گئے ہیں: یہ گویا یوں تھا کہ ہم کسی جھیل کے کنارے یا عمودی ڈھلان کی حد پر ٹھہرے ہوئے ہوں، ہرن مارنے کے لیے نہیں بلکہ گاؤں والوں کو، جو ہمارے لیے تیاری کر رہے ہوں، اور زیادہ انتظار کروانے کے لیے! جب ہم فیصلہ کرتے کہ وقت آ گیا ہے، تو کسی ایک گاؤں میں داخل ہوجاتے، اور اپنی رسومات کی تکرار کے بعد خوجہ کے پیچھے پیچھے ہو لیتے جو کسی دوسرے گاؤں کی طرف ہمیں بہ عجلت لے جارہا ہوتا، جس خزانے کا متلاشی تھا اس کو پانے میں ہمیشہ ناکام لیکن بڑی بے جگری سے انھیں فراموش کر دینے کا جو یا جن کے ساتھ دھینگا مشتی کی ہوتی اور جن کی مار کٹائی، اور اپنی یاس کو فراموش کر دینے کا بھی۔ ایک موقعے پر اس

نے ایک تجربہ کرنا چاہا: سلطان نے، جس کے صبر نے مجھے ششدر کر دیا تھا، بیس ینی چری کو اس تجربے کے لیے بلوایا؛ اس نے پہلے ان سے بھی یہی سوال کیے، اور بعد میں سفید بالوں والے گاؤں کے باسیوں سے جو گم سم اپنے گھروں کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک اور موقعے پر وہ گاؤں والوں کو مارچ تک لایا، ہمارا چرخ چوں کرتا ہوا ہتھیار جسے کیچڑ سے لت پت راستوں پر حاکم کی فوج کا ساتھ دینے میں بڑی شدید محنت کرنی پڑ رہی تھی، پوچھا کہ اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے اور منشی سے ان کے جوابات قلمبند کروائے، لیکن اس کی طاقت جواب دے گئی۔ شاید یہ اس لیے تھا، جیسا کہ وہ دعوے دار تھا، کہ ہمیں سچ کا اور چھور بھی معلوم نہیں، یا شاید وہ خود بھی اس بے معنی تشدد سے ڈر گیا تھا، شاید یہ وہ احساسِ جرم تھا جو رات کے وقت اس پر غالب آ جاتا ہو، یا اس لیے کہ فوج اور پاشاؤں کو ہتھیار اور جنگلوں میں ہونے والی وارداتوں کی بابت ناپسندیدگی سے بڑبڑاتے سن کر اس کی طبیعت اُوب گئی ہو، یا شاید صرف اس لیے کہ وہ علیل تھا، مجھے نہیں معلوم: اس کی گلوگرفتہ آواز میں پہلے جیسی گونج نہیں رہی تھی؛ وہ سوال جن کے جواب اسے زبانی یاد تھے انھیں پوچھنے میں اس کا سابقہ جوش وخروش جاتا رہا تھا؛ شام کے وقت جب وہ فتح کا ذکر کرتا، مستقبل کا، اس کا کہ ہمیں کس طرح بیدار ہو کر خود کو بچانا چاہیے، تو یوں لگتا کہ خود اس کی آواز کو، جو وقت کے ساتھ ساتھ کمزور پڑتی جا رہی تھی، جو وہ کہہ رہا تھا اس پر یقین نہیں تھا۔ اس کا وہ آخری پیکر جو میری یادداشت میں محفوظ ہے اس میں وہ چند بھونچکے سلاوی دیہاتیوں سے اوپرے دل سے باز پرس کر رہا ہے، دریں اثنا ایک گندھک رنگ دھویں جیسی برسات بس دوبارہ شروع ہو رہی ہے۔ ہم مزید نہیں سننا چاہتے تھے اور ان سے دور کھڑے رہے؛ خواب ناک روشنی کے پار، جسے پانی نے پھیلا دیا تھا، ہم نے انھیں طلاکاری کے چوکھٹے میں جڑے بھاری بھرکم آئینے کی بھیگی سطح کو خالی خالی نظروں سے تکتے ہوئے دیکھا جو خوجہ انھیں باری باری پکڑا رہا تھا۔

ہم ان ''شکاری'' مہمات پر دوبارہ نہیں گئے؛ ہم نے دریا پار کر لیا تھا اور پولستانیوں کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمارا ہتھیار راستوں پر بالکل آگے نہ بڑھ سکا جو غلیظ بارش میں کیچڑ سے لتھڑ گئے تھے، اور روز بروز بھاری ہوتا جا رہا تھا، اور اب جبکہ مارچ کو بہ سرعت آگے بڑھنے کی ضرورت تھی، اُور سست رو کیے دے رہا تھا۔ اسی وقت یہ افواہیں کثرت سے پھیلنے لگیں کہ کس طرح ہماری محاصرے کی مشین — جس کے خلاف پاشا پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے — ہم پر بدبختی، حتیٰ کہ قہرِ الٰہی، لائے گی؛

Scanned with CamScanner

اور یُنی چری کی کانا پھونسیوں نے، جنھوں نے خوجہ کے ''تجربوں'' میں شرکت کی تھی، انھیں اور بھی چیٹ پٹا بنا دیا۔ ہمیشہ کی طرح، یہ خوجہ نہیں تھا بلکہ میں، ایک کافر، جسے انھوں نے مورد الزام ٹھہرایا۔ جب خوجہ اپنی بک بک شروع کرتا، جس میں شعر کے خمیر کی ملاوٹ سے اب خود سلطان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا، اور ہتھیار کی ناگزیریت کا ذکر کرتا، غنیم کی طاقت کا، کہ کس طرح ہمیں جوش میں آ کر عمل پر آمادہ ہونا چاہیے، تو حاکم کے خیمے میں مجتمع پاشاؤں کو یہ سب سن کر اور وثوق ہو جاتا کہ ہم ڈھکوسلے باز ہیں اور ہمارا ہتھیار بدبختی لا کر رہے گا۔ وہ خوجہ کو ایک روگی سمجھتے جو راہ سے بھٹک گیا ہو لیکن جسے بچایا جا سکتا ہو؛ صحیح معنوں میں خطرناک، صحیح معنوں میں مجرم تو میں تھا، جس نے خوجہ اور حاکم کو فریب دیا تھا اور یہ بدشگون منصوبے تراشے تھے۔ رات کو جب ہم اپنے خیموں میں چلے جاتے تو خوجہ اپنی تباہ شدہ آواز میں ان پاشاؤں کو بے نقط سناتا جس طرح ماضی میں اپنے احمقوں کی زجر و توبیخ کیا کرتا تھا، لیکن ان برسوں میں جس مسرت اور امید کو میرا خیال تھا ہم زندہ رکھ سکے تھے اس کا کہیں دور دور نام و نشان بھی باقی نہیں بچا تھا۔

بہر کیف، میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہنوز دست کش ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ دو دن بعد، جب ہمارا ہتھیار مارچ کے بیچوں بیچ کیچڑ میں پھنس گیا، میری رہی سہی امید بھی رخصت ہو گئی؛ لیکن خوجہ مسلسل کوشش کرتا رہا، بیماری کے باوجود۔ کوئی ہماری مدد کے لیے ایک آدمی بھی دینے کو تیار نہ تھا، ایک گھوڑا تک؛ وہ سلطان کے پاس گیا اور تقریباً چالیس گھوڑے لے آیا، انھیں توپ سے، جس میں جُتے تھے، آزاد کروایا، اور آدمیوں کی ایک جماعت اکٹھا کی؛ شام ہونے تک، ٹھیک ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سارا دن زور مارنے کے بعد جو دعا کر رہے تھے کہ یہ کیچڑ میں اور گڑ جائے، اس نے بھر کر گھوڑوں پر بری طرح کوڑے برسانے شروع کیے اور ہمارے عفریتی کیڑے کو حرکت دی۔ وہ شام اس نے پاشاؤں سے بحثا بحثی میں گزاری، جو ہم اور ہمارے ہتھیار سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ فوج کی ساری قوت نچوڑے لے رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بدبختی بھی لا رہا ہے، لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ اسے فتحیابی پر اب اور یقین نہیں رہا ہے۔

اس شب جب میں نے ہمارے خیمے میں عود پر، جو میں فوجی مہم پر ساتھ لے آیا تھا، کچھ بجانے کی کوشش کی تو خوجہ نے اسے میرے ہاتھ سے جھپٹ کر ایک طرف پھینک دیا۔ کیا مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے سر کے خواہاں ہیں؟ مجھے معلوم تھا۔ بولا کہ اگر وہ میرے سر کے بجائے اس کے سر کا مطالبہ کرتے تو

اسے اس سے زیادہ خوشی ہوتی۔ اس کا بھی مجھے علم تھا، لیکن میں خاموش رہا۔ میں دوبارہ اپنا عود اٹھانے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے روک دیا، بولا کہ اسے اُس مقام کے بارے میں اور کچھ بتاؤں، اپنے وطن کے بارے میں۔ جب میں نے ایک دو من گھڑت قصے سنا دیے، جیسے حاکم کو سنائے تھے، تو وہ خفا ہو گیا۔ وہ سچ کا خواستگار تھا، عین مین جو پیش آیا تھا اس کا: اس نے میری ماں، میری منگیتر، میرے بھائیوں اور بہنوں کی بابت پوچھا۔ جب میں نے ''سچ'' بیان کرنا شروع کیا تو وہ بھی شامل ہو گیا، وہ اطالوی لفظ، جو مجھ سے سیکھے تھے، بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑا دیے، مختصر، نامکمل فقرے جن سے میں کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔

اگلے چند دنوں میں، جب اس نے تباہ شدہ دفاعی مورچہ بندیاں دیکھیں جن پر ہمارے ہراول دستوں نے قبضہ کر لیا تھا، تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بڑی مایوسی کے عالم میں عجیب قسم کے گھناؤنے خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک صبح جب ہم ایک گاؤں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے جو ہماری توپوں کے گولوں کی زد میں آ گیا تھا، تو وہ ایک دیوار کے دامن میں زخمیوں کو کرب کے عالم میں مرتے دیکھ کر گھوڑے سے اتر گیا اور دوڑ کر ان کی طرف گیا۔ فاصلے سے دیکھتے ہوئے پہلے مجھے خیال ہوا کہ وہ ان کی مدد کرنا چاہتا ہے، گویا اگر ترجمان ساتھ ہوتا تو وہ ان سے ان کے زخموں کا حال پوچھتا؛ پھر میں نے جان لیا کہ وہ ایک ایسے جوش کی گرفت میں ہے جس کی وجہ میں محسوس کر سکتا ہوں: وہ ان سے کوئی اور بات پوچھنا چاہتا تھا۔ اگلے روز جب ہم حاکم کے ساتھ تباہ و برباد مورچہ بندیوں اور سڑک کے دو رویہ چھوٹے چھوٹے میناروں کے معائنے کے لیے گئے، تو وہ ابھی تک اسی مشتعل حالت میں تھا: اس کی نظر ایک زخمی آدمی پر جا پڑی جس کا سر ابھی تک جسم سے جدا نہیں ہوا تھا اور جو کاملاً مسمار عمارتوں اور گولہ باری سے چھلنی چوبی سدِ راہوں کے درمیان پڑا تھا، اور اس کی طرف دوڑ پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے آیا، تاکہ اسے کوئی اوچھی حرکت کرنے سے باز رکھوں، اس سے خوفزدہ کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے ہی اسے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے، یا شاید محض گرے ہوئے تجسس کے باعث۔ گویا اس کو یقین تھا کہ زخمی، جن کے جسم قذیفوں اور توپ کے گولوں سے تار تار ہو گئے ہیں، موت کا نقاب منھ پر تاننے سے پہلے اسے کچھ بتا سکیں گے؛ خوجہ ان سے استفسار کرنے کے لیے تیار تھا تاکہ وہ یہ اس پر افشا کر دیں: وہ ان سے وہ عمیق سچائی معلوم کرے گا جو ایک آن میں سب کچھ بدل کر رکھ دے گی، لیکن میں نے دیکھا کہ موت سے قریب ان چہروں کی مایوسی میں اسے خود اپنی مایوسی نظر آ رہی ہے، اور جب ان سے قریب ہوا

تو کچھ بول نہ سکا۔

اس دن جھٹ پٹے کے وقت، یہ معلوم کر کے کہ حاکم اس بات پر بپھرا ہوا ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود دوپیو کے قلعے پر قبضہ نہیں ہوسکا ہے، خوجہ سلطان کے پاس اسی جوش وخروش کی حالت میں گیا۔ جب لوٹا تو خائف تھا، لیکن کیوں خائف تھا یہ نہیں معلوم تھا۔ اس نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ اپنا ہتھیار میدان جنگ میں اتارنے کا خواہشمند ہے، کہ صرف اسی دن کے واسطے وہ برسوں اس پر عرق ریزی کرتا رہا ہے۔ حاکم نے، میری توقع کے برخلاف، اقرار کیا کہ ہاں وقت آ گیا ہے، لیکن یہ ضروری سمجھا کہ سنہری بالوں والے حسین پاشا کو کچھ اور مہلت دینے کا فیصلہ کرے، جسے اس نے قبل ازیں قلعے پر دھاوا بولنے پر مامور کیا تھا۔ حاکم نے یہ کیوں کہا؟ یہ ان سوالوں میں سے ایک ہے جس کے بارے میں برسوں مجھے کبھی ٹھیک سے یقین نہیں ہوسکا کہ یہ خوجہ نے مجھ سے پوچھا تھا یا خود اپنے سے؛ کسی وجہ سے اب میں مزید خود کو اس سے قریب نہیں محسوس کر رہا تھا، اس پریشانی سے میں بھر پایا تھا۔ خوجہ نے خود ہی سوال کا جواب دے دیا: اس لیے کہ انھیں اس بات کا خوف تھا کہ فتح کے کچھ حصے میں کہیں وہ بھی شریک نہ ہو جائے۔

اگلی دوپہر تک، جب ہمیں اطلاع ملی کہ سنہری بالوں والا حسین پاشا ہنوز قلعہ فتح نہیں کرسکا ہے، خوجہ نے اپنی ساری طاقت خود کو یہ باور کرانے میں لٹا دی کہ اس کا گمان درست تھا۔ جب سے یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ میں ایک بدبخت جاسوس ہوں، میں نے حاکم کے خیمے میں جانا بند کر دیا تھا۔ اس رات جب خوجہ دن کے واقعات کی تعبیر کرنے گیا تو فتح اور خوش قسمتی کے قصے سنائے جن پر لگتا ہے سلطان کو یقین آ گیا تھا۔ جب وہ ہمارے خیمے لوٹا تو اس نے اس آدمی کا رجائی انداز اختیار کیا ہوا تھا جسے اعتماد ہو کہ آخر میں وہ شیطان کی ٹانگیں توڑ کر ہی رہے گا۔ اس کو سنتے ہوئے میں اس کی رجائیت کے مقابلے میں اس کی شدید کوشش سے زیادہ متاثر ہوا جو وہ بظاہر اسے قائم رکھنے کے لیے کر رہا تھا۔

اس نے وہی قدیم ''ہماری'' اور ''ان کی'' کہانی دہرائی، آنے والی فتح کی، لیکن اس کی آواز میں ایک ایسی دل گرفتگی آ گئی تھی جو مجھے پہلے کبھی سنائی نہیں دی تھی، جو کسی افسردہ لے کی طرح ان کہانیوں کی ہمرہی کر رہی تھی: یوں جیسے وہ بچپن کی کسی یاد کا ذکر کر رہا ہو جس سے ہم دونوں ہی بخوبی واقف ہوں کیونکہ ہم ایک پوری زندگی میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔ میں نے جب اپنا عود اٹھایا تو اس

Scanned with CamScanner

نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اور نہ اس وقت جب میں نے عود کے تاروں کو اُن گھڑ پنے سے چھیڑا: وہ مستقبل کا ذکر کر رہا تھا، وہ شاندار دن جن سے ہم دریا کے دھاروں کا رخ حسبِ منشا موڑ کر لطف اندوز ہوں گے، لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ ماضی کا ذکر کر رہا ہے: آسودگی کے رؤیا میری آنکھوں کے سامنے تیر گئے، کسی گھر کے الگ تھلگ پائیں باغ میں کوئی پُروقار درخت، روشنی سے جگمگاتے گرم کمرے، ڈنر ٹیبل کے گرد ایک پرمسرت گھرانے کا ہجوم۔ برسوں میں پہلی مرتبہ اس نے مجھے آسودگی کا احساس دلایا؛ میں سمجھ گیا کہ یہ کہتے ہوئے کہ یہ سب چھوڑنا بڑا کٹھن ہوگا، کہ اسے یہاں کے لوگوں سے محبت ہے، وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔ پھر، کچھ دیر کے لیے ان لوگوں پر غور کرتے ہوئے، اسے اپنے احمق یاد آ گئے اور وہ غصے سے بھڑک اٹھا، اور میں نے سوچا کہ وہ حق بجانب ہے۔ ایسا لگا کہ اس کی رجائیت محض ایک تصنع نہیں؛ شاید اس لیے کہ یہ احساس کہ ایک نئی زندگی بس شروع ہونے ہی والی ہے ایک ایسی چیز تھی جس میں ہم دونوں شریک تھے، یا اس لیے کہ مجھے خیال آیا کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو خود بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرتا، خدا جانے۔

اگلی صبح جب ہم نے محاذ سے قریب غنیم کی ایک چھوٹی سی مورچہ بندی کے خلاف اپنا ہتھیار آزمانے کے لیے میدان میں اتارا، تو ہم دونوں کو ایک ہی جیسا پراسرار پیشگی احساس تھا کہ یہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے گا۔ ہتھیار کے پہلے حملے ہی میں وہ سو آدمی جو حاکم نے ہماری مدافعت کے لیے مہیا کیے تھے صف بندی توڑ کر تتر بتر ہو گئے۔ چند خود ہتھیار کے نیچے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اور کچھ، بے اثر گولہ باری کے بعد، اس وقت نشانہ بن گئے جب ہتھیار کسی گدھے کی طرح کیچڑ میں پھنس گیا اور وہ بغیر کمک کے رہ گئے۔ زیادہ تر بدبختی کے خوف کے مارے فرار ہوئے، اور ہم اس قابل نہ رہے کہ تازہ حملے کے لیے اپنی شیرازہ بندی کر سکیں۔ ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے ہوں گے۔

بعد میں، جب جیالے حسن پاشا اور اس کے سپاہیوں نے ایک گھنٹے کے اندر اندر بغیر ایک آدمی بھی ضائع کیے ایک مورچہ ہتھیا لیا، تو خوجہ نے اس عمیق سائنس کو ایک مرتبہ پھر آزمانے کا فیصلہ کیا، اس مرتبہ ایسی امید کے ساتھ جو میرے خیال کے مطابق میں بھی بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا، لیکن مورچے پر تعینات سارے کا فر سپاہ تلوار کی نذر ہو گئے تھے: آتش زدہ سدود کے ملبے میں ایک فردِ واحد بھی نہیں بچا تھا جو آخری سانس لے رہا ہو۔ اور جب اس نے ایک طرف سروں کا انبار دیکھا جو حاکم کو دکھانے

Scanned with CamScanner

لے جائے جانے والے تھے، تو مجھے جو وہ سوچ رہا تھا اس کا فوراً اندازہ ہو گیا؛ مجھے اس کی لبھاوٹ حق بجانب بھی معلوم ہوئی، لیکن اب میں اسے اتنی دور جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا: میں نے اس کی طرف اپنی پیٹھ کر لی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے دوبارہ دیکھا، تجسس سے مغلوب ہو کر، تو وہ سروں کے ڈھیر سے دور ہوتا جا رہا تھا؛ مجھے کبھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کتنی دور تک گیا تھا۔

دوپہر کو ہم مارچ میں آ شامل ہوئے اور سنا کہ دوپیو کے قلعے پر ابھی تک قبضہ نہیں ہو سکا ہے۔ بظاہر سلطان سخت طیش میں آیا ہوا تھا، وہ سنہری بالوں والے حسین پاشا کو سزا دینے کی بات کر رہا تھا: ہم سب کے سب، ساری فوج، محاصرے میں شامل ہوں گے! حاکم نے خوجہ سے کہا کہ اگر شام تک قلعہ فتح نہیں ہوا تو صبح کے حملے میں ہمارا ہتھیار استعمال کیا جائے گا۔ اسی موقعے پر اس نے ایک نااہل کمانڈر کا سر قلم کر دینے کا حکم دیا جو پورے دن میں ایک مختصر سے مورچے پر قبضہ نہیں کر سکا تھا۔ مورچے پر ہمارے ہتھیار کی ناکامی پر، جس کی خبریں اب مارچ میں پھیل گئی تھیں، اس نے کوئی توجہ نہیں دی، اور نہ ان چہ میگوئیوں پر کہ یہ بدبختی لانے والا ہے۔ خوجہ فتح میں شرکت کا اب اور ذکر نہیں کرتا تھا: اگرچہ اس نے کہا تو نہیں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ سابق شاہی منجم کی موت کی بابت سوچ رہا ہے؛ اور جب میں اپنے بچپن کے مناظر یا اپنی املاکِ اراضی پر گھومتے پھرتے جانوروں کے خواب دیکھتا، تو جانتا کہ یہی سب چیزیں اس کے دماغ سے بھی گزر رہی ہیں؛ میں جانتا تھا وہ بھی یہی سوچ رہا ہے کہ قلعے کی فتح کی خبر ہماری نجات کا آخری موقع ہوگی، اور درحقیقت اسے اس موقعے پر اعتبار نہیں تھا، حقیقت میں وہ یہ موقع چاہتا بھی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک چھوٹا سا گرجا گھر اپنے گھڑیال سمیت ایک گاؤں میں جل رہا ہے جسے اس طیش میں تباہ کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کسی طرح فتح نہیں ہو رہا تھا، اور اس گرجا گھر میں ایک جیالے پادری کی مترنم مناجات ہمیں ایک نئی زندگی کی طرف بلا رہی تھی؛ کہ شمال کی طرف بڑھتے ہوئے جنگلی پہاڑیوں کے عقب میں ڈوبتے ہوئے سورج نے اس میں، جس طرح مجھ میں، کسی چیز کے درجۂ کمال کو خاموشی سے، احتیاط سے تکمیل تک پہنچانے کے احساس کو جگا دیا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد جب ہم نے سنا کہ نہ صرف سنہری بالوں والا حسین پاشا ناکام رہا ہے، بلکہ آسٹرین، ہنگیرین، اور قزاق بھی دوپیو کے محاصرے کے وقت پولستانیوں کے ساتھ آ شامل ہوئے ہیں، ہم نے بالآخر قلعے کو دیکھا۔ یہ ایک بلند پہاڑی کی چوٹی پر متمکن تھا، اس کے برجوں پر، جن پر

جھنڈے لہرا رہے تھے، ڈوبتے سورج کی مدھم سی سرخ روشنی پڑ رہی تھی، اور یہ سفید رنگ کا تھا: خالص ترین سفید اور خوش نما۔ خدا جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ اتنی حسین اور نا قابل حصول شے آدمی صرف خواب ہی میں دیکھ سکتا ہے۔ اس خواب میں آپ اس راہگزار کے سہارے سہارے دوڑتے جائیں گے جو ایک تاریک جنگل سے بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے، اس جان توڑ کوشش میں کہ کسی طرح اس پہاڑی کی چوٹی پر نکلے دن تک پہنچ جائیں، اس عاج رنگ، پُرشکوہ عمارت تک؛ جیسے وہاں کوئی شاندار محفلِ رقص جاری ہو جس میں آپ شامل ہونا چاہتے ہوں، مسرت کا ایسا موقع جسے آپ ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے ہوں، اور اگرچہ آپ اس راہگزار کی انتہا تک کسی لمحے بھی پہنچنے کے متوقع ہوں، یہ کبھی انتہا تک پہنچنے والی نہ ہو۔ جب مجھے پتا چلا کہ تاریک جنگلوں اور ڈھلان کے دامن کے درمیان کے نشیبی علاقے میں دریا کی باڑھ ایک متعفن دلدل چھوڑ گئی ہے، اور پیادہ فوج، گو اس نے دلدلی علاقہ ضرور عبور کر لیا تھا، سخت کوشش اور توپوں کی گولہ باری کی امداد کے باوجود، ڈھلان پر کسی طرح نہ چڑھ سکی تو میں نے اس سڑک کا خیال کیا جو ہمیں یہاں لائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز اتنی ہی کامل ہے جتنا اس خالص ترین سفید قلعے کا منظر جس کے برجوں کے اوپر پرندے اڑتے پھر رہے تھے، اتنی کامل جتنی سیاہ پڑتی ہوئی ڈھلان کی کھڑی چٹان اور ساکت وصامت، تاریک جنگل۔ اب میں یہ جان گیا تھا کہ وہ تمام چیزیں جو برسوں میرے تجربے میں اتفاقی طور پر آتی رہی تھیں، دراصل ناگزیر تھیں، کہ ہمارے سپاہ کبھی بھی قلعے کے سفید برجوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، کہ خوجہ بھی ٹھیک یہی سوچ رہا ہے۔ ہمیں پتا تھا کہ صبح جب ہمارا ہتھیار محاصرے میں شامل ہوگا تو دلدل میں دھنس کر رہ جائے گا، اپنے اندر اور اپنے اطراف میں ہمارے سپاہ مرنے کے لیے چھوڑ کر، کہ نتیجے میں آوازیں اٹھیں گی جو بدبختی کی افواہوں، خوف، اور سپاہیوں کے شکوے شکایات کو خاموش کرنے کے واسطے میرا سر طلب کریں گی، اور مجھے معلوم تھا کہ خوجہ کو بھی اس کا کامل احساس ہے۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح ایک بار، سالوں پہلے، اس کو اپنے بارے میں گفتگو کرنے پر اکسانے کی خاطر، میں نے اپنے بچپن کے ایک دوست کا ذکر کیا تھا جس کے ساتھ میں نے ایک ہی وقت میں ایک جیسی چیز سوچنے کی عادت ڈال لی تھی۔ مجھے بالکل شک نہیں تھا کہ اس وقت وہ بھی ٹھیک یہی باتیں سوچ رہا تھا۔

اس شب بڑی رات گئے وہ سلطان کے خیمے میں گیا اور لگا جیسے کبھی نہیں لوٹے گا۔ چونکہ جو وہ

حاکم سے کہنے والا تھا میں اس کا اندازہ بہ آسانی کر سکتا تھا، حاکم جو اس سے چاہے گا کہ دن کے واقعات اور مستقبل کی تعبیر پاشاؤں کے واسطے کرے، کچھ دیر تک میں اس امکان پر غور کرتا رہا کہ کھڑے اس کی گردن ماردی گئی ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ جلاد مجھے لینے آئیں گے۔ بعد میں میں نے خیال کیا کہ وہ خیمے سے نکل گیا ہے اور، مجھے بتانے کے لیے توقف کیے بغیر، سیدھا اندھیرے میں جگمگاتے قلعے کے سفید برجوں کی طرف چلا گیا ہے؛ کہ چوکیداروں سے بچ نکل کر، دلدل سے گزر کر، جنگل پار کر کے وہ قلعے تک پہنچ گیا ہے۔ میں صبح کے آنے کا انتظار کر رہا تھا، بغیر کسی ولولے کے اپنی نئی زندگی کی بابت سوچ رہا تھا، کہ معاً وہ لوٹ آیا۔ بڑے عرصے کے بعد ہی، برسوں کے بعد، ان لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد جو اس رات سلطان کے خیمے میں موجود تھے، کہیں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ خوجہ نے عین مین وہی کہا تھا جو میرا اندازہ تھا وہ کہے گا۔ اس وقت اس نے وضاحتاً کچھ بھی نہیں کہا، وہ اتنی پھرتی سے اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا جیسے کوئی سفر پر جانے کے لیے کرتا ہے۔ بولا کہ باہر ایک سخت دبیز دھند پھیلی ہوئی ہے۔ میں سمجھ گیا۔

دن نکلنے تک میں اس سے ان سب چیزوں کی بابت بات کرتا رہا جو میں اپنے پیچھے وطن میں چھوڑ آیا تھا، اسے بتایا کہ میرا گھر کیسے تلاش کر سکتا ہے، اپنی ماں، باپ، بھائی بہنوں کے بارے میں بتایا، ایمپولی اور فلورنس میں ہمیں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میں نے اسے چند چھوٹی چھوٹی، خاص باتوں سے آگاہ کیا جن سے وہ مختلف لوگوں میں تمیز کر سکتا تھا۔ یہ سب بتاتے وقت مجھے یاد آیا کہ میں پہلے بھی اسے یہی سب بتا چکا ہوں، حتیٰ کہ اس بڑے سے کالے تِل کی بابت بھی جو میرے چھوٹے بھائی کی کمر پر ہے۔ بعض اوقات، حاکم کی دل جوئی کرتے ہوئے، یا اب یہ کتاب لکھتے ہوئے، یہ کہانیاں مجھے اپنی فنطاسیوں کا عکس معلوم ہوتی ہیں، صداقت نہیں، لیکن اُس وقت میں ان پر یقین کرتا تھا: میری بہن کی ہکلاہٹ حقیقی تھی، جس طرح ہمارے لباسوں کے بہت سارے بٹن، اور وہ بہت سی چیزیں بھی جو مجھے کھڑکی سے اپنے گھر کے عقبی باغ میں نظر آئی تھیں۔ صبح کے قریب میں سوچنے لگا کہ میں ان کہانیوں کے بہکاوے میں آ گیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ جاری رہیں گی، شاید اسی مقام سے جہاں آ کر رک گئی تھیں، اگرچہ بہت بعد میں ہی۔ مجھے معلوم تھا کہ خوجہ بھی یہی بات سوچ رہا ہے، کہ اسے بڑی خوشی سے اپنی کہانی پر یقین ہے۔

ہم نے ایک دوسرے کے کپڑوں کا بغیر جلد بازی کے اور بغیر کچھ کہے سنے تبادلہ کیا۔ میں نے اسے اپنی انگشتری اور وہ میڈیلین جوان تمام سالوں اس سے بچائے رکھے تھے، دیے۔ میڈیلین کے اندر میری نانی کی ماں کی تصویر تھی اور میری منگیتر کے بالوں کی ایک لٹ جو وقت کے ساتھ سفید پڑ گئی تھی؛ میرا خیال ہے وہ اسے پسند آیا، اس نے اسے اپنی گردن میں لٹکا لیا۔ پھر وہ خیمے سے نکلا اور چلا گیا۔ میں اسے پرسکوت دھند میں بتدریج غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ روشنی ہونے لگی تھی۔ نڈھال، میں اس کے بستر پر لیٹ گیا اور پرسکون نیند سو گیا۔

۱۱

اب میں اپنی کتاب کے اختتام تک پہنچ گیا ہوں۔ شاید تیز فہم قاریوں نے، یہ فیصلہ کر کے کہ میری کہانی درحقیقت بہت پہلے ہی ختم ہو چکی ہے، اسے ایک طرف ڈال دیا ہو۔ برسوں پہلے میں نے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔ ان صفحات کو ایک دراز میں ڈال دیا تھا، اس قصد سے کہ انھیں اب دوبارہ کبھی نہیں پڑھوں گا۔ اُن دنوں میرا ارادہ ذہن کو ان دوسری کہانیوں کی طرف منتقل کرنے کا تھا جو میں نے اختراع کیں، سلطان کے لیے نہیں بلکہ اپنی لطف اندوزی کے لیے، معاشقے جنھوں نے ان سرزمینوں میں جنھیں میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا، اجاڑ بیابانوں اور برفانی جنگلوں میں جنم لیا، جن کا تعلق ایک حیلہ باز سوداگر سے تھا جو ان میں کسی بھیڑیے کی طرح گھومتا پھرتا: میں اس کتاب کو فراموش کر دینا چاہتا تھا، اس کہانی کو۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ جو سُن چکا ہوں اور جس کا تجربہ کیا ہے، اس کے بعد ایسا کرنا آسان نہ ہوگا، میں شاید اس میں کامیاب بھی ہو گیا ہوتا اگر ایک مہمان دو ہفتے پہلے مجھ سے ملنے نہ آیا ہوتا اور مجھے اپنی کتاب باہر نکالنے پر قائل نہ کر لیتا۔ آج میں آخرکار یہ جان گیا ہوں کہ اپنی ساری کتابوں میں یہی وہ کتاب ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے: میں اسے اختتام تک پہنچاؤں گا جیسا کہ اسے پہنچنا چاہیے، جیسا کہ میں نے آرزو کی ہے، خواب دیکھا ہے۔

پرانی میز سے، جہاں بیٹھے میں اپنی کتاب ختم کر رہا ہوں، مجھے ایک ننھی سی بادبانی کشتی نظر آ رہی ہے جو سمندر کو جنت حصار سے استنبول کی طرف چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے، ایک پن چکی جو دور فاصلے میں زیتون کے باغوں میں چل رہی ہے، بچے جو باغ کی گہرائیوں میں انجیر کے درختوں کے نیچے کھیل

Scanned with CamScanner

میں دھکم پیل کر رہے ہیں، استنبول سے گیبز ے جانے والی خاک آلود سڑک۔ بہار اور گرما میں میں مشرق کی طرف، اناطولیہ، حتیٰ کہ بغداد اور دمشق جاتے ہوے کاروانوں کو دیکھتا ہوں؛ میں اکثر ان شکستہ بیل گاڑیوں کا نظارہ کرتا ہوں جو گھونگھے کی سست رفتاری سے رینگ رہی ہوتی ہیں، اور بعض اوقات فاصلے پر کسی گھڑسوار کو دیکھ کر جس کی پوشاک کو میں پہچان نہیں پاتا میرا دل ولولے سے بھر جاتا ہے، لیکن جب وہ قریب آتا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آ رہا ہے۔ ان دنوں کوئی نہیں آتا، اور اب میں جانتا ہوں کہ کبھی کوئی آئے گا بھی نہیں۔

لیکن مجھے کوئی گلہ شکوہ نہیں، اور میں اکیلا نہیں ہوں: شاہی منجمی کے زمانے میں میں نے اچھی خاصی رقم پس انداز کر لی تھی، میں نے شادی کی، میرے چار بچے ہیں؛ میں نے آنے والے رنج ومحن کی پیش بینی کر لی تھی اور اپنے عہدے سے عین وقت پر سبکدوش ہو گیا تھا؛ شاید اس بصیرت کے سبب جو مجھے اپنے پیشے کے دوران حاصل ہوئی تھی: سلطان کی فوجوں کے ویانا کوچ کرنے سے پہلے، کاسہ لیس مسخروں اور میرے بعد آنے والے منجم کے سر شکست کے جنون میں قلم کر دیے جانے سے پہلے، جانوروں سے اتنی محبت کرنے والے ہمارے حاکم کے معزول کیے جانے سے بہت پہلے، میں فرار ہو کر یہاں گیبز ے چلا آیا۔ میں نے یہ دیہی قیام گاہ تعمیر کروائی اور اپنی محبوب کتابوں، بچوں اور ایک دو ملازموں کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ میری بیوی، جس سے میں نے اپنی شاہی منجمی کے زمانے میں شادی کی تھی، عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہے، بڑی اچھی خانہ دار ہے اور میرے واسطے سارے گھر کا انتظام اور چند چھوٹے موٹے اور کام بھی کرتی ہے، اور مجھے اپنی کتابیں لکھنے اور خواب دیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ مجھے جو ستر برس کی عمر کو پہنچ رہا ہوں، سارا دن اس کمرے میں اکیلا پڑا رہتا ہوں۔ چنانچہ، اپنی کہانی اور اپنی زندگی کے واسطے مناسب خاتمے کی تلاش میں، میں جی بھر کے اُس کے بارے میں سوچتا ہوں۔

تاہم اولین سالوں میں میں نے کوشش کی کہ ایسا نہ کروں۔ دو ایک مرتبہ اگر حاکم نے اُس کا ذکر چھیڑنا بھی چاہا تو اسے احساس ہو گیا کہ اس موضوع میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اسی پر قناعت کر لی تھی؛ اسے بس تجسس سا تھا؛ لیکن خاص طور پر کس چیز کے بارے میں، اور کس قدر، یہ میں کبھی دریافت نہ کر سکا۔ شروع میں اس نے کہا کہ مجھے اُس سے متاثر ہونے پر، اُس سے سیکھنے پر شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔ اسے آغاز ہی سے معلوم تھا کہ وہ تمام کتابیں،

Scanned with CamScanner

تقویمیں، اور پیش گوئیاں جو میں نے اسے برسہا برس تک پیش کی تھیں دراصل اُسی کی تصنیف تھیں، اور یہ اُس سے کہہ بھی دیا تھا حتیٰ کہ اس وقت بھی جب میں ہنوز گھر پر ہمارے ہتھیار کے خاکوں پر سر مار رہا تھا جو آخرالامر کیچڑ میں جا پھنسا؛ اسے یہ بھی معلوم رہا تھا کہ اُس نے مجھے یہ سب بتا دیا تھا، جس طرح میں بھی اُسے سب کچھ بتا دیتا تھا۔ تو شاید دھاگے کا سرا ہنوز ہم دونوں کے ہاتھ سے نہیں نکلا تھا، لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ سلطان کے قدم میرے مقابلے میں زمین پر زیادہ استقامت سے جمے ہوئے ہیں۔ ان دنوں مجھے خیال آتا کہ حاکم مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے، ہر وہ چیز جانتا ہے جو اسے جاننی چاہیے اور مجھ سے صرف اپنا دل بہلا رہا ہے تاکہ مجھے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھ سکے۔ اور شاید میں اس تشکر کے دباؤ میں بھی تھا جو اس کے لیے یوں محسوس کرتا تھا کہ اس نے مجھے اس پسپائی سے بچائے رکھا تھا جس کا بیج دلدلی زمین میں بویا گیا تھا، اور سپاہیوں کی برافروختگی سے بھی جو عذاب کی افواہوں سے پاگل ہو گئے تھے۔ کیونکہ جب انھیں معلوم ہوا کہ کافر بھاگ نکلا ہے، تو چند سپاہ نے واقعی میرے سر کا مطالبہ کیا۔ اگر اولین سالوں میں سلطان نے مجھ سے بے تکلفانہ پوچھا ہوتا، تو مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کو ہر بات بتا دی ہوتی۔ ان دنوں ابھی یہ افواہ پھیلنی شروع نہیں ہوئی تھی کہ میں وہ نہیں تھا جو ہوں، میں کسی سے جو کچھ پیش آیا تھا اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا، مجھے اُس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

اس گھر میں اکیلے رہنے سے جس میں ہم برسوں تک ساتھ رہے تھے، مجھے اور زیادہ وحشت ہوئی۔ میری جیبیں روپے پیسے سے بھری تھیں، میرے پیر جلد ہی اس بازار کا راستہ جان گئے جہاں غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی؛ مہینوں تک میں وہاں آتا جاتا رہا تا آنکہ جس چیز کا متلاشی تھا وہ مل ہی گئی۔ آخر میں میں ایک بے چارے شیطان کو خرید کر گھر لے آیا جو حقیقت میں نہ مجھ سے مشابہ تھا نہ اُس سے۔ اس شب جب میں نے اس سے کہا کہ جو کچھ جانتا ہے مجھے سکھا دے، اپنے ملک کے بارے میں مجھے بتائے، اپنے ماضی کے بارے میں، حتیٰ کہ جن معاصی کا مرتکب ہوا ہے ان کا اعتراف کرے، جب میں اسے آئینے کے مقابل لایا، تو وہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔ وہ ایک خوفناک رات تھی، مجھے اس بے چارے آدمی پر رحم آیا، میرا قصد صبح اسے آزاد کر دینے کا تھا، لیکن میری بخیلی غالب آئی اور میں اسے دوبارہ فروخت کرنے کی نیت سے غلام بازار لایا۔ اس کے بعد میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی

Scanned with CamScanner

نیت کی بات محلے بھر میں پھیلوادی۔ وہ ہنسی خوشی آئے، یہ سوچتے ہوئے کہ بالآخر مجھے اپنے جیسا ہی بنا سکیں گے، کہ سڑک پر امن وسکون در آئے گا۔ خود میں بھی ان جیسا ہونے پر قانع تھا، میں نے رجائیت محسوس کی، سوچا کہ افواہیں پھیلنی بند ہوگئی ہیں، کہ میں اطمینان کی زندگی گزار سکتا ہوں جس میں سال بہ سال اپنے حاکم کے واسطے کہانیاں گھڑ سکوں۔ میں نے اپنے لیے بیوی کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا؛ وہ شام کو میرے لیے عود بھی بجا سکتی تھی۔

جب افواہیں دوبارہ پھیلنے لگیں تو اول مجھے خیال ہوا کہ کہیں یہ سلطان کی کارستانی ہی نہ ہو کیونکہ مجھے تشویش میں دیکھ کر اسے لطف آتا تھا اور مجھ سے پریشان کر دینے والے سوال پوچھ کر بھی۔ شروع میں جب وہ اچانک مجھ سے اس قسم کی بات پوچھتا کہ ''کیا ہم خود کو جانتے ہیں؟ آدمی کو جاننا چاہیے کہ وہ کون ہے؟'' تو میں اس سے ہراساں نہیں ہوتا تھا؛ میں سوچتا کہ یہ حوصلہ شکن سوال اس نے اپنے خوشامدیوں، جنھیں اس نے دوبارہ اپنے اردگرد جمع کرنا شروع کر دیا تھا، میں کے ان بوجھ بجھکڑوں سے سیکھے ہیں جن کو یونانی فلسفے سے دلچسپی تھی۔ جب اس نے مجھ سے اس موضوع پر کچھ قلمبند کرنے کے لیے کہا تو میں نے اسے اپنی آخری کتاب پیش کر دی جو غزالوں اور گوریوں کے قناعت پسند ہونے کے بارے میں تھی کیونکہ وہ اپنے پر کبھی غور نہیں کرتی تھیں اور ذرا بھی خود آگاہ نہیں تھیں۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے کتاب پر سنجیدگی سے توجہ دی اور اسے لطف کے ساتھ پڑھا تو میری تشنگی کیفیت میں قدرے تخفیف ہوئی، لیکن گپ بازی میرے کانوں تک پہنچنے لگی: یہ کہا گیا کہ میں سلطان کے ساتھ ایک بے وقوف کا برتاؤ کرتا ہوں، اس شخص سے جس کی جگہ لے لی ہے ذرا بھی تو مشابہت نہیں رکھتا، وہ زیادہ دبلا پتلا اور نازک تھا جبکہ میں فربہ ہوگیا ہوں؛ جب میں نے کہا میں وہ سب جو وہ جانتا ہے نہیں جان سکتا، تو وہ سمجھ گئے کہ جھوٹ بول رہا ہوں؛ جنگ کے دوران ایک دن میں بھی بدبختی لاؤں گا اور پھر اُسی کی طرح فرار ہو جاؤں گا؛ ملکی راز دشمنوں کے حوالے کر دوں گا اور شکست پہنچانے کی راہ آسان کر دوں گا، وغیرہ وغیرہ۔ ان افواہوں سے، جو میرے نزدیک سلطان نے پھیلائی تھیں، خود کو محفوظ رکھنے کے لیے، میں دعوتوں اور تقاریب سے الگ تھلگ ہوگیا، عوام میں کم سے کم نظر آنے لگا، اپنا وزن گھٹا لیا، اور بڑی احتیاط سے ان باتوں کی پوچھ تاچھ کرنے لگا جو آخری رات حاکم کے خیمے میں زیر بحث آئی تھیں۔ میری بیوی ایک کے بعد ایک بچے جن رہی تھی، میری آمدنی اچھی خاصی تھی، میں افواہوں کو

Scanned with CamScanner

بھول جانا چاہتا تھا، اُس کو، ماضی کو، اور سکون سے اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔

میں تقریباً مزید سات سال ثابت قدمی سے کام کرتا رہا، اور شاید آخر تک کرتا رہتا اگر میرے اعصاب میں توانائی باقی رہتی، اہم تر یہ کہ اگر مجھے یہ احساس نہ ہو گیا ہوتا کہ سلطان کے حلقے کا ایک بار پھر اخراج (purge) ہونے والا ہے؛ میں ان دروازوں سے گزرا ہوتا جو حاکم نے مجھ پر وا کیے ہوتے اور اپنی سابقہ زندگی سے دست کش ہوتا جسے بھلا دینے کا آرزومند تھا۔ اپنی شناخت کے بارے میں سوالات کا جواب دینے میں اب میں خاصا بے شرم ہو گیا تھا حالانکہ پہلے یہی سوالات مجھے کافی چوکنا کر دیتے تھے: ''اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے کہ آدمی کیا ہے؟'' میں کہتا۔ ''اہم یہ ہے کہ ہم نے کیا کیا ہے اور کیا کریں گے۔'' میرا خیال ہے کہ الماری کا یہی دروازہ تھا جس کے ذریعے سلطان نے میرے دماغ تک رسائی حاصل کر لی تھی! جب اس نے مجھ سے اطالیہ کی بابت پوچھا، وہ ملک جہاں وہ فرار ہوا تھا، اور میں نے جواب دیا کہ اس کی بابت میں بہت کم جانتا ہوں، تو وہ غصے میں آ گیا: اسے معلوم تھا کہ اُس نے مجھے ہر بات بتا دی تھی، میں خوفزدہ کیوں تھا، بس اتنا ہی کافی تھا کہ جو اُس نے کہا تھا یاد رکھوں۔ چنانچہ میں نے سلطان کے واسطے بڑی تفصیل کے ساتھ دوبارہ اُس کے بچپن اور اُس کی دل فریب یادوں کو بیان کیا، جن میں سے کچھ میں نے اِس کتاب میں شامل کی ہیں۔ شروع میں میرا حوصلہ کافی مضبوط تھا، میرے حسب منشا سلطان میری بات سنتا — جیسے کسی کو وہی کہتے سن رہا ہو جو کسی اور سے سن چکا ہو — لیکن بعد کے سالوں میں اس سے بھی آگے نکل گیا؛ وہ میرے کہے کو اس طرح سننے لگا جیسے یہ وہ بیان کر رہا ہو: مجھ سے وہ جزویات معلوم کرتا جو صرف وہی جان سکتا تھا، مجھ سے کہتا کہ ڈروں نہیں، اور جو جواب ذہن میں سب سے پہلے آئے وہی دوں: وہ کیا واقعہ تھا جو اُس کی بہن کی ہکلاہٹ کا باعث بنا؟ پادوآ کی دانش گاہ میں اُسے کیوں داخلہ نہیں ملا؟ وینس میں جو پہلا آتش بازی کا تماشا اُس نے دیکھا تھا تب اُس کے بھائی نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟ جب میں حاکم کو یہ تفصیلات یوں بتا رہا ہوتا جیسے یہ مجھے ہی پیش آئی ہوں، تو اس وقت ہم پانی پر ایک دن گزار رہے ہوتے، یا کسی پوکھر کے پاس جو مینڈکوں اور سوسن سے کھچا کھچ بھرا ہوتا؛ یمیں پنجروں میں بے حیا بندروں کو دیکھتے ہوئے آرام کر رہے ہوتے، یا ان میں کے کسی باغ میں چہل قدمی کر رہے ہوتے جو، چونکہ یہاں ان دونوں نے کبھی سیر کی تھی، ان یادوں سے بھرا تھا جن میں وہ شریک رہے تھے۔ اُس

Scanned with CamScanner

وقت حاکم، میری کہانیوں اور باغوں میں کھلتے غنچوں کی مانند ہماری یادوں کی اٹکھیلیوں سے دل شاد، خود کو مجھ سے قریب محسوس کرتا اور اُس کا ذکر کچھ اس طرح کرتا جیسے کسی ہمدمِ دیرینہ کو یاد کر رہا ہو جو ہمیں دغا دے گیا ہو: بولا اچھا ہی ہوا جو وہ فرار ہو گیا، کیونکہ اُس کی باتوں میں دل بستگی محسوس کرنے کے باوجود اکثر موقعوں پر اُس کی گستاخی اس کا پیمانۂ صبر بھی لبریز کر دیتی تھی اور اُس کو قتل کروا دینے کا خیال آتا۔ اس نے بعض ایسی باتیں بھی افشا کیں جن سے میں خوفزدہ ہو گیا کیونکہ میں ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکا کہ ہم دونوں میں سے کون اس کا موضوعِ بحث ہے، تاہم اس کے اندازِ تکلّم میں اپنائیت تھی، تشدّد نہیں: ایسے دن بھی تھے جب، اُس کی خود ناشناسی کو ناقابلِ برداشت پا کر، اسے ڈر لگتا کہ عالمِ طیش میں کہیں اُسے مروا ہی نہ ڈالے — اُس آخری رات وہ بس جلاّد کو بلوانے ہی والا تھا! ازاں بعد، اس نے کہا کہ میں گستاخ نہیں تھا؛ میں دنیا میں خود کو سب سے زیادہ ہوشیار، سب سے زیادہ باصلاحیت نہیں گردانتا تھا؛ میں نے طاعون کی دہشت کی اپنے فائدے کے مطابق ترجمانی کی جسارت نہیں کی تھی؛ میں نے رات رات بھر ہر فرد و بشر کو ان طفل بادشاہوں کے قصوں سے بیدار نہیں رکھا تھا جنھیں سولیوں پر چارچوب کیا گیا تھا؛ اور اب کوئی ایسا نہیں رہ گیا تھا جس کے پاس دوڑ کر جاؤں اور سلطان کے خواب سن لینے کے بعد انھیں دہراؤں اور ان کا مضحکہ اڑاؤں، کوئی بھی نہیں جس کے ساتھ مل کر اس کو گمراہ کرنے کے لیے احمقانہ اور فرحت بخش افسانے تراش سکوں! دورانِ سماعت مجھے خیال گزرا کہ اپنے کو، ہم دونوں کو، باہر سے دیکھ رہا ہوں، جیسے خواب میں، اور مجھے احساس ہوا کہ ہم دھاگے کا سرا کھو بیٹھے ہیں۔ لیکن آخری مہینوں میں سلطان، جیسے مجھے پاگل کرنے پر تلا بیٹھا ہو، اور بھی آگے بڑھ گیا: میں اُس کی طرح نہیں تھا، میں نے اُس کی طرح اپنا ذہن و ادراک سوفسطائیوں کے حوالے نہیں کر دیا تھا جو "ان میں" اور "ہم میں" فرق کرتے تھے! آتش بازی کے دوران ہشت سالہ حاکم نے دوسرے کنارے سے تماشا دیکھا تھا جب اس کی ہم سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، میرا اپنا شیطان تیرہ و تاریک آسمان میں اُس کے واسطے اُس دوسرے شیطان کی ظفرمندی کا باعث ہوا تھا، اور اب اُسی کے ہمراہ اُس دیس چلا گیا تھا جہاں اُس کا خیال تھا کہ اُسے امن و سکون مل جائے گا! بعد میں، باغ میں چہل قدمیوں کے دوران، جو ہمیشہ یکساں ہوتیں، حاکم متفکرانہ انداز میں پوچھتا: کیا یہ جاننے کے لیے کہ لوگ دنیا کے چاروں کونوں اور ساتوں اقلیموں میں ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں آدمی کا سلطان ہونا ضروری ہے؟ ڈر کے مارے میں کوئی

Scanned with CamScanner

جواب نہ دیتا؛ گویا مزاحمت کی میری آخری کوشش کو توڑنے کے ارادے سے وہ دوبارہ پوچھتا: کہ آدمی ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں، تو کیا یہ اس بات کا بہترین ثبوت نہیں کہ آدمی ہر جگہ ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں؟

کیونکہ مجھے امید تھی کہ سلطان اور میں ایک نہ ایک دن اُسے بھول جانے میں کامیاب ہو جائیں گے، اور کیونکہ میں نے مزید روپیہ پیسہ بچانے کی احتیاط بھی کر لی تھی، میں نے اس اذیت کو صبر و تحمل سے برداشت کیا ہوگا؛ کیونکہ میں ابہام کے ساتھ آنے والے خوف کا عادی ہو چلا تھا۔ وہ میرے ذہن کے دروازے کو بے رحمی سے کھولتا اور بند کرتا، جیسے کسی جنگل میں جہاں ہم اپنا راستہ کھو بیٹھے ہوں کسی خرگوش کے تعاقب میں اِدھر اُدھر اپنا گھوڑا دوڑا رہا ہو۔ حد تو یہ کہ وہ اب ہر کس و ناکس کے سامنے یہ عمل دہرانے لگا تھا؛ وہ اب پھر اپنے قدموں میں لوٹنے والے چاپلوسوں کے نرغے میں تھا۔ مجھے ڈر لگا ہوا تھا کیونکہ مجھے گمان تھا کہ ایک اور اخراج (purge) عمل میں آئے گا جس کے نتیجے میں ہماری ساری املاک ضبط کر لی جائیں گی، اور کیونکہ مجھے ان مصائب کا احساس ہو گیا تھا جو جلد نازل ہونے والے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب اُس نے مجھ سے وینس کے پُلوں کی بابت بتانے کے لیے کہا تھا، اس دسترخوان کی کشیدہ کاری کی بابت جس پر وہ لڑکپن میں ناشتہ کیا کرتا تھا، اُس کے گھر کے پچھواڑے باغ پر کھلنے والی کھڑکی سے آتے ہوئے منظر کی بابت جو اُسے اس وقت یاد آیا تھا جب اُس کا سر اسلام لانے سے انکار پر بس قلم کیا ہی جانے والا تھا — استنبول سے جس قدر جلد ہو سکے فرار ہونے کا فیصلہ میں نے ٹھیک اس وقت کیا جب سلطان نے مجھے ان تمام قصوں کو ایک کتاب میں قلمبند کرنے کا حکم دیا تھا، گویا یہ سب جو مجھے پیش آیا تھا یہ اُسی کی روئیداد تھی۔

میں گیبزے کی ایک مختلف رہائش گاہ میں اٹھ آیا تاکہ اُسے فراموش کر سکوں۔ پہلے مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ شاہی محل کے پہرے دار میری تلاش میں آتے ہوں گے، لیکن کوئی بھی میرے تعاقب میں نہیں آیا، اور میری آمدنی کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچی؛ یا تو مجھے بھلا دیا گیا تھا، یا پھر حاکم خفیہ طور پر میری نگرانی کروا رہا تھا۔ میں نے اس کی بابت مزید نہیں سوچا، اپنے کام کی شروعات کر دی، یہ مکان تعمیر کروایا، اپنے حسبِ منشا، اپنی داخلی لہروں کے مطابق پائیں باغ لگوایا؛ میں اپنی کتابوں کے مطالعے میں وقت گزارتا، اپنی دل جوئی کے لیے قصے کہانیاں لکھتا اور مجھ سے رجوع کرنے والے ملاقاتیوں کو

صلاح مشورے دیتا کیونکہ انھیں پتا چل گیا تھا کہ میں منجم رہ چکا ہوں، اور یہ از راہِ تفنن زیادہ تھا، ان کی نقدی کے حصول کے لیے کم۔ شاید انھیں سے مجھے اپنے ملک کے بارے میں جہاں میں بچپن سے رہتا چلا آیا ہوں زیادہ واقفیت ہوئی: ہاتھ پاؤں سے معذوروں کی قسمت کے بارے میں بتانے سے پہلے، یا وہ لوگ جو بیٹے یا بھائی کی موت کے باعث گم سم ہوتے، وہ جو دائمی مریض ہوتے، ایسی لڑکیوں کے باپ جو شادی سے محروم رہ گئی ہوتیں، وہ جو اپنی پوری قامت کو پہنچنے سے قاصر رہے ہوتے، بدگمان شوہر، نابینا، ملاّح، اور متوحّش نگاہوں والے نراس عاشق، میں ان سے اپنی اپنی رام کہانی تفصیل کے ساتھ بیان کرواتا، اور دورانِ شب انھیں اپنی نوٹ بکس میں رقم کر لیتا تاکہ بعد میں اپنی کہانیوں میں استعمال کر سکوں، بالکل اسی طرح جس طرح اِس کتاب میں کیا ہے۔

اُنھی وقتوں میں میری ملاقات اس پیرِ فرتوت سے بھی ہوئی جو ایک عمیق محزونی کو اپنے ہمراہ لیے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھ سے دس، پندرہ سال بڑا رہا ہوگا۔ جوں ہی میرا سامنا اس آدمی کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی سے ہوا جو ایولیا [اولیاء] [1] کہلاتا تھا، میں نے فیصلہ کر ڈالا کہ اس کا مرض احساسِ تنہائی ہے، لیکن اس نے اس کا ذکر نہیں کیا: لگتا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی سیر و سیاحت کے لیے وقف کر دی تھی اور وہ جلدی کتابِ اسفار کے لیے جو بس اب ختم کرنے والا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرنے سے پہلے اس مقام کی زیارت کرے جو خدا سے قریب ترین ہے، مکّے اور مدینے کا سفر، اور ان کے بارے میں لکھنے کا بھی، بایں ہمہ اس کی کتاب میں کوئی کسر رہ گئی تھی جس نے اسے پراگندہ خاطر کر دیا تھا، وہ اپنے قارئین کو اطالیہ کے فواروں اور پلوں سے بھی واقف کرانا چاہتا تھا جن کی خوبصورتی کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا، اور وہ خواہشمند تھا کہ کیا میں، جس کی سارے استنبول میں پھیلی ہوئی شہرت کی بنا پر وہ مجھ سے ملنے آیا تھا، ان کے بارے میں اسے بتا سکوں گا؟ جب میں نے متنبہ کیا کہ میں نے اطالیہ سرے سے کبھی دیکھا ہی نہیں تو بولا کہ یہ تو ہر متنفس کی طرح اسے بھی خوب معلوم ہے، پھر بھی سنا ہے کہ ایک بار میرے پاس ایک غلام ہوا کرتا تھا جو وہیں سے آیا تھا اور جس نے وہاں کی ہر بات سے مجھے آگاہ کیا تھا؛ اب اگر میں وہی سب ایولیا سے بیان کروں، تو اس کے عوض وہ مجھے تفریحی حکایتیں سنائے گا: کیا دل بہلانے والے قصوں کی اختراع و سماعت زندگی کا خوشگوار ترین

---

[1] اولیاء چلیبی (اندازاً ۱۶۱۱ء تا ۱۶۸۲ء) مشہور و معروف کتاب سیاحت نامہ کا مصنف — مترجم]

حصہ نہیں؟ جب وہ بڑی کم آمیزی کے ساتھ اپنے ڈبے سے ایک نقشہ نکال رہا تھا، اطالیہ کا بدترین نقشہ جو میں نے کبھی دیکھا تھا، میں نے اسے وہ سب بتا دینے کا فیصلہ کر ڈالا جس کا وہ خواہشمند تھا۔

وہ اپنے بچکانے پچپس ہاتھوں سے نقشے پر شہروں کی طرف اشارہ کرتا اور ان کے نام رکن رکن تلفظ کرتا جاتا اور بعد میں میرے دیے ہوئے بیان بڑی احتیاط سے لکھتا جاتا۔ ہر شہر کے بارے میں وہ کسی عجیب وغریب قصے کا خواہشمند بھی تھا۔ تیرہ شہروں میں تیرہ راتیں اسی طرح بسر کرتے ہوئے، ہم نے اس خطۂ زمین کو شمال سے جنوب تک پورے کا پورا طے کر ڈالا جسے میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا، پھر کشتی کے ذریعے سسلی [صقلیہ] سے استنبول کو مراجعت کی۔ ہم نے پوری صبح اسی طرح گزاری۔ میں نے جو کچھ بیان کیا تھا اس پر وہ اتنا خوش ہوا کہ مجھے بھی خوش کرنے کا فیصلہ کر ڈالا، مجھے ان نٹوں کے قصے سنائے جو زمین سے اوپر تنے رسے پر چلتے ہوئے اکا (Acre) کے آسمانوں میں غائب ہو جاتے، قونیہ کی وہ زن جس نے ہاتھی کو جنم دیا، ساحل نیل کے نیلے پردار بیل، گلابی بلّیاں، ویانا کا گھنٹہ گھر، آگے کے نقلی دانت جو اس نے وہاں وضع کیے تھے اور جن کی اب وہ اپنی ہنسی میں نمائش کر رہا تھا، بحرِ ازاک (Sea of Azov) کے ساحل کا غار جس میں بات چیت کرنے کی صلاحیت تھی، امریکہ کی سرخ چیونٹیاں۔ کسی سبب سے ان کہانیوں نے ایک عجیب سی افسردگی کو ابھارا، میرا دل رونے کو چاہا۔ غروبِ آفتاب کی سرخی سیلاب کی طرح میرے کمرے میں اُمڈ آئی۔ جب ایولیا نے پوچھا کہ کیا میرے پاس بھی ایسی ہی اچرت کہانیاں ہیں، تو مجھے اس کو واقعی حیرت زدہ کر دینے کا خیال آیا اور میں نے اسے اور اس کے خادم کو اپنے ہاں رات گزارنے کی دعوت دی: میرے پاس ایک ایسی کہانی ہے جو سچ مچ اسے باغ باغ کر دے گی، دو افراد کے بارے میں جنھوں نے اپنی زندگیاں ادل بدل کر لی تھیں۔

رات کو جب سب اپنے اپنے کمروں کو سدھارے، جب وہ سکوت گھر پر اتر آیا جس کے ہم دونوں منتظر تھے، تو ہم دونوں کمرے میں لوٹ آئے۔ بس یہی پہلا موقع تھا جب میں نے اس کہانی کا تصور کیا جو آپ حضرات اب ختم کرنے والے ہیں! میں نے جو کہانی بیان کی وہ گھڑی ہوئی نظر نہیں آتی تھی بلکہ وہ جسے باقاعدہ گزارا گیا ہو۔ لگتا تھا جیسے کوئی اور شخص سہج سہج سے یہ الفاظ سرگوشی میں مجھ سے کہہ رہا ہو، آہستہ آہستہ جملے یکے بعد دیگرے ترتیب وار وارد ہو رہے ہوں: ''ہم کشتی میں سوار وینس سے نیپلز کی طرف جا رہے تھے کہ ترکی بیڑا نمودار ہوا...''

Scanned with CamScanner

نصف شب کے بہت بعد، جب میری کہانی اپنی انتہا کو پہنچی، ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں ہی اُس کی بابت سوچ رہے ہیں، لیکن ایولیا کے تصور کا وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو میرے تصور میں سمایا ہوا تھا۔ مجھے بالکل شک نہیں کہ وہ درحقیقت اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا! اور میں، تو میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا، اُس کے بارے میں، کہ مجھے اپنی مخترع کہانی کس قدر عزیز تھی؛ اور مجھے ہر اس چیز پر فخر محسوس ہوا جو میں نے بسر کی تھی اور جس کا خواب دیکھا تھا: وہ کمرہ جہاں ہم بیٹھے ہوے تھے، ہم دونوں جو کچھ کبھی بننا چاہتے تھے اور جو فی الحقیقت بنے تھے ان کی افسردہ یادوں سے چھلک رہا تھا؛ ٹھیک اسی وقت مجھے پہلی بار واضح طور پر سمجھ میں آیا کہ میں کبھی اُسے بھول نہیں سکوں گا، کہ یہ زندگی کے بقیہ ایام میں مجھے مغموم کردے گا؛ ٹھیک تبھی مجھے معلوم ہوا کہ میں کبھی تنہا زندہ نہیں رہ سکوں گا: یوں تھا جیسے رات کے سناٹے میں، میری کہانی کے ہمراہ، کسی چت چوروا ہے کا سایہ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑ گیا ہو، ہمارے تجسس کو بھڑکاتا ہوا، دریں اثنا ہمیں چوکنا کرتا ہوا بھی۔ فجر کے قریب، میرے مہمان نے یہ کہہ کر میرا دل خوش کردیا کہ اسے میری کہانی پسند آئی ہے، لیکن یہ کہ بعض بعض باتوں سے اختلاف کرنے پر بھی مجبور ہے۔ شاید اپنے توام کی ہاتھ پاؤں پھلا دینے والی یاد سے فرار حاصل کرنے کے لیے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اپنی نئی زندگی میں دوبارہ لوٹ آنے کے لیے، میں نے اپنی جملہ توجہ اسے دے دی۔

اس نے اتفاق کیا کہ ہمیں نامانوس اور حیران کن کی جستجو کرنی چاہیے، جیسا کہ میری کہانی میں ہوا تھا؛ ہاں، یہ واحد شے تھی جو ہم اس دنیا کی تھکا دینے والی بے کیفی کے توڑ کے طور پر استعمال کر سکتے تھے: کیونکہ یہ بات اسے بچپن اور اسکول کے اُن یک رنگ دنوں ہی سے معلوم تھی، اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی چار دیواری میں بند ہو بیٹھنے کی بابت نہیں سوچا تھا؛ اسی لیے اس نے اپنی ساری زندگی سفر کرنے میں بتادی تھی، ان راہوں میں کہانیوں کی تلاش میں جو کبھی اپنی انتہا کو نہیں پہنچتیں۔ لیکن ہمیں نامانوس اور حیران کن کو دنیا میں تلاش کرنا چاہیے، اپنے اندرون میں نہیں! تلاشِ دروں، اپنے بارے میں طویل و عمیق غور و فکر ہمیں صرف رنجیدہ ہی کر سکتا ہے۔ اور یہی میری کہانی کے کرداروں کے ساتھ ہوا تھا: یہی وجہ تھی کہ سورما کبھی بھی اپنا آپ برداشت نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ تھی جو وہ ہمیشہ ہی کوئی دوسرا ہونا چاہتے تھے۔ چلیے باور کریں کہ جو میری کہانی میں پیش آیا وہ سچ تھا۔ کیا مجھے یقین تھا کہ وہ دو آدمی جنھوں نے

Scanned with CamScanner

ایک دوسرے کی جگہ لے لی تھی اپنی نئی زندگیوں میں خرسند ہوسکیں گے؟ میں گم سم رہا۔ بعد میں، کسی نہ کسی وجہ سے، اس نے مجھے میری کہانی کی ایک تفصیل یاد دلائی: ہمیں خود کو کسی ایک ہاتھ والے ہسپانوی غلام کی امیدوں سے گمراہ ہو جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے! کیونکہ اگر ہم نے یہ اجازت دے دی تو، رفتہ رفتہ، اس قسم کی کہانیاں رقم کر کے، خود اپنے دروں میں نامانوس اور حیران کن کی جستجو کے باعث، ہم بھی، کوئی دوسرا بن جائیں گے اور، معاذ اللہ، ہمارے قارئین بھی۔ وہ تو یہ سوچنے کا سزاوار بھی نہیں تھا کہ اگر ہر شخص صرف اپنے بارے میں ہی ہمیشہ کلام کرے، محض اپنے خصائص کے بارے میں ہی، کہ اس کی تصانیف اور کہانیاں ہمیشہ صرف اسی کے بارے میں ہوں، تو دنیا کتنی بھیانک ہو جائے گی۔

لیکن میں یہ کرنا چاہتا تھا! چنانچہ جب اس چھوٹے سے پیر مرد نے، جس سے مجھے ایک ہی دن میں اس قدر والہانہ قربت پیدا ہو گئی تھی، اثنائے فجر اپنے خدام کو سفر مکہ کے لیے اکٹھا کیا، اور راہ پکڑی، تو میں فوراً جم کر بیٹھ گیا اور اپنی کہانی لکھ ڈالی۔ آنے والی بھیانک دنیا میں اپنے قارئین کی خاطر میں نے کہانی میں خود کو اور اُسے، جسے میں اپنے سے علیحدہ نہ کر سکا، حتی المقدور زندہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن حال ہی میں، اس چیز کو بار دگر دیکھتے ہوئے جسے میں نے سولہ سال پہلے ایک طرف ڈال دیا تھا، مجھے خیال آیا کہ میں اپنی کوشش میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوا ہوں۔ تو میں اپنے اُن قارئین سے معذرت خواہ ہوں جنھیں — دمی اپنی ہی ذات کے بارے میں گفتگو کرتا ہوا پسند نہیں آتا — خاص طور پر جب وہ ایسے پراگندہ کر دینے والے جذبات میں آ پھنسا ہو — اور ان صفحات کا اپنی کتاب میں اضافہ کرتا ہوں:

مجھے اُس سے محبت تھی، اتنی ہی محبت جتنی مجھے اپنی ذات کے بے یار و مددگار، بد بخت سائے (ghost) سے تھی جو مجھے اپنے خوابوں میں نظر آتا تھا، گویا اس سائے کے ننگ، طیش، عصیاں اور غمگینی پر میرا دم گھٹا جا رہا ہو، گویا اس ندامت سے مغلوب ہو گیا ہوں جو کسی وحشی جانور کو تکلیف سے مرتے دیکھنے کے منظر سے محسوس ہو، یا لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اپنے سپوت کی خود غرضی کے باعث طیش میں آ گیا ہوں۔ اور شاید اس سے بھی زیادہ یہ کہ مجھے اپنی ذات کو جاننے کے احمقانہ اکراہ اور احمقانہ مسرت کے ساتھ اُس سے محبت تھی؛ اُس سے میری محبت میرے اس طور سے مشابہ تھی جس میں میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی بے ثمر حشرات الارض جیسی حرکات کا عادی ہو گیا تھا، جس طور پر میں ان خیالات کو سمجھتا تھا جو ہر روز میرے ذہن کے در و دیوار کے مقابل گونجتے اور فنا ہو جاتے، جس طور میں اپنے

بد بخت جسم کے پسینے کی منفرد بو پہچانتا تھا، اپنے جھڑتے ہوئے بال، کریہہ المنظر منھ، قلم سنبھالے ہوئے گلابی ہاتھ۔ جب میں اپنی کتاب لکھ چکا اور اسے، اس امید میں کہ اب اُسے بھول جاؤں گا، ایک طرف ڈال دیا، کبھی بھی گردش کرتی ہوئی کسی افواہ سے دھوکے میں نہیں آیا، ان لوگوں کے کھیل تماشے جنھوں نے ہماری شہرت کا سن رکھا تھا اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے — بالکل نہیں! قاہرہ کے کسی پاشا نے اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور اب وہ ایک نئے ہتھیار کے خاکے بنا رہا تھا! ناکام رہ جانے والے محاصرے کے دوران وہ ویانا شہر میں اندرونِ فصیل تھا، جہاں وہ دشمنوں کو بتا رہا تھا کہ ہمیں کس طرح شکستِ فاش دی جا سکتی ہے! فقیر کے بھیس میں ایدرنہ میں دکھائی دیا تھا، اور سوداگروں کے ایک آپسی جھگڑے کے دوران جسے خود اُسی نے کروایا تھا، ایک رضائی بنانے والے کو چاقو مار کر رفوچکر ہو گیا تھا! اناطولیہ کے ایک دور افتادہ گاؤں کی مقامی مسجد کا امام تھا، اُس نے ایک کلاک روم کا انتظام کیا تھا — جو لوگ یہ قصہ بیان کرتے تھے اس کے سچ ہونے کی قسم کھاتے تھے؛ اور اب تو اُس نے ایک گھنٹہ گھر کی تعمیر کے لیے پیسہ اکٹھا کرنا بھی شروع کر دیا تھا! ہسپانیہ میں، جہاں وہ طاعون کے تعاقب میں پہنچا تھا، کتابیں لکھ لکھ کر متموّل ہو گیا تھا! ان کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ اُسی نے سازش کر کے ہمارے بے چارے حاکم کو تخت سے اتروایا تھا! وہ سلاو دیہاتوں میں فروکش تھا، جہاں ایک افسانوی حیثیت کے حامل مرگی زدہ کاہن کی طرح اُس کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی تھی، جہاں سچے اعترافات جو وہ انتہائے کار کروا سکا تھا، ان پر مبنی حزن و یاس سے مملو کتابیں لکھ رہا تھا! وہ اناطولیہ کے گرد و نواح میں کہتا پھر رہا تھا کہ ان بے وقوف سلطانوں کا تختہ اُلٹ دے گا، اپنی قیادت میں ایک ٹولی کو لیے لیے جسے اُس نے اپنی پیش گوئیوں اور شاعری سے مسحور کر دیا تھا، اور مجھے شمولیت کے لیے بلا رہا تھا! ان سولہ برسوں میں جب میں کہانیاں لکھ رہا تھا، تاکہ اُسے بھلا سکوں، تاکہ ان دہشت ناک لوگوں اور ان کی دہشت ناک آئندہ دنیاؤں سے اپنی توجہ ہٹا سکوں، اپنی فنطاسیوں کی جملہ لذتوں سے متمتع ہو سکوں، میں نے ان افواہوں کو مختلف شکلوں میں سنا، لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی یقین نہیں کیا۔ مجھے معلوم نہیں، میں حیرت سے سوچتا ہوں کہ یہ دوسروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے: بسا اوقات، جب ہم گولڈن ہورن کی دور دراز حدوں کی اس چار دیواری میں خود کو محبوس محسوس کرتے، بسا اوقات، کسی حویلی یا محل سے دعوت نامے کے منتظر جو کبھی آ کر نہ دیتا، اس نفرت سے جو ہمیں ایک دوسرے سے تھی اس سے کسبِ لذت کرتے ہوئے، یا

Scanned with CamScanner

دانت نکال کر ایک دوسرے پر ہنستے ہوئے درانحال کہ اپنے حاکم کے واسطے ایک اور رسالہ تصنیف کر رہے ہوتے، روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں، ایک ہی لمحے، ہم دونوں کی توجہ ایک ہی تفصیل پر آ جمتی: ایک بھیگا ہوا کتا جسے ہم نے اس صبح بارش میں دیکھا تھا، دو پیڑوں کے درمیان تنی ہوئی کپڑے سکھانے کی رسّی کے رنگوں اور شکلوں میں پوشیدہ ہیئتیں (جیومیٹری)، زبان کی چوک جو ناگہانی زندگی کی موزونیت کا ابراز کرتی! یہ وہ لمحات ہیں جن کی کمی میں شدت سے محسوس کرتا ہوں! اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے سائے کی کتاب کی طرف لوٹتا ہوں، یہ تصور کرتے ہوئے کہ کوئی متجسس شخص برسوں بعد، شاید اُس کی موت کے صدیوں بعد، اسے پڑھے گا، اور خود اپنی زندگی کا تصور کرے گا نہ کہ ہماری؛ یہ کتاب جسے اگر کوئی کبھی بھی نہ پڑھے تو مجھے واقعی اس کی پروانہ ہوگی، اور اس کے اندر جہاں میں نے اُس کا نام چھپایا ہے، دفن کیا ہے، اگرچہ بہت گہرا نہیں: تاکہ میں مزید ایک بار طاعون کی راتوں کا خواب دیکھ سکوں، ایدرنہ میں اپنے بچپن کا، سلطان کے باغات میں جو طرب انگیز گھڑیاں گزاری تھیں ان کا، پہلی مرتبہ جب میں نے اُسے داڑھی منڈا پاشا کے دروازے پر دیکھا تھا اس کا، اپنی پشت پر نیچے کی طرف رینگتی ہوئی ٹھنڈک کا۔ زندگی اور وہ خواب جو ہم نے کھو دیے تھے انھیں بار دگر دسترس میں لایا جائے، ہر فرد و بشران چیزوں کے خواب دوبارہ دیکھنے کی ضرورت کو سمجھتا ہے: مجھے اپنی کہانی پر یقین تھا!

میں اپنی کتاب اس دن کے ذکر پر ختم کروں گا جس میں میں نے اسے مکمل کرنے کا فیصلہ کیا: دو ہفتے پہلے، جب میں دوبارہ اپنی میز کے سامنے بیٹھا، اس کوشش میں کہ ایک مختلف کہانی گھڑوں، میں نے استنبول کی سڑک سے ایک سوار کو آتے دیکھا۔ حال میں کسی نے بھی مجھے اُس کی خیر خبر نہیں پہنچائی تھی، شاید اس لیے کہ میں اپنے ملاقاتیوں سے اتنی رُکھائی سے پیش آتا تھا کہ مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اب اور مجھ سے ملنے آئے گا، لیکن جیسے ہی میری نظر اس مسافر پر پڑی جو ایک بے آستین کا لبادہ پہنے اور ہاتھ میں دھوپ کی چھتری سنبھالے ہوئے تھا، مجھے پتا چل گیا کہ وہ مجھی سے ملنے آ رہا ہے۔

میرے کمرے میں اس کے داخل ہونے سے قبل ہی مجھے اس کی آواز سنائی دی، وہ ترکی بول رہا تھا اور اس میں اُسی کی سی غلطیاں کر رہا تھا، لیکن اتنی زیادہ نہیں جن کا وہ مرتکب ہوتا تھا، لیکن میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اطالوی بولنا شروع کر دی۔ جب اس نے میرے چہرے کو بگڑتے دیکھا اور یہ کہ میں جواب نہیں دے رہا ہوں، تو اس نے اپنی اَن گھڑ ترکی میں کہا کہ اس کا خیال تھا کہ میں کم

ازکم تھوڑی سی اطالوی ضرور جانتا ہوں گا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اسے میرا نام اور کہ کیا ہوں اُسی سے معلوم ہوا تھا۔ اپنے ملک لوٹنے کے بعد اُس نے پشتارہ بھر کتابیں لکھ ڈالی تھیں جن میں ترکوں کے ہاں اپنی ناقابل یقین مہم جوئیوں کا ذکر کیا تھا، ان کے آخری حاکم کے بارے میں لکھا تھا جسے جانوروں اور اپنے خوابوں سے کس قدر والہانہ عشق تھا، طاعون اور ترک لوگوں کے بارے میں، ہمارے درباری اور جنگی آداب کے بارے میں۔ طرفہ تماشا مشرق (exotic Orient) کے بارے میں تجسس جو رؤسا اور خاص طور پر شائستہ خواتین میں پھیلنا بس شروع ہی ہوا تھا، اُس کی نگارشات ہاتھوں ہاتھ لی گئیں، خوب خوب پڑھی گئیں، اُس نے یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے، اور مالدار بن گیا۔ مزید یہ کہ اُس کی سابقہ منگیتر نے، اُس کی نگارشات کی رومانیت میں بہہ کر، اُس سے چٹ پٹ بیاہ کرلیا، نہ اپنی عمر کا کچھ خیال کیا، نہ اپنے شوہر کی حالیہ موت کا۔ انھوں نے پرانا آبائی مکان، جس کے بخرے کر کے بیچ دیے گئے تھے، واپس خریدا اور اس میں آ بسے، اور گھر اور اس کے باغ کو اپنی سابقہ حالت میں لے آئے۔ میرے مہمان کو ان باتوں کا پتا تھا، اس لیے کہ اُس کی کتابوں سے اپنی گرویدگی کے باعث وہ وہاں جا کر اُس سے مل آیا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے پیش آیا، ملاقاتی کے لیے اپنا پورا دن وقف کر دیا اور اس کے سوالوں کا جواب دیا، ازسرِنو ان مہم جوئیوں کی بازخوانی کی جو اُس نے اپنی کتابوں میں قلمبند کی تھیں۔ اسی موقعے پر اُس نے تفصیل کے ساتھ میرا ذکر کیا تھا: ''میرا ایک ترک شناسا'' کے عنوان سے وہ میرے بارے میں ایک کتاب لکھ رہا تھا؛ وہ اپنے اطالوی قارئین کے سامنے میری پوری زندگی پیش کرنے ہی والا تھا، اَیدرنہ میں میرے بچپن سے لے کر اس دن تک کی زندگی جب اُس نے کوچ کیا تھا، اور جس میں ترکوں کی انوکھی عادات اور خصلتوں کے بارے میں ہوشیاری سے لکھی ہوئی اپنی ذاتی تشریحات و توضیحات سے کام لیا تھا۔ ''آپ نے اُسے اپنے بارے میں اتنا بہت بتایا تھا!'' میرے مہمان نے کہا۔ بعد میں، میرے تجسس کو مزید شہ دینے کی خاطر، اس نے کتاب کا جتنا کچھ بھی پڑھا تھا اس سے جزئیات نکال نکال کر بیان کرنا شروع کیں: محلے کے بچپن کے دوستوں میں سے ایک کو بے رحمی سے زدوکوب کرنے کے بعد میں کتنا پشیمان ہوا تھا اور تاسف سے رو پڑا تھا، میں ذہین تھا، چھ ماہ ہی میں نے اُس کی پڑھائی ہوئی ساری فلکیات سمجھ لی تھی، مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت تھی، میں اپنے مذہب کا گرویدہ تھا، عبادت باقاعدگی سے کرتا تھا، چیری کے مربوں کا شائق تھا، مجھے رضائی سازی

سے، جو میرے سوتیلے باپ کا پیشہ تھی، خصوصیت سے دلچسپی تھی، تمام ترکوں کی طرح خلق و بشر سے پیار کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ جب اس نے میری ذات میں اس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کیا تو میں جان گیا کہ میں اس الو کے ساتھ بے تواضعی کا سلوک نہیں کر سکتا اور یہ کہ اس جیسے سیاح کے لیے دلچسپی لینا ناگزیر ہے، چنانچہ میں نے اسے کمرہ کمرہ اپنا گھر دکھایا۔ بعد میں وہ ان کھیلوں سے مسحور ہو گیا جو باغ میں میرے بیٹے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہے تھے: اس نے ''گلی ڈنڈے'' اور ''آنکھ مچولی'' کے قواعد ان سے پوچھ پوچھ کر ایک نوٹ بک میں درج کیے، اور ''مینڈک پھاند'' (leapfrog) کے بھی، گو یہ کھیل اسے کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آیا۔ ٹھیک اسی وقت اس نے بتایا کہ وہ ترکوں کا پرستار ہے۔ جب میں اسے ہمارا باغ دکھا رہا تھا، کہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کچھ اور تھا ہی نہیں، اور بعد ازاں گیبزے کا خستہ و بدحال شہر اور وہ گھر جہاں سالوں پہلے میں اُس کے ساتھ اقامت گزیں تھا، تو اس نے پھر یہی کہا۔ جب ہم پینٹری کا معائنہ کر رہے تھے، مربوں اور اچاروں کے مرتبانوں، زیتون کے تیل اور سرکے کے ظروف کے درمیان، جن سے اسے ایک گونہ دلچسپی تھی، اس کی نظر میری روغنی تصویر پر جا پڑی جو میں نے وینس کے ایک مصور سے آرڈر دے کر بنوائی تھی، اس نے مجھے مزید اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا، جیسے کسی راز کا افشا کر رہا ہو، کہ سچ پوچھیں تو وہ ترکوں کا حقیقی دوست نہیں تھا، کہ اُس نے ان کے بارے میں ناگوار باتیں لکھی تھیں: اُس نے تحریر کیا تھا کہ اب ہم حالتِ زوال میں ہیں، ہمارے دماغوں کا یوں ذکر کیا تھا جیسے یہ بوسیدہ کاٹھ کباڑ سے بھری غلیظ الماریاں ہوں۔ اُس نے کہا تھا کہ ہم ناقابلِ اصلاح ہیں، کہ اگر باقی بچ رہنا چاہتے ہیں تو واحد چارہ یہی ہے کہ فی الفور سپر انداز ہو جائیں، اور اس کے بعد ہم صدیوں تک کچھ کرنے کے اہل نہیں رہیں گے الّا یہ کہ جن کے سامنے سپر انداز ہوئے ہیں بس ان کی نقالی کیے جائیں۔ ''لیکن وہ ہمیں بچانا چاہتا تھا؛'' میں نے کہا، اس امید کے ساتھ کہ وہ بس کرے، اور اس نے فوری جواب دیا کہ ہاں، ہماری خاطر اُس نے ایک ہتھیار تک بنا ڈالا تھا، لیکن ہم اُسے سمجھے کہاں تھے؛ وہ مشین جو اُس نے وضع کی تھی، ایک کہر آلود صبح طوفان میں اٹکی کسی بحری قزاقوں کی ہیبت ناک کشتی کے لاشے کی طرح ایک نفرت انگیز دلدل میں پھنسی چھوڑ دی گئی تھی۔ پھر اس نے اضافہ کیا: ہاں، اس میں کلام نہیں کہ وہ ہمیں واقعی بچانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ شر سے بالکل ہی عاری تھا۔ ہر قوتِ مخترعہ (genius) اسی طرح ہوتی ہے! میری تصویر کو، جو دریں اثنا اس نے اٹھا لی تھی،

بنظرِ غائر دیکھتے ہوئے وہ قوتِ مخترعہ کے بارے میں مزید چند باتیں بڑبڑایا: اگر وہ ہماری غلامی میں نہ آ پھنسا ہوتا بلکہ خود اپنے ہی ملک میں اُس نے زندگی گزاری ہوتی، تو ہو سکتا ہے کہ وہ سترھویں صدی کا لیونار دو ثابت ہوتا۔ بعدازاں اس نے اپنے محبوب موضوع ''شر'' کی طرف مراجعت کی، ایک دو گپیں اُس کے اور روپے پیسے کے حوالے سے دہرائیں جو میں نے پہلے سے سن رکھی تھیں لیکن تبھی سے بھلا بھی بیٹھا تھا۔ ''تعجب کی بات تو یہ ہے،'' اس نے بعد میں کہا، ''کہ تم پر اُس کا ذرا اثر نہیں ہوا ہے!'' اس نے کہا کہ وہ مجھے جان گیا ہے اور مجھ سے محبت بھی کرتا ہے؛ اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا: دو آدمی جو اتنے سال ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہوں آخر ایک دوسرے سے اتنے کم مشابہ کیسے ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں، وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس نے میری تصویر نہیں مانگی، جیسا کہ مجھے خدشہ تھا کہ مانگ بیٹھے گا؛ اسے اپنی جگہ پر لوٹاتے ہوئے اس نے پوچھا کہ کیا رضائی گدے دیکھ سکتا ہے۔ ''کون سے رضائی گدے؟'' میں نے حواس باختہ کہا۔ اسے حیرت ہوئی: میں اپنا فالتو وقت رضائیاں ٹانکنے میں نہیں خرچ کرتا تھا؟ تبھی میں نے اسے وہ کتاب دکھانے کا فیصلہ کر ڈالا جسے میں نے سولہ سال سے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

اس پر وہ مضطرب ہو گیا، بولا کہ وہ ترکی پڑھ سکتا ہے، اُس کے بارے میں میری نوشتہ کتاب سے اسے واقعی دلچسپی ہے۔ ہم اوپر میرے کام کرنے کے کمرے میں آئے جہاں سے باغ نظر آتا تھا۔ وہ ہماری میز کے سامنے آ بیٹھا، اور میں نے اپنی کتاب وہیں پائی جہاں اسے، جیسے یہ کل ہی کی بات ہو، میں نے سولہ سال قبل اسے ڈال دیا تھا؛ میں نے اسے کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ترکی پڑھ لی، گرچہ آہستہ آہستہ۔ اس نے خود کو کتاب میں دفن کر دیا، اپنی باہوش اور محفوظ دنیا کو چھوڑے بغیر اس میں غرق ہو جانے کی اسی خواہش کے ساتھ جو مجھے تمام سیاحوں میں نظر آئی تھی، اور جسے میں حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میں باہر باغ میں آیا اور بھوسے کی اَپ ہولسٹری والے دیوان پر آ بیٹھا جہاں سے میں کھلے دریچے سے اسے دیکھ سکتا تھا۔ شروع شروع میں وہ بشاش نظر آیا، مجھے پکار کر بولا، ''صاف ظاہر ہے کہ تم نے اطالیہ میں کبھی قدم نہیں دھرا!'' لیکن جلد ہی وہ مجھ سے غافل ہو گیا: میں تین گھنٹے باغ میں بیٹھا رہا، جب تب آنکھ کے گوشے سے اوپر دیکھ لیتا، اس انتظار میں کہ وہ کتاب ختم کر لے۔ اس وقت تک وہ سب سمجھ چکا تھا، اگرچہ اس کے چہرے سے الجھن مترشح تھی: ایک دو بار اس نے

آواز سے سفید قلعے کا نام لیا جو اس دلدل کے عقب میں تھا جو ہمارے ہتھیار کو ہڑپ کر گئی تھی؛ اس نے بے سود مجھ سے اطالوی بولنے کی کوشش کی۔ پھر وہ مڑا اور خالی خالی نظروں سے کھڑکی کے باہر گھورنے لگا، جیسے سستا رہا ہو اور جو پڑھا تھا اسے ہضم کرنے کی کوشش میں ہو۔ میں نے لطف اندوزی سے اسے خلا میں کسی لامتناہی نقطے (point) کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا، جیسا کہ لوگ ایسی صورت حال میں کیا کرتے ہیں، کسی ناموجود نقطۂ ماسکہ (فوکل پوائنٹ) کی طرف، لیکن پھر، پھر، جیسا کہ مجھے توقع تھی، اس کی بصارت ماسکے میں آ گئی: اب وہ کھڑکی کے چوکھٹے سے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے زیرک قارئین یقیناً سمجھ گئے ہوں گے: وہ اتنا گاؤدی نہیں تھا جتنا میں نے فرض کر لیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق، وہ میری کتاب کے ورق بڑے حریصانہ اشتیاق سے جلدی جلدی پلٹانے لگا، متلاشی، اور میں بے قراری سے انتظار کرتا رہا تا آنکہ انجام کار اسے وہ صفحہ مل گیا جسے ڈھونڈ رہا تھا اور پڑھ ڈالا۔ پھر اس نے بار دگر کھڑکی سے میرے گھر کے عقبی باغ کو دیکھا۔ مجھے بالکل ٹھیک معلوم تھا کہ اسے کیا نظر آ رہا ہے۔ میز پر رکھی سیپوں سے مرصع کشتی میں پڑے آڑو اور چیریاں، میز کے عقب میں ایک دیوان جس کی اَپ ہولسٹری بھوسے کی تھی، جس پر اسی رنگ کے بال و پر سے بھرے تکیے پڑے ہوئے تھے جو کھڑکی کے سبز چوکھٹے کا تھا۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، اب تقریباً ستر سال کا۔ اور پیچھے، زیتون اور چیری کے درختوں کے درمیان کنوئیں کی جگت پر اسے ایک گوریا براجمان نظر آ رہی تھی۔ اخروٹ کی ایک اونچی شاخ سے لمبی سی رسّی سے لٹکا جھولا بمشکل محسوس ہونے والی ہوا میں خفیف سی حرکت کر رہا تھا۔

۱۹۸۴ء - ۱۹۸۵ء

❋❋

ہندوستانی انگریزی کتابیں

The Flower-Lit Road
Shams-ur-Rahman Faruqi
Price: Rs.960

The American Scheme
Vijay Prashad
Price: Rs.150

Orienting India
Vasudha Dalmia
Price: Rs.300

Views on Development
Kristoffel Licten
Price: Rs.225

Breaking the Spell of Dharma
Meera Nanda
Price: Rs.300

The Wrongs of the Religious Right
Meera Nanda
Price: Rs.225

Light of the Universe
Ashraf Aziz
Price: Rs.240

Remapping Knowlegde
Jackie Assayag/Veronique Benei
Price: Rs.270

Survival and Emancipation
Brinda Karat
Price: Rs.413

India's Market Society
Harriss-White
Price: Rs.375

Slouching Towards Ayodhya
Radhika Desai
Price: Rs.225

Against Ecological Romanticism
Archana Prasad
Price: Rs.375

Identity, Hegemony, Resistance
Biswamoy Pati
Price: Rs.135

Khaki and the Ethnic Violence in India
Omar Khalidi
Price: Rs.225

The Path of the Parivar
Mukul Dube
Price: Rs.210

The Other Indians
Shereen Ratnagar
Price: Rs.225

Scanned with CamScanner

اردو رسائل و جرائد

کتابی سلسلہ مکالمہ کراچی
مدیر: مبین مرزا

کتابی سلسلہ دنیازاد کراچی
مدیر: آصف فرخی

ماہنامہ آئندہ کراچی
مدیر: محمود واجد

ماہنامہ جریدہ کراچی
مدیر: خالد جامعی/عمر حمید ہاشمی

سہ ماہی بادبان کراچی
مدیر: ناصر بغدادی

ارتقا کراچی
مرتبین: حسن عابد، راحت سعید

سہ ماہی ادراک گوجرانوالہ
مدیران: خالد فتح محمد، اسد ملک

مخزن لاہور
مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

سہ ماہی نیا ورق ممبئی
مدیر: ساجد رشید

ماہنامہ شاعر ممبئی
مدیر: افتخار امام صدیقی

سہ ماہی اردو ادب دہلی
مدیر: اسلم پرویز

سہ ماہی استعارہ دہلی
مدیر: صلاح الدین پرویز

شعر و حکمت حیدر آباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم

نیاز مانہ لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل

Scanned with CamScanner

پاکستانی اردو کتابیں

العاصفہ (ناول)
حسن منظر
قیمت:180 روپے

عام سے لوگ (ناول)
نجیب محفوظ/ ترجمہ: سیّد علاء الدین
قیمت:300 روپے

جو کہانیاں لکھیں (مجموعہ نثر)
اسد محمد خاں
قیمت:600 روپے

موسیٰ سے مارکس تک
سبطِ حسن
قیمت:350 روپے

غالب کا سفرِ کلکتہ
خلیق انجم
قیمت:350 روپے

گھر ہونے تک (آپ بیتی)
میلکم ایکس، ترجمہ: عمران الحق چوہان
قیمت:360 روپے

علی سردار جعفری کے خطوط
مرتب: خلیق انجم
قیمت:220 روپے

انگارے سے پگھلا نیلم تک
سیّد مظہر جمیل
قیمت:250 روپے

جنوں میں جتنی بھی گزری (آپ بیتی)
حسن عابدی، مرتبہ: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد
قیمت:250 روپے

یاد کی رہگزر (آپ بیتی)
شوکت کیفی
قیمت:350 روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

فضلی سنز
میپل روڈ، اردو بازار
کراچی

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی

سندھی لینگویج اتھارٹی
لطیف آباد
حیدرآباد

سندھی ادبی بورڈ بک اسٹال
تلک چاڑی
حیدرآباد

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ

ڈاکٹر ریاض مجید
D-288، پیپلز کالونی
فیصل آباد

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہِ قائداعظم
لاہور

بک ہوم
بک اسٹریٹ، 46 مزنگ روڈ
لاہور

لندن بک کمپنی
کوہسار مارکیٹ،
F-6-3، اسلام آباد

مسٹر بکس
10 - ڈی
سپر مارکیٹ
اسلام آباد

قلات پبلشرز
رستم جی لین، جناح روڈ
کوئٹہ

مکران بک ہاؤس
ایئرپورٹ روڈ
نزد داشتی مارکیٹ
گوادر

Scanned with CamScanner

جوئندہ یابندہ

حیات، کمیونزم اور سب کچھ

رالف رسل

انگریزی سے ترجمہ: ارجمند آرا

Rs.295

مرثیہ خوانی کا فن

نیر مسعود

Rs.150

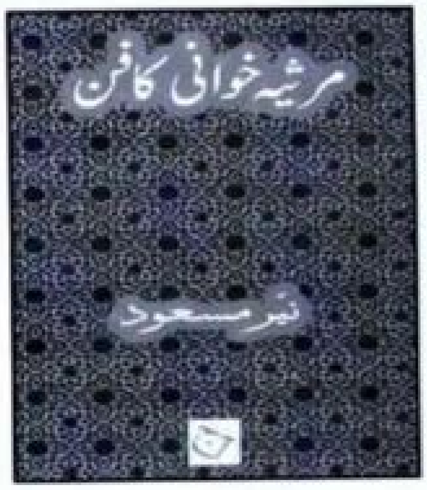

انیس

(سوانح)

نیر مسعود

Rs.375

پیلی بارش

(ہسپانوی ناول)

خولیو لیاماز اریس

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.95

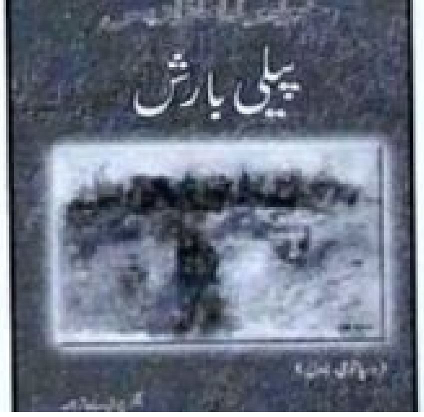

Scanned with CamScanner

۵۵

قیمت
۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner